محمد عاصم الحداد

سفرنامہ ارض القرآن

رودادِ سفر

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

محمد عاصم الحداد

www.KitaboSunnat.com

مئی 2003ء

محمد فیصل نے
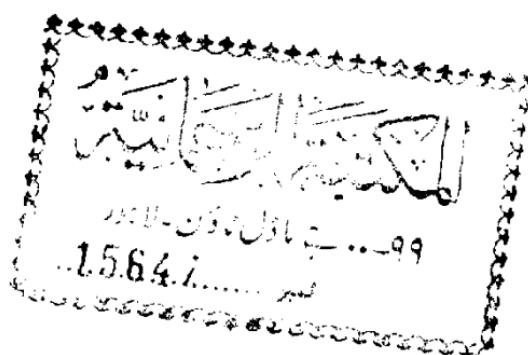
تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:=/180 روپے

فہرست

بحیرہ روم
شام
عراق
ایران
افغانستان
لیبیا
مصر
بحیرۂ قلزم
سعودی عرب
مسقط و عمان
بحر ہند
سوڈان

ارادہ اور مقصدِ سفر

1956ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پہلی مرتبہ عرب ممالک کا سفر کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ حج و زیارت کے علاوہ مولانا کا ارادہ تھا کہ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے تمام آثار کو بھی دیکھا جائے، لیکن ایک تو گرمی کا سخت موسم، اور دوسرے وقت کی کمی اور تیسرے صحت کی خرابی۔ اس لیے ان کی یہ دِلی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ یوں بھی حج کی مصروفیات اور حجاج کی گہما گہمی میں اس قسم کی کسی خواہش کا پورا کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ خصوصاً جب انسان پہلی مرتبہ حج کے لیے جاتا ہے تو اسے پوری کوشش کے باوجود یہ سجھائی نہیں دیتا کہ حج کی ضروری مصروفیات سے وقت نکال کر اپنے کسی علمی قسم کے پروگرام کو کیوں کر شروع کرے اور کیونکر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ بہت سی خواہشات اپنے دل میں لے کر وہ سرزمین حجاز میں قدم رکھتا ہے، اور وہاں پہنچ کر انہیں پورا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے، لیکن جب وہاں سے پلٹتا ہے تو اس کے دل میں یہ احساس برابر چٹکیاں لیتا رہتا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنے کسی پروگرام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت سفرِ حج کے بعد مولانا پر بھی طاری ہوئی۔ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے قیام کے دوران میں وہ وہاں کے تاریخی آثار دیکھنے کے لیے نکلتے بھی رہے لیکن اتنا وقت اور سکون ان کے پاس کہاں کہ وہ ان آثار کا تفصیلی مطالعہ کر سکیں۔ چنانچہ سفر سے واپسی پر ہی مولانا نے یہ طے کیا کہ آئندہ کبھی سردی کے موسم میں عمرہ بھی کیا جائے اور سر زمین عرب کے تمام تاریخی آثار و مقامات کا بھی تفصیل سے مطالعہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ حج اور عمرے کے الگ الگ فائدے ہیں۔ حج تو فرض ہی ہے اس لیے اس میں جو فائدے ہیں وہ عمرہ سے حاصل نہیں ہو سکتے، لیکن عمرہ کو ایک الگ عبادت قرار دے کر اللہ

تعالیٰ نے اس میں جو فائدے رکھے ہیں وہ بھی ایسے ہیں کہ ایامِ حج میں حج کے ساتھ محض ضمنی طور پر انہیں حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن صحت کی مسلسل خرابی اور مشاغل کی زیادتی نے مولانا کو تین سال تک اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی مندرجہ بالا خواہش پوری کرنے کے لیے عرب ممالک کا سفر کر سکیں ملک میں مارشل لاء نافذ ہو جانے کے بعد مولانا کو اپنے مسلسل کاموں سے جو یک گونہ فرصت ملی، تو ان کے ذہن نے بھی قدرے راحت محسوس کی اور اپنے علمی پروگراموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی فکر ان کے دماغ پر مسلط رہنے لگی۔ چند ماہ کے علاج سے صحت کے بارے میں بھی مولانا کو اتنا اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ سفر کی صعوبتوں کو جھیل سکیں گے۔

اب مولانا نے اپنے ذہن میں سرزمین عرب کے سفر کا وسیع نقشہ بنایا اور طے کیا کہ نہ صرف حرمین کی زیارت کی جائے بلکہ نجد، حجاز، شرقِ، اُردن، فلسطین، شام اور مصر کے بھی ان تمام آثار و تاریخی مقامات کو دیکھا جائے جن کا ذکر قرآن مجید اور سیرتِ پاک کی کتابوں میں آیا۔ عراق میں بھی اگرچہ قرآن، سیرت اور اسلامی تاریخ سے متعلق آثار کی کمی نہیں، لیکن ان دنوں ایک پاکستانی ۔۔۔۔۔ اور وہ بھی مولانا مودودی ۔۔۔۔۔ کے لیے عراق کا سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ مولانا کے بقول جسے گولی کھانی ہوتی وہ اس زمانے میں ادھر کا رخ کرتا اور اگر گولی کھانا ہی ٹھہری تو اس کے لیے عراق جانا ہی کونسا ضروری تھا؟

1959ء کے وسط میں مولانا نے سعودی عرب، اُردن اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفراء مقیم کراچی کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا اور ان سے یہ خواہش کی کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں کو خطوط لکھ کر معلوم کریں کہ وہ اس قسم کے علمی سفر کے سلسلے میں انہیں کہاں تک سہولتیں بہم پہنچا سکتی ہیں، کیونکہ ان ملکوں میں مطلوبہ تاریخی آثار کو دیکھنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کو حکومتوں کا تعاون یا کم از کم ان کی طرف سے ہر جگہ جانے کی اجازت حاصل نہ ہو۔ پھر موجودہ سیاسی حالات میں بھی یہی مناسب تھا کہ سفر سے پہلے متعلقہ ممالک کی حکومتوں سے دریافت کر لیا جائے۔

سعودی سفیر استاذ محمد الحمد الشبیلی نے تو نہ صرف ویزا دینے کا وعدہ کیا بلکہ یقین دلایا کہ سعودی حکومت مولانا کو اپنے ملک میں داخل ہونے کے بعد سفر کے سلسلے میں ہر طرح

کی سہولت بہم پہنچائے گی۔ کچھ اسی قسم کا جواب اردن کے قونصل استاذ ہاشم التل نے بھی دیا، لیکن جمہوریہ عربیہ کی طرف سے کوئی جواب کراچی چھوڑنے تک موصول نہ ہوا۔ تاہم مولانا نے اس خیال سے سفر کی تیاری جاری رکھی کہ اگر مصر و شام جانا نہ بھی ہوا تو فی الحال سعودی عرب اور اردن (مع فلسطین) ہی پر اکتفا کر لیں گے۔

اس کے بعد سوال ایکسچینج کا تھا کہ معلوم نہیں موجودہ حالات میں ہماری اپنی حکومت اتنا ایکسچینج دیتی ہے کہ نہیں، جس سے یہ سفر کیا جا سکے۔ اسٹیٹ بنک کو پانچ ہزار روپے کی ایکسچینج کے لیے درخواست دی گئی۔ لیکن اس نے صرف سوا تین ہزار کا ایکسچینج (225 پونڈ) دینے کا وعدہ کیا۔ اگرچہ یہ رقم پیشِ نظر سفر کے لیے بالکل ناکافی تھی، لیکن مولانا نے خدا کے بھروسے پر اسی کو قبول کر کے سفر کا عزم کر لیا۔

مولانا نے اپنی رفاقت کے لیے دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا بھی فیصلہ کیا۔ ایک کراچی کے چودھری غلام محمد صاحب کو اور دوسرے مجھے۔ سفر کی نوعیت بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ اس میں کم از کم تین آدمیوں کا ہونا ضروری تھا۔

چودھری غلام محمد صاحب تو کویت میں اپنے بعض احباب کے اصرار اور دعوت پر 9 اکتوبر 1959ء ہی کو کراچی سے کویت روانہ ہو گئے، اور طے پایا کہ جب ہم (مولانا اور مَیں) اپنے پروگرام کے مطابق ظہران (سعودی عرب) پہنچیں گے تو وہ ہم سے وہیں آ ملیں گے۔

لاہور۔۔۔۔کراچی

ہم (مولانا اور میں) نے لاہور ہی سے ہیضے اور چیچک کے ٹیکے لگوائے، کیونکہ سعودی عرب، اُردن اور جمہوریہ عربیہ کا ویزا حاصل کرنے سے پہلے ان کا لگوانا ضروری تھا۔ پھر 22 اکتوبر 1959ء کو ہم بذریعہ خیبر میل لاہور سے روانہ ہو کر 23 کی صبح کراچی پہنچ گئے۔ مولانا کے اس سفر کی اطلاع ایک دن پہلے تسنیم میں آ چکی تھی، اس لیے احباب و رفقاء تقریباً ہر اسٹیشن پر آ کر ملاقات کرتے رہے۔ یہ سلسلہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے یعنی روہڑی اسٹیشن تک جاری رہا۔ اس کے بعد رات زیادہ ہو گئی تھی، اور مولانا کے سونے کا وقت ہو گیا تھا اس لیے حیدر آباد یا اگلے کسی اسٹیشن پر کوئی صاحب ملاقات کے لیے نہیں آئے۔ لوگوں نے عقل مندی کی، ورنہ مولانا کو نیند کی حالت میں بیدار ہونا پڑتا۔

کراچی کا قیام

ہمارا خیال کراچی میں زیادہ دن ٹھہرنے کا نہیں تھا۔ کراچی سے ہر ہفتہ ایک بحری جہاز بصرہ جاتا تھا۔ 27 اکتوبر کو ایک جہاز کے جانے کی تاریخ تھی۔ ہمارا پروگرام اسی سے روانہ ہونے کا تھا۔ خیال تھا کہ تین چار دنوں میں ویزا ایکسچینج اور ٹکٹ کے تمام مراحل طے ہو جائیں گے اور ہم 27 کو بآسانی روانہ ہو سکیں گے مگر بعض اوقات معمولی سی بات پر کوئی ایسی رکاوٹ پیش آ جاتی ہے کہ آدمی کا سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

ویزوں کے حصول میں ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ سعودی عرب کے سفیر استاذ محمد الحمد الشبیلی نے تو نہ صرف یہ کہ ویزا دیا بلکہ ایک روز انہوں نے ہماری شاندار دعوت بھی کی۔ ہمارے سفر کے متعلق اپنی حکومت اور ریاض کے بعض علماء کو بذریعہ تار اطلاع دی اور

تین خط دستی طور پر ہمارے حوالے کیے، ایک ہر اُس سعودی افسر کے نام جو سرحد پر یا کسی دوسری جگہ متعین ہو، تاکہ سفر کے سلسلے میں وہ ہماری ہر ممکن مدد کرے، دوسرا ریاض کے شیخ عبداللطیف بن ابراہیم (دینی معاہد کے نگران اور مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کے چھوٹے بھائی) کے نام اور تیسرا ریاض ہی کے شیخ عبدالعزیز بن باز کے نام۔

اُردن کے قونصل استاذ ہاشم التل نے بھی نہ صرف ویزا دیا بلکہ انھوں نے مولانا سے خصوصی ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ایک روز مولانا انکے ہاں گئے تو انہوں نے بتایا کہ میں آج ہی ایک کام کے سلسلے میں دو ہفتے کے لیے اپنے ملک جا رہا ہوں، وہاں تمام متعلقہ افسران کو آپ کی آمد کی اطلاع دے دوں گا تاکہ اردن میں داخل ہونے کے بعد آپ کو سفر کے سلسلے میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائی جاسکیں۔ انھوں نے بھی ایک خط سرحد پر کسٹم والوں کے نام دستی طور پر ہمارے حوالے کیا۔

جمہوریہ عربیہ کے سفیر استاذ طٰہٰ فتح الدین سے بھی بآسانی ویزا مل گیا۔ مصر کے سفر کے سلسلے میں یوں تو ہمیں کسی پریشانی کا اندیشہ نہ تھا، صرف یہ خیال تھا کہ ہم مصر کا سفر صرف جبل طور (سینا) کے لیے اختیار کر رہے ہیں اور سینا ان دنوں فوجی علاقہ ہے جہاں کوئی مصری بھی حکومت کی خصوصی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا، اس لیے ایسا نہ ہو کہ ہم وقت اور پیسہ خرچ کر کے مصر پہنچیں اور وہاں ہمیں یکا یک یہ معلوم ہو کہ سینا میں داخلے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ تاہم ہم نے جمہوریہ عربیہ کے سفیر سے گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ طے کیا کہ سینا کی اجازت کے سلسلے میں جمہوریہ عربیہ کے سفیر متعینہ سعودی عرب سے گفتگو کی جائے گی۔

ویزا کے حصول کے بعد اسٹیٹ بنک سے 225 پونڈ کا ایکسچینج بھی بر وقت مل گیا۔ لیکن عین وقت پر جو رکاوٹ پیش آئی وہ ٹکٹ کے سلسلے میں تھی۔ ہمارا ارادہ اپنا سفر سعودی عرب سے شروع کرنے اور سعودی عرب میں بھی خُبَر (مشرقی ساحل کا بندرگاہ) کے راستے سے داخل ہونے کا تھا۔ یہ ہمیں پہلے سے معلوم تھا کہ حج کے دنوں کے سوا باقی ایام میں کراچی سے جدہ براہِ راست کوئی جہاز نہیں جاتا، اور اگر کوئی جہاز جاتا بھی ہے تو سعودی عرب کی طرف سے جدہ کے راستہ داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن جب ہم نے خُبَر

جانے کے لیے جہاز ران کمپنی سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ کراچی سے جو جہاز بصرہ جاتے ہیں وہ خُبر پرنہیں ٹھہرتے۔ اس لیے جن لوگوں کو کراچی سے خُبر جانا ہوتا ہے وہ پہلے بحرین اترتے ہیں اور پھر لانچ یا ہوائی جہاز کے ذریعے وہاں سے خُبر جاتے ہیں۔ اب گویا ہمیں بحرین کے ویزا کی ضرورت پیش آئی، اور بحرین کا اندراج مولانا کے پاسپورٹ میں تھا اور نہ میرے پاسپورٹ میں۔ اکتوبر کی 26 تاریخ ہو چکی تھی اور اگلے روز جہاز روانہ ہو رہا تھا، ایک دن میں کسی طرح ممکن نہ تھا کہ پاسپورٹ میں بحرین کا اندراج کرایا جائے، بحرین کا ویزا اور جہاز ران کمپنی سے ٹکٹ بھی لیا جا سکے۔ طوعاً وکرہاً سفر کا ارادہ ایک ہفتہ اور مؤخر کرنا پڑا۔

27 اکتوبر کو پاسپورٹ آفس میں بحرین کے اندراج کے لیے ہم نے اپنے پاسپورٹ داخل کیے۔ عام قاعدے کے مطابق تو ہمیں اپنے پاسپورٹ دس دن کے بعد ملتے لیکن ہم نے ارجنٹ فیس ۔۔۔ دس روپے ۔۔۔ مزید ادا کی، تو ہمیں اگلے روز اپنے پاسپورٹ مل گئے۔ اس کے بعد پانچ دن فرصت ہی فرصت تھی۔ اس میں بحرین کا ویزا بھی لیا گیا اور ٹکٹ بھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستان سے نکلنے سے پہلے حکومت پاکستان کی طرف سے ایک مزید اجازت حاصل کرنا اور پاسپورٹ پر ایک مُہر لگوانا ضروری ہے۔ چنانچہ ان دنوں میں یہ مہم بھی سرانجام دی گئی۔ پاسپورٹ کا حصول اور پھر اپنے ملک سے نکلنے سے پہلے ویزا ،ٹکٹ اور ایکسچینج کے لیے دوڑ دھوپ، واقعی ایک زبردست مہم سے کم نہیں ہے۔ یہ اس زمانہ میں ہر ملک پر وطنی قومیت کا بھوت سوار ہونے کا نتیجہ ہے گویا اپنے ملک سے نکلنے یا باہر سے اندر آنے والا ہر شخص ایک چور ہے، جس کی ہر موقع پر جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ ورنہ مسلمان حکومتوں کے درمیان ایک مسلمان کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کا یہ چکر اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل فضول اور بے معنی بات ہے۔ ساتویں صدی میں ابنِ بطوطہ مراکش سے چین تک پھر گیا۔ محمد تغلق کے زمانہ میں وہ ہندوستان بھی آیا اور یہاں کئی سال تک مقیم رہا۔ یہاں اس نے شادی بھی کی اور قاضی کے عہدے پر فائز بھی رہا اور سفیر بنا کر بھی بھیجا گیا، لیکن کسی موقع پر اسے پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت نہ پڑی۔

کراچی میں قیام کے دس دن اسی دوڑ دھوپ کی نذر ہوئے یا پھر احباب و رفقاء سے

ملاقاتیں رہیں اور ان کی مختلف دعوتوں میں شرکت۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مولانا لاہور سے چلتے وقت اپنے ساتھ تفہیم القرآن کا کچھ کام لے آئے تھے، ورنہ نہ معلوم ان کے یہ بے کاری کے دن کیونکر کٹتے۔ مولانا نے تفہیم القرآن کی قسط (برائے ترجمان القرآن ماہ نومبر و دسمبر 1959ء) ان ہی دنوں میں لکھی اور اپنے بعض ادھورے مضامین بھی مکمل کیے۔

کراچی سے بحرین

(3 تا 8 نومبر 1959ء)

جہاز ران کمپنی کا اعلان تھا کہ اب اس کا آئندہ جہاز جس کا نام واریسا تھا، 3 نومبر کی شام کراچی سے روانہ ہوگا۔ گن گن کر انتظار کے دن پورے ہوئے اور نومبر کی 3 تاریخ پہنچ گئی۔ ہم نے اپنی ضرورت کی چیزیں سب خرید لی تھیں اور سامان تیار کر لیا تھا۔

مولانا کا ٹکٹ فسٹ کلاس کا تھا اور ان کا کیبن بھی ریزرو تھا، اس لیے انہیں وقت سے بہت زیادہ پہلے بندرگاہ پر پہنچنے کی ضرورت نہ تھی ،لیکن میرا ٹکٹ ڈیک کا تھا اور مجھے اپنی جگہ کے لیے جدوجہد کرنا تھی، اس لیے میں 3 بجے کے قریب ہی بندرگاہ پہنچ گیا۔ بعض دوست ساتھ تھے اور اکثر سے بندرگاہ پر ملاقات ہوئی جو مولانا سے ملاقات کے لیے ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان دنوں چونکہ عراق کی زیارتوں کا سلسلہ بند تھا اور عراق کے لیے لوگوں کو ویزا بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اس لیے جہاز کے لیے مسافروں کی بھیڑ بہت کم ہوگی۔ لیکن جب میں بندرگاہ پہنچا تو مسافروں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ معلوم ہوا کہ کراچی سے جو لوگ پاکستان کے اپنے بندرگاہ گوادر جاتے ہیں، وہ اسی جہاز سے سفر کرتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے بھیڑ بھی تھی۔ ایک لمبی لائن میں کھڑے ہو کر پہلے میں نے اپنے پاسپورٹ پر پولیس کی مہر لگوائی۔ بحرین اترتے وقت پولیس والوں کو جو کارڈ پر کر کے دینا ہوتا ہے، وہ بھی یہیں سے مل گیا۔ پھر سامان کی چیکنگ ہوئی۔ بحری جہاز میں مسافروں پر سامان کے سلسلے میں گاڑی اور ہوائی جہاز کی طرح ایک مقررہ وزن کی قید نہیں ہوتی، اس لیے میں نے اپنے دو بکس بھی مولانا ہی کے حوالے کر دیے تھے۔

فسٹ اور سکینڈ کلاس والوں کے سامان کی چیکنگ بھی بڑی شرافت اور معقولیت سے کی جاتی ہے۔ یہ تو ڈیک کے مسافر ہی ہیں جن پر ہر قسم کی بے قاعدگی اور سمگلنگ کا شبہ کیا جاتا ہے اور ان کے سامان کی سختی سے تلاشی لی جاتی ہے۔ ہر جگہ غریب پبلک۔۔۔ جمہور۔۔۔ کا یہی حال ہے۔

اب میرے پاس صرف ایک بستر تھا اور ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ، اس لیے چیکنگ میں مجھے بھی کوئی پریشانی پیش نہیں آئی۔ چیکنگ کے بعد جہاز پر آیا تو وہاں کوئی جگہ ایسی نظر نہ آئی، جہاں اپنا بستر تک لگا سکوں۔ تلاش کے بعد ایک کونے میں جہاں کوئی سائبان تک نہیں تھا، اپنا بستر لگا لیا اور مولانا کا انتظار کرنے لگا۔

5 بجے کے قریب مولانا تشریف لائے۔ الحمد للہ سامان کی چیکنگ میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور ان کے پاسپورٹ پر پولیس کی مہر بھی جہاز پر سوار ہونے کے ساتھ ہی لگی۔ احباب ورفقاء کی ایک کثیر تعداد تھی جس نے جہاز پر سوار ہوتے وقت انہیں الوداع کہی۔ ماہر القادری، پروفیسر خورشید احمد صاحب، اخلاق حسین صاحب اور مولانا کے صاحبزادے احمد فاروق مولانا کے ساتھ جہاز کے اندر تک آئے۔ مولانا کے کیبن کا نمبر 1 تھا، جس میں کوئی دوسرا مسافر ان کا شریک نہیں تھا۔ اس کا غسل خانہ اور بیت الخلاء بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ فسٹ کلاس کے عام کیبنوں میں یہ سہولت نہیں ہوتی۔ ہر کیبن میں کم از کم دو مسافر ہوتے ہیں اور بیت الخلاء اور غسل خانہ تو کئی کئی کیبنوں کا مشترک ہوتا ہے۔ اس لیے فسٹ کلاس کا ٹکٹ لینے پر بھی کسی شریف آدمی کو یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ کسی رند مے خوار سے اس کا ساتھ نہیں ہو جائے گا۔ الحمد للہ مولانا کو یہ اطمینان تھا۔

ساڑھے سات بجے شام کے قریب جہاز روانہ ہوا۔ دوسرے لوگ تو جہاز کی روانگی سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ میں مولانا کے پاس رہا اور عشاء کے قریب اپنی جگہ پر آ گیا۔ آئندہ جتنے دن جہاز کا سفر رہا، مجھے یہ سہولت رہی کہ دن میں جب ضرورت پڑتی کسی کے اعتراض کے بغیر مولانا کے پاس آ جاتا اور اکثر وہیں بیٹھ کر مطالعہ وغیرہ کرتا رہتا۔ البتہ عشاء کے بعد اپنی جگہ پر آنا ضروری ہوتا تھا، کیونکہ رات کے وقت جہاز والے ڈیک سے اوپر جانے کے تمام راستے بند کر دیتے تھے۔

گوادر

اگلے روز دو (2) بجے کے قریب ہمارا جہاز پاکستان کے بندرگاہ گوادر پہنچا۔ یہاں چونکہ کوئی باقاعدہ بندرگاہ نہیں ہے، اس لیے جہاز خشکی سے ایک ڈیڑھ میل دور ٹھہرتا ہے اور لوگ کشتیوں کے ذریعے خشکی اور جہاز کے درمیان کا راستہ طے کرتے ہیں۔ جس وقت ہمارا جہاز وہاں پہنچا، سمندر میں قدرے تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس تیز ہوا میں بادبانی کشتیوں کو جہاز تک پہنچنے کے لیے جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ راستہ طے کرنے میں انہیں ایک گھنٹہ لگ گیا اور پھر سخت افراتفری کے عالم میں مسافر جہاز پرسوار ہوئے اور اترنے والے مسافر جہاز سے اتر کر کشتیوں میں بیٹھے۔ یہ دیکھ کر مولانا فرمانے لگے کہ خدا کسی شریف آدمی کو یہاں نہ لائے۔

یہاں کے کسٹم آفیسر صاحب لاہور کے رہنے والے تھے۔ وہ بھی جہاز پر آئے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ مولانا اس جہاز سے سفر کر رہے ہیں تو وہ تلاش کرتے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔ انھوں نے بتایا کہ آج تو موسم پھر بھی غنیمت ہے، اس لیے مسافروں کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی، ورنہ جس دن موسم خراب ہو اور سمندر میں تیز ہوا چل رہی ہو تو یہاں بالکل قیامت کا سماں ہوتا ہے، خصوصاً گرمی کے موسم میں تو حالت بالکل ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ چونکہ کراچی اور گوادر کے درمیان بحری جہاز کے سوا کوئی دوسرا معقول ذریعہء آمدورفت نہیں ہے، اس لیے مسافروں کی اچھی خاصی تعداد ہر جہاز سے اترتی اور اس میں سوار ہوتی ہے، لیکن ان کی سہولت کے لیے یہاں ایک بھی اچھی قسم کی کشتی نہیں ہے۔ صرف ایک لانچ ہے جس میں کسٹم کے عملہ کے لوگ آتے جاتے ہیں، باقی سب بادبانی کشتیاں ہیں جن کے لیے سمندر میں معمولی سی تیز مخالف ہوا کا مقابلہ کرنا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے۔ خشکی کے راستہ سے اگر لوگ سفر کرنا چاہیں تو انہیں پہلے کراچی سے کوئٹہ آنا پڑتا ہے اور پھر کوئٹہ سے گوادر، جو تقریباً چھ سو میل کا راستہ ہے اور اس میں کوئی سڑک نہیں ہے، نہ پکی اور نہ کچی، اس لیے یا تو مسافر پیدل چل کر یہ سارا راستہ طے کریں یا پھر اونٹوں کے ذریعے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر یہاں گوادر میں دو چار عمدہ قسم کی لانچوں

کا انتظام کر دیا جائے تا کہ مسافروں کو جہاز اور بندرگاہ کے درمیان اس مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے، جس کا سامنا انہیں اب کرنا پڑ رہا ہے۔[1]

پاکستان کے قبضہ میں آنے سے پہلے گوادر سمگلنگ کا بہت بڑا اڈہ تھا۔ جب پاکستان نے اس کا چارج لیا، تو پانچ کروڑ روپے کا صرف کپڑا یہاں موجود تھا حالانکہ دور سے دیکھنے میں یہ ایک معمولی سا گاؤں نظر آ رہا تھا۔ کسٹم آفیسر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جن لوگوں کو پاکستان میں باہر جانے کے لیے پاسپورٹ نہیں ملتا، وہ گوادر کا ٹکٹ لے کر کراچی سے جہاز پر سوار ہو جاتے ہیں اور گوادر میں اترنے کے بجائے جہاز میں چھپ جاتے ہیں۔ انہیں بڑی دقت سے تلاش کیا جاتا ہے اور اسی لیے یہاں اکثر جہاز لیٹ ہو جاتا ہے۔ اسی تلاش میں ہمارا جہاز بھی لیٹ ہو گیا۔ اگر لوگوں کو پاسپورٹ کی سہولتیں حاصل ہوں، تو وہ اس قسم کی بے قاعدگیاں کیوں کریں۔

مسقط، دُبئی اور ام سعید

اگلے روز 5 نومبر کو ہمارا جہاز مسقط، 6 کو دبئی اور 7 کو ریاست قطر کے بندرگاہ ام سعید جسے عام طور پر لوگ مسعید بولتے ہیں پہنچا۔ یہ سب خلیج فارس کے عرب ساحل پر چھوٹی چھوٹی عرب ریاستیں ہیں، جن پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔ انگریزوں نے اگرچہ بظاہر یہاں کٹ پتلیوں کی طرح شیوخ بٹھا رکھے ہیں، لیکن عملاً نظم ونسق کی کنجی انکے اپنے ہاتھ میں ہے۔ شروع میں انگریزوں نے ان ریاستوں پر صرف اس لیے قبضہ جمایا تھا کہ خلیج فارس یعنی عراق و ہندوستان کے درمیان بحری راستہ پر اپنا قبضہ محفوظ رکھا جائے۔ لیکن جب سے ان ریاستوں میں پٹرول بھی نکل آیا ہے یا نکلنے کی توقع ہوئی ہے انہوں نے پوری طاقت سے ان پر اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں۔

مسقط، دبئی اور ام سعید اگرچہ بڑے بندرگاہ نہیں ہیں اور یہاں بھی جہاز خشکی سے چار پانچ میل دور ٹھہرتا ہے، لیکن یہاں لانچوں کی وجہ سے مسافروں کو اترنے چڑھنے میں اس

1- تا حال اس صورت حال میں کوئی فرق نہیں پڑا (20 ستمبر 67ء)

قسم کی دِقت پیش نہیں آتی جو ہم نے گوادر میں دیکھی۔

جس وقت ہمارا جہاز مسقط پہنچا، میں اوپر مولانا کے پاس تھا، جہاز کے روانہ ہونے کے بعد جب میں نیچے اپنی جگہ پر آیا تو معلوم ہوا کہ مسقط کے کچھ دکاندار جہاز کے اندر آ گئے تھے اور انھوں نے یہاں باقاعدہ بازار لگایا اور لوگوں نے خوب خوب چیزیں خریدیں۔ پاکستان کا نوٹ یہاں نہیں چلتا، ہندوستانی نوٹ چلتا ہے اور وہ بھی وہ ہندوستانی نوٹ جو ہندوستان نے خاص طور پر خلیج فارس کی ریاستوں کے لیے تیار کیا ہے۔ پاکستان کے نوٹ کی قیمت اگرچہ سرکاری طور پر اس کے برابر ہے، لیکن جہاز کے بازار میں پاکستانی نوٹ کی قیمت اس کے مقابلے میں دو تہائی رہی۔ پھر اسی قسم کا بازار آگے چل کر دبئی اور ام سعید پر بھی لگا، بلکہ بعض دکان داروں نے تو جو دراصل مسافر تھے مستقل دکانیں جما لیں، جو چلتے جہاز میں بھی لگی رہیں۔ کپڑا، جوتے، بسکٹ، قلم، الغرض ضرورت کی عام چیزوں میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس بازار میں نہ ملتی ہو اور وہ بھی نہایت سستے داموں۔ ایک جاپانی چپلی کی قیمت میں نے دریافت کی تو دکان دار نے در روپے بتائی، حالانکہ اسی چپلی کی قیمت ان دنوں لاہور و کراچی میں دس روپے کے قریب تھی۔ یہی حال کپڑے اور دوسری چیزوں کا تھا۔

ہمارا یہ جہاز صرف سواری کا جہاز نہ تھا بلکہ سواری اور مال دونوں کا ملا جلا جہاز تھا۔ اسی لیے ہر بندرگاہ پر ٹھہرتا اور وہاں مسافروں کے علاوہ تجارتی سامان اتارنے اور چڑھانے کی وجہ سے کئی کئی گھنٹے رکا رہتا تھا۔ ام سعید پر جو سامان اترا ہم نے دیکھا کہ اس میں بڑی تعداد بوریوں میں بند خشک گوشت کی تھی جو غالباً آسٹریلیا سے مشینوں کے ذریعے کٹ کر آیا تھا۔ افسوس اہلِ عرب اس معاملہ میں بالکل بے حس ہو گئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ جہاز میں شراب خوب پی جاتی ہے، خصوصاً فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے مسافر تو گویا شراب پینے اور رنگ رلیاں منانے ہی کے لیے سفر کرتے ہیں۔ رات کے وقت جسے دیکھیے اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ جہاز کے عملہ کے ایک آدمی نے بتایا کہ کراچی میں جو لوگ جہاز پر آئے تھے، ان میں سے اکثر یہاں شراب پی کر گئے۔ جہاز پر شراب سستی بھی ملتی ہے اور اس کے لیے یہاں ''ڈاکٹری سرٹیفکیٹ'' کی بھی ضرورت

نہیں پڑتی تو آخر پینے والے اسے کیوں نہ پییں؟

ہمارے اسی جہاز میں ضلع گجرات کے ایک مولوی صاحب کراچی سے بحرین جا رہے تھے۔ بحرین سے انہیں ہماری ہی طرح خُبر جانا تھا اور پھر عمرہ کے لیے مکہ معظمہ۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے لیکن اپنے کیبن میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتے تھے، کیونکہ کیبن میں دوسرے مسافروں کی شراب نوشی کی وجہ سے ان کا اپنے کیبن میں بیٹھنا ممکن نہ تھا۔

جہاز میں کھانا دو طرز کا ہوتا ہے، انگریزی طرز کا اور ہندوستانی طرز کا۔۔۔۔ اور پھر ہر کھانے کے فسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ تین درجے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی کھانے میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق بھی ہوتی ہے، لیکن جہاز والوں کا سارا اہتمام گویا انگریزی طرز کے کھانے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے تیسرے درجے کا کھانا بھی ہندوستانی طرز کے اول درجے کے کھانے سے بہتر ہوتا ہے، لیکن اس میں گوشت کے مشکوک ہونے کی وجہ سے کسی محتاط مسلمان کا اس میں شریک ہونا مشکل ہے۔ مولانا نے ہندوستانی طرز کے کھانے ہی کو ترجیح دی۔ یہ کھانا اگرچہ فسٹ کلاس کا تھا اور مولانا نے اس کی اجرت غالباً سو روپے سے زیادہ ہی ادا کی ہوگی، لیکن یہ نہایت ناقص قسم کا تھا، بالکل ہندوؤں کے طرز کا بنا ہوا۔ اس میں گھی بھی ردّی قسم کا تھا، اس لیے مولانا چند وقت سے زیادہ اسے نہ نبھا سکے اور جہاز کی صاف اور کھلی فضا کے باوجود سفر کے آخری تین چار دن بس برائے نام ہی کھاتے رہے۔ ڈیک کے مسافروں کا ٹکٹ دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ کھانے سمیت بھی اور کھانے کے بغیر بھی۔ جو لوگ ٹکٹ کے ساتھ کھانے کی قیمت بھی ادا کرتے ہیں انہیں جہاز پر کھانا لنگر میں جا کر کھانا پڑتا ہے۔ پہلے سفر کی وجہ سے مجھے ڈیک کے اس کھانے کا حال معلوم تھا، اس لیے میں نے اپنا ٹکٹ کھانے کے بغیر ہی لے لیا تھا۔ جہاز پر پہنچ کر میں نے کچن کے مسلم مینجر کو چالیس روپے ادا کر کے فسٹ کلاس کے ہندوستانی طرز کے کھانے کا ٹکٹ بنوا لیا جو ایک تو میری اپنی جگہ پر آ جاتا تھا اور دوسرے بہر حال اس قابل تھا کہ میرے جیسا آدمی اسے نبھا سکتا تھا۔

موسم غنیمت تھا اور سمندر میں بھی تلاطم نہیں تھا، اس لیے جہاز پر متلی یا سر میں گھمیری کی شکایت سے ہم لوگ بڑی حد تک محفوظ رہے۔ مولانا تو الحمد للہ بالکل محفوظ رہے، مجھے

ایک دن سر میں ہلکی سی گھمیری محسوس ہوئی، لیکن وہ لیموں کا اچار کھا لینے سے دور ہوگئی، ورنہ مجھے یاد ہے کہ 49ء میں جب میں نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ساتھ گرمی کے موسم میں کراچی سے بصرہ کا سفر کیا تھا تو متلی اور دورانِ سر کی وجہ سے میرا برا حال ہوا تھا۔

بحرین: 8 تا 10 نومبر 1959ء

8 نومبر کی صبح 7 بجے کے قریب ہمارا جہاز بحرین پہنچ گیا۔ بحرین خلیج فارس میں ایک بڑے اور دو چھوٹے جزیروں کے مجموعہ کا نام ہے، یوں صرف بڑے جزیرے کو بھی بحرین کہہ دیتے ہیں۔ اس بڑے جزیرے میں منامہ نامی ایک ہی شہر ہے اور وہی بندرگاہ بھی ہے اور یہیں ہمارا جہاز بھی رکا۔ اس کے قریب سمندر میں دور تک پانی بہت ہی اوتھلا ہے اس لیے ہمارا جہاز بندرگاہ سے تقریباً 4 میل دور ٹھہرا۔ 9 بجے کے قریب ہم جہاز سے اتر کر لانچ میں سوار ہوئے۔ لانچ والے نے بندرگاہ تک پہنچانے کی اجرت پانچ روپے فی کس وصول کی۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم بندرگاہ پہنچ گئے۔

جب تک ہم لانچ پر تھے، ہمارا خیال تھا کہ بحرین میں ہمیں جاننے والا کوئی شخص نہیں ہے، اس لیے ہم یہاں صرف چند گھنٹے ٹھہریں گے اور اس کے بعد لانچ یا ہوائی جہاز سے خُبَر (سعودی عرب) روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن جب لانچ خشکی کے قریب پہنچا تو جو لوگ مسافروں کو لینے کے لیے بندرگاہ پر آئے تھے ان میں چند صورتیں ہمیں ایسی دکھائی دیں جن کی نگاہیں گویا ہمیں تلاش کر رہی تھیں۔ جب ہم لانچ سے اترے تو تین آدمیوں نے، جن میں سے ایک پاکستانی لباس میں تھے اور باقی دو عربی لباس میں، بڑھ کر ہم سے مصافحہ کیا۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ جو صاحب پاکستانی لباس میں ہیں وہ ضلع ہزارہ کے رہنے والے ہیں اور عرصہ ڈیڑھ دو سال سے یہاں بحرین کے ایک پرائمری سکول (جس میں تمام بچے ہندوستانی و پاکستانی ہیں) کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اور انکے دوسرے دو ساتھی یہیں بحرین کے رہنے والے ہیں۔ جب ہم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع کیسے ہوئی، تو انہوں نے بتایا کہ خُبر اور ظہران (سعودی عرب) میں بعض لوگوں کو آپ کے آنے کی اطلاع کراچی سے ہوگئی تھی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ ہمیں اطلاع دی

بلکہ ایک صاحب کو خاص طور پر آپ کو لینے کے لیے بھیجا ہے اور اس وقت یہ صاحب آپ کا استقبال جہاز ہی پر کرنے کے خیال سے ایک بحرینی دوست کے ساتھ جہاز تک گئے ہوئے ہیں۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اگلے لانچ سے یہ دونوں صاحب بھی آ گئے، جو صاحب ظہران سے آئے تھے وہ پاکستانی تھے اور ان کا نام اسماعیل خاں تھا۔ یہ بھی ضلع ہزارہ کے رہنے والے اور گزشتہ 8 سال سے عرب امریکن تیل کمپنی (آرامکو) میں ملازمت کی وجہ سے ظہران میں مقیم تھے۔

جہاز سے اترتے وقت ہمیں اپنے پاسپورٹوں پر بحرین میں داخلے کی مہر لگوانی چاہیے تھی لیکن ہم اپنی ناواقفیت اور پھر جلدی کی وجہ سے یہ مہر نہ لگوا سکے۔ اب اگر ہمارے جاننے والے یہ لوگ بندرگاہ پر موجود نہ ہوتے تو ہمیں بڑی پریشانی ہوتی، لیکن الحمد للہ ان کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور ان کے تعلقات کی وجہ سے یہ مہر وہیں لگ گئی۔ ہمارے سامان کی بھی گویا چیکنگ نہیں ہوئی اور اسی طرح چند منٹوں سے زیادہ بندرگاہ پر ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔

اس کے بعد ہم ایک ہوٹل ''فُندُق البحرین'' (جس کا مالک ایک ایرانی تھا) پہنچے۔ منامہ بہت ہی خوبصورت شہر نظر آ رہا تھا، سڑکیں نہایت عمدہ تھیں اور تمام عمارتیں جدید طرز کی بنی ہوئی تھیں۔ اسماعیل خاں صاحب نے پہلے ہی سے ہمارے لیے ہوٹل میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ ہم نے اس میں اپنا سامان رکھوایا اور کپڑے بدلے۔ اس کے بعد ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں سے کچھ تو پاکستانی تھے اور زیادہ تر بحرین ہی کے رہنے والے تھے، جنھوں نے مولانا کی عربی کتابیں یا المسلمون اور دوسرے عربی پرچوں میں ان کے مضامین پڑھے ہوئے تھے اور غائبانہ طور پر ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ دوپہر کا کھانا ہمارے پاکستانی دوست (جنھوں نے بندرگاہ پر ہمارا استقبال کیا تھا) اپنے گھر سے لے آئے۔ معلوم ہوا کہ ان کا گھر ہوٹل سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اگر ہمیں یہ پہلے سے معلوم ہوتا تو انہیں اس قدر تکلف میں پڑنے کی اجازت نہ دیتے اور یہیں بازار سے کھانے کا کوئی انتظام کر لیتے، اگرچہ ہمارا جی یہی چاہتا تھا کہ کم از کم آج کا کھانا اگر کوئی صاحب گھر سے لانے کی پیش کش کریں تو دل کی تمنا بر آئے، کیونکہ لگاتار کئی

دن تک جہاز کا ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے ہم ''بازاری کھانے'' سے اکتا گئے تھے۔ ہمارے علاوہ آٹھ دس آدمیوں نے مل کر یہ کھانا کھایا۔ کھانا پاکستانی طرز کا تھا اگرچہ کچھ عربی اثر لیے ہوئے۔ عربی اثر سے مراد یہ ہے اس میں مرچ بہت کم تھی، لیکن ہمارے بعض بحرینی دوستوں پر یہ بھی کچھ سخت گزری۔ عرب ممالک میں لوگ سرخ مرچ بالکل استعمال نہیں کرتے۔ بحرین میں ہند اور پاکستان سے قربت کی وجہ سے کچھ لوگ اس کا استعمال کر لیتے ہیں لیکن عام باشندوں کا حال دوسرے عرب ممالک جیسا ہی ہے۔ اس پر دوسرا عربی اثر یہ تھا کہ اگرچہ دو یا تین آدمیوں کے لیے تھا لیکن اس کی مقدار اتنی تھی کہ دس بارہ آدمیوں نے اسے خوب سیر ہو کر کھایا۔ عربوں کے ہاں یہ بڑی معیوب بات سمجھی جاتی ہے کہ مہمانوں کے سامنے کھانا ان کی تعداد کے مطابق رکھا جائے، بلکہ مہمانوں کی عزت افزائی اس میں ہے کہ کھانا ان کی تعداد سے بہت زیادہ ہو، تاکہ وہ جسے چاہیں اپنے ساتھ شامل کر سکیں۔

کھانے کے بعد ہم نے ان لوگوں سے اگلے روز خبر روانہ ہو جانے کی اجازت چاہی، مگر انہوں نے کم از کم ایک ہفتہ بحرین میں ٹھہرنے پر اصرار کیا۔ اپنے طور پر انھوں نے ہماری ہفتہ بھر کی ملاقاتوں اور دوسری مصروفیتوں کا پروگرام بھی بنا رکھا تھا۔ لیکن ہمارے پاس وقت چونکہ کم تھا، اس لیے بالآخر یہ طے پایا کہ ہم دو دن ٹھہر کر، 10 نومبر کو خبر روانہ ہو جائیں گے۔

مغرب تک ہم لوگ ہوٹل ہی میں رہے اور ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔ رات کو المُحَرَّق (بحرین کا دوسرا چھوٹا جزیرہ جو منامہ سے ایک ایسے پل کے ذریعے ملا ہوا ہے جو جہازوں کے گزرنے کے لیے اٹھا دیا جاتا ہے اور دوسرے اوقات میں لگا رہتا ہے) میں ہماری ایک عرب دوست کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ مغرب کے بعد چند دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ وہاں پندرہ کے قریب سنجیدہ اور پڑھے لکھے نوجوان موجود تھے، جنہوں نے بڑی گرم جوشی اور محبت سے مولانا کا استقبال کیا۔ پھر تعارف ہوا۔ عشاء کی نماز ہم نے ان کے ساتھ پڑھی۔ پھر کھانا کھایا، کھانے پر عربی تہذیب اور عربی ذوق غالب تھا۔ دسترخوان پر کئی طرح کے کھانے رکھے ہوئے تھے، لیکن کسی میں سرخ مرچ نہ تھی۔ گویا اس سفر میں آج ہماری بلا مرچ کا کھانا کھانے کی ابتدا ہو رہی تھی۔ ویسے ان لوگوں نے ہمارے ہندو پاکستانی ذوق کا بھی لحاظ رکھا اور وہ اس طرح کہ

ہمارے سامنے ایک چھوٹی پلیٹ میں پسی ہوئی مرچ رکھ دی، تاکہ ہم از خود جس کھانے پر چاہیں اسے ڈال کر کھاتے رہیں۔ تمام کھانے بڑے اہتمام اور تکلف سے تیار کیے گئے تھے اور ہمارے بحرینی دوست خوب مزا لے لے کر کھا رہے تھے، لیکن مرچ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں کسی کھانے میں مزا نہ آ رہا تھا۔ ہم یہ سوچتے ہی رہے کہ آخر یہ لوگ مرچ کے بغیر کیسے کھانا کھا لیتے ہیں۔ بہر حال جہاں تک ہو سکا ہم نے پسی ہوئی مرچ سے پھیکے پن کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ کھانے کے بعد چائے آئی اور وہ دودھ کے بغیر۔ گزشتہ سفر میں بھی ہمیں دودھ کے بغیر چائے سے سابقہ پیش آتا رہا تھا، لیکن ہم اکثر موقعوں پر یا تو معذرت کرتے رہے تھے یا جہاں بے تکلفی ہوتی تھی وہاں دودھ طلب کر لیا کرتے تھے، لیکن یہاں معذرت کرنا اچھا معلوم نہ ہوا۔ عرب ملکوں کے لوگ چائے میں دودھ ڈالنا جانتے ہی نہیں۔ اور پھر ان ملکوں میں اس کثرت سے چائے پی جاتی ہے کہ ہمارے ہاں بہت کم لوگ دودھ کے ساتھ بھی اتنی چائے پی سکتے ہیں۔ تعجب یہ کہ جو ملک زیادہ گرم ہیں وہاں زیادہ چائے پی جاتی ہے۔ عراق کے لوگوں میں سے ہر شخص ہر روز پندرہ بیس پیالیاں چائے پی جاتا ہے اور پھر ان کی چائے بھی اس قدر سیاہ اور سخت ہوتی ہے کہ اگر میرے جیسا آدمی صبح کے وقت ایک پیالی پی لے، تو رات تک سر کو لے کر پڑا رہے۔ عراق کے بعد دوسرا نمبر حجاز اور پھر دوسرے ممالک کا ہے۔ شام ایک ایسا ملک ہے جہاں کی آب و ہوا اگرچہ نہایت سرد ہے، لیکن وہاں لوگوں کو چائے پینے کی بہت کم عادت ہے اور مقدار کی کمی کے علاوہ ان کی چائے بھی اتنی ہلکی ہوتی ہے کہ عراق والے کہتے ہیں کہ ایسی چائے تو ہم اپنے بچوں کو دیتے ہیں، اسی لیے شام کے لوگوں کی صحت بہت عمدہ ہے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ ایک بڑے کمرے میں بیٹھ گئے۔ دوسرے لوگوں کے آنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ لوگ مختلف موضوعوں پر مولانا سے سوالات کریں اور مولانا ان کے جوابات دیں۔ سوالات عام طور پر پاکستان، ہندوستان اور کشمیر میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق تھے یا یہ کہ اس زمانہ میں دعوتِ اسلامی کا کام کیسے کیا جائے؟ ایک چیز جو ان سوالات سے ظاہر ہوتی تھی وہ یہ کہ ان لوگوں میں چونکہ اپنے ہاں کے حالات کو دیکھ کر خیر پر شر کے غلبہ کا احساس بہت زیادہ

ہے اور وہ یہ بھی پوری طرح سمجھتے ہیں کہ کس طرح وہ پورے عالمِ اسلامی سے کٹ گئے ہیں، اس لیے ان میں اسلام کے لیے کام کرنے کا جذبہ بہت ہے۔ یہ صرف اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی ان کو سیدھے راستے پر ڈال دے۔ اسی لیے یہاں اگر کسی عالمِ دین کا گزر ہو جاتا ہے تو ان لوگوں کو بڑی ہی نعمت غیر مترقبہ حاصل ہو جاتی ہے۔ مولانا ان کے سوالات کا اطمینان اور تفصیل سے جواب دیتے رہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق مولانا نے بتایا کہ ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسے اسرائیل میں عربوں کی۔ یہ مختصر جواب نہایت مؤثر رہا۔ اس مثال کے بغیر اگر ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق کوئی مفصل تقریر بھی کی جاتی تو شاید وہ اتنی مؤثر نہ ہوتی۔ بعض لوگوں نے پاکستان کے موجودہ سیاسی مسائل کے متعلق بھی سوالات کیے، لیکن مولانا نے انکا جواب نہیں دیا اور فرمایا کہ میں پاکستانی سیاست کو کراچی کے ساحل پر بطور امانت رکھ آیا ہوں اور جب واپس جاؤں گا تو اسے وصول کرلوں گا، اس لیے آپ لوگ اس کے متعلق مجھ سے سوالات نہ کریں۔ بعض سوالات سے اندازہ ہوا کہ بحرین میں چند تبلیغی جماعت سے متاثر حضرات بھی رہتے ہیں، جن کی باتوں سے بعض لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ مولانا مودودی اور تبلیغی جماعت کے درمیان کچھ بڑے اختلاف ہیں۔ ''الفرقان'' کے مضامین بھی اس خیال کو تقویت دینے کا سبب بنے تھے۔ اس سلسلہ میں بعض سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ ہمارے اور تبلیغی جماعت کے درمیان کوئی کشمکش یا مخالفت نہیں ہے۔ دین کا کام وہ اپنی سمجھ اور طریقِ کار کے مطابق کر رہے ہیں اور ہم اپنی سمجھ اور طریقِ کار کے مطابق۔ اس زمانہ میں باطل کا اس قدر غلبہ ہو چکا تھا کہ دو چار جماعتیں تو درکنار، اگر ایسی سینکڑوں جماعتیں بھی دین کا کام کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں تو وہ کم ہیں۔ اس لئے ایسی جماعتوں کے درمیان مخاصمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مخاصمت تو ان لوگوں کے درمیان ہوتی ہے جن کی ذہنیت دکانداروں کی ہوتی ہے اور وہ کوئی کام اللہ کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد اور ناموری کے لئے کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے ان لوگوں کو تلقین کی کہ اس زمانہ میں جو لوگ دین کا کام کر رہے ہیں۔ آپ ان سب کا لٹریچر پڑھیے اور ان کا کام دیکھیے، پھر جدھر اطمینان ہو، جا کر خلوص کے ساتھ دین کی خدمت کیجیے، اور

خواہ مخواہ دوسرے خادمانِ دین سے نہ اُلجھیے۔

سوالات کا سلسلہ تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہا۔ 12 بجے کے قریب لوگوں نے خود ہی محسوس کیا کہ چونکہ مولانا آج ہی سفر سے آرہے ہیں۔ اور بہت تھکے ہوئے ہیں اس لیے انہیں آرام کرنے دیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم اپنے ہوٹل آ گئے۔

اگلے روز دوپہر تک ہم بازار میں اپنے لیے سفر سے متعلق ضروریات کی خرید و فروخت میں مصروف رہے۔ تمام بازار نہایت پر رونق اور بیرونی سامان (خصوصاً انگلستان اور جاپان سے برآمد شدہ) سے بھرے ہوئے تھے، ضروریت تو ضروریات، سامانِ تعیش میں سے بھی کوئی چیز ایسی نہ ہوگی، جو وہاں موجود نہ ہو اور قیمتیں بعض اوقات حیرت انگیز حد تک کم۔ سُنا ہے کہ یہاں بحرین میں باہر سے آنے والے سامان پر صرف دو فی صدی ڈیوٹی ہے، جب کہ یہ ڈیوٹی سعودی عرب میں بھی 10 فیصدی ہے۔ اس لیے یہاں سعودی عرب سے بھی بڑھ کر ارزانی ہے۔ ہمارے دوست اسماعیل خاں صاحب نے بتایا (اور بعد میں خُبر پہنچ کر خود ہمیں بھی اس کا تجربہ ہوگیا) کہ جس چیز کی قیمت بحرین میں ایک روپیہ ہے اس کی قیمت خُبر اور ظہران میں کم از کم ڈیڑھ روپیہ اور مکہ معظمہ و جدہ میں سوا روپیہ کے قریب ہے، اس لیے سعودی عرب سے بھی جو لوگ بحرین آتے یا بحرین سے گزرتے ہیں وہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں یہیں سے خریدتے ہیں۔

بازاروں میں عورتیں بہت کم نظر آئیں اور جو نظر آئیں وہ زیادہ تر برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ سنا ہے کہ یہاں کی عورتوں میں ابھی بے پردگی نہیں ہے، البتہ بعض عورتیں جنہیں ذرا ئی ہوا لگ گئی ہے۔ جھلملی شفاف سیاہ نقاب ڈالے لگی ہیں جس سے چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ باقی سب موٹا نقاب ڈالتی ہیں۔ لیکن اب شامی، لبنانی اور مصری خواتین کے طفیل اس ریاست میں مغربیت آرہی ہے۔ اور اونچے طبقے کی عورتیں تمام حیثیتوں سے میم صاحبہ بن گئی ہیں۔ مردوں میں بھی سوٹ پہنے ہوئے لوگ ہمیں بہت کم نظر آئے۔ اگر سب نہیں تو زیادہ تر لوگ اپنے اسی لمبے کرتے اور سر پر رومال کے ساتھ بازاروں میں پھر رہے تھے۔ یہی حال دکانداروں اور دفتروں کے ملازمین کا بھی تھا۔ سنا ہے کہ یہ لوگ جو بھی بانکا پن اور فیشن پرستی کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے اسی لباس میں کرتے ہیں۔ مثلاً نوجوان قسم کے

لوگوں کے کُرتے ہم نے زیادہ تر ریشم کے اور ان کے سروں کے رومال نہایت باریک چکن کے دیکھے۔ شوقین قسم کے لوگ اس لمبے کرتے پر کوٹ بھی پہنتے ہیں، جو ہم لوگوں کو پہلی نظر میں بہت ہی عجیب معلوم ہوا۔ بہرحال خوشی ہے کہ یہ لوگ ابھی تک کم از کم لباس میں مغربی تہذیب سے بچے ہوئے ہیں، اگرچہ ان کے لمبے لمبے کرتے دیکھ کر مولانا تعجب کرتے رہے کہ معلوم نہیں یہ لوگ ان کرتوں کے ساتھ کام کیوں کر کرتے ہیں۔ ان کی عورتوں کے برقعے بھی عجیب طرز کے ہیں۔ بہت ہی بھاری ہیں اور ناک پر ایک قسم کا لگام سا لگا ہوتا ہے۔ ایک دن مولانا نے فرمایا، عربوں کا بھی عجب حال ہے، ان کے پاس یا تو اپنا یہ پرانا لباس ہے جسے اس زمانے میں نہیں نبھایا جا سکتا، یا پھر یہ لوگ چھوٹتے ہی مغربی لباس کی طرف لپک پڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ لباس میں زمانہ کی رفتار کے ساتھ برابر ترمیم ہوتی رہی ہے، اس لیے ہمارے ہاں کے لوگ اسے نبھا سکتے ہیں اور اس زمانہ میں بھی نبھاتے چلے جا رہے ہیں۔

شام کے وقت ہم بحرین کے آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔ منامہ سے تین میل کے فاصلہ پر پرتگیزوں کا بنایا ہوا ایک قلعہ ہے جو غالباً انہوں نے چودھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا ہوگا، جب کہ وہ خلیج فارس میں عربوں کو بے دخل کرتے پھر رہے تھے۔ اب تو اس قلعہ کے صرف کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ اصل قلعہ منہدم ہو چکا ہے۔ اس قلعہ کے ساتھ ایک دارالآثار بھی ہے، لیکن اس میں سوائے نام کے کوئی چیز نہیں ہے۔ سنا ہے کہ آج سے چند سال پیشتر ڈنمارک کے محکمۂ آثار قدیمہ کی ایک جماعت اس قلعہ کے متعلق معلومات جمع کرنے کے لیے بحرین آئی تھی۔ اس نے جب قلعہ کے اندر اور باہر کھدائی کی تو اسے قلعہ کے ساتھ فینیقیوں کے زمانہ کا ایک مدفون گاؤں ملا۔

قلعہ کے راستہ میں ایک مسجد آئی۔ جس کے متعلق وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے زمانہ کی مسجد ہے۔ معلوم نہیں یہ مقامی روایت کہاں تک صحیح ہے؟ واپسی میں قلعہ کے قریب ہم نے ایک جگہ دیکھی جسے وہاں کے لوگ یابور کہتے ہیں۔ یہ نخلستان کے اندر کھجور کی جھونپڑیوں پر مشتمل ایک بستی ہے۔ گرمی کے موسم میں جب شہر کے پختہ مکانات تپنا شروع ہو جاتے ہیں تو لوگ شہر چھوڑ کر یہاں چلے آتے ہیں اور گرمی کے

سخت دن یہیں گزارتے ہیں۔

مغرب کے بعد ہم اپنے پاکستانی دوست کے ہاں گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے عرب اور پاکستانی حضرات موجود تھے۔ کھانا کھایا، عشاء کی نماز پڑھی اور پھر وہی سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آج کے تمام سوالات صرف ایک موضوع سے متعلق تھے اور وہ یہ کہ اِس زمانہ میں دعوتِ اسلامی کا کام کیونکر کیا جائے۔ یہ سوالات پہلے دن کی بہ نسبت زیادہ سنجیدہ اور علمی انداز لیے ہوئے تھے، اور جو لوگ سوالات کر رہے تھے، نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے، سنجیدہ اور کام کا جذبہ رکھنے والے تھے، اگرچہ ان میں اکثر مایوسی کا شکار نظر آ رہے تھے۔ مولانا کے جوابات سے یہ لوگ بڑی حد تک مطمئن ہو گئے۔ یہ سلسلہ رات کے گیارہ بجے تک جاری رہا اور اس کے بعد ہم اپنے ہوٹل آ گئے۔

بحرین کی عام صُورتِ حال

بحرین جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، تین چھوٹے چھوٹے جزیروں کے مجموعہ کا نام ہے جن کا کل رقبہ 400 مربع میل ہے۔ ان میں بڑا جزیرہ 25 میل لمبا اور تقریباً 12 میل چوڑا ہے اور اس کی کل آبادی ایک لاکھ ستر ہزار ہے۔ سارا جزیرہ میدان ہے اور یہاں کوئی اونچا پہاڑ نہیں ہے۔ صرف ایک ٹیلا ہے جو یہاں کا سب سے اونچا پہاڑ کہلاتا ہے۔ اس کا نام جبل الدخان ہے اور اس کی کل اونچائی 450 فٹ ہے۔ آج سے دس سال پیشتر تک بحرین میں کھجور کے سوا کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی تھی، اور یہ ایک چھوٹی سی غریب ریاست تھی، لیکن پٹرول نکل آنے کے بعد یہاں کی قسمت بدل گئی ہے۔ سنا ہے کہ یہاں پٹرول کے کل 420 کنوئیں ہیں۔

آبادی میں عراق کی طرح شیعہ اور سنی تقریباً برابر ہیں، خصوصاً دیہات میں زیادہ آبادی شیعوں کی ہے۔ تجارت کا بھی بڑا حصہ شیعہ تاجروں کے ہاتھ میں ہے اور شیعوں کا رجحان ایران کی طرف ہے۔ اس چیز کا ایران کے اس دعوے میں جو وہ بحرین کے متعلق رکھتا ہے، بڑا دخل ہے۔ خود فارسی بولنے والوں کی تعداد یہاں بھی اچھی خاصی ہے، جو سب کے سب شیعہ ہیں اور غالباً ایران کے زمانۂ تسلط میں یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ خصوصاً

ہوٹلوں کے مالک اور مزدور تو سب کے سب یہی لوگ ہیں۔

اہل سنت میں اکثریت شافعیہ کی ہے، لیکن سرکاری مذہب مالکی ہے، کیونکہ فرمانروا خاندان مالکی مذہب کا پیرو ہے۔

انگریزوں کی گرفت یہاں بہت سخت ہے۔ حکومت کی باگ ڈوران ہی کے ہاتھ میں ہے اور شیخ محض برائے نام ہے۔ کمپنی کی طرف سے جو رائلٹی انہیں ملتی ہے وہ اس میں مگن ہیں اور خوب دادِ عیش دے رہے ہیں۔ اس رائلٹی اور اس میں اضافہ کے سوا انہیں کسی چیز سے گویا دلچسپی نہیں ہے۔

شہریوں کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی جاسکتی، بلکہ محدود معنوں میں مذہب کے لیے بھی اجتماعی طور پر کوئی کام نہیں کیا جاسکتا۔ جمعہ کے روز مساجد میں خطیب حضرات اس وقت تک کوئی خطبہ نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنا خطبہ پہلے سے لکھ کر حکومت سے پاس نہ کرالیں۔ خفیہ پولیس کا نظام بہت ہی سخت ہے۔ کسی کی تقریر یا تحریر سے آزادی کی ذرا سی بو بھی آتی ہے تو اسے یک لخت بحرین سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہر شخص دوسرے سے بات کرتا ہوا ڈرتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ جو لوگ ہم سے ہوٹل میں ملنے آیا کرتے تھے، وہ اکٹھے ہو کر نہ ہمارے پاس آتے تھے اور نہ بازار میں چلتے تھے۔

یہاں سفید آبادی کے لیے عام آبادی سے دور ایک الگ جگہ مقرر ہے جو یہاں کی سب سے اونچی جگہ ہے اور اسے عوالی کہا جاتا ہے۔

عرب قومیت کا فتنہ یہاں روز بروز پھیل رہا ہے اور اس کے زیرِ اثر غیر عرب مسلمانوں کے خلاف جتنا تعصب ہے، اتنا غیر مسلم عربوں کے خلاف نہیں ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کی تعداد یہاں چند ہزار تک ہے۔ لیکن یہ تعداد عربوں کے تعصب کی وجہ سے روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ عربوں کی طرف سے تیل کی کمپنی پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ غیر عرب سٹاف نہ رکھے اور جو غیر عرب سٹاف پہلے سے موجود ہے اسے جلد سے جلد رخصت کرے۔ کہتے ہیں کہ پاکستانیوں کے خلاف اس تعصب کو پھیلانے میں مصری پراپیگنڈہ نے خاص طور پر کام کیا ہے۔

بحرین کی اصل زبان تو عربی ہے اور انگریزی اب سرکاری طور سے مسلط ہو گئی ہے۔ لیکن یہاں فارسی اور اردو بھی خوب بولی اور سمجھی جاتی ہے، بلکہ ان دونوں زبانوں کے بہت سے الفاظ خود اہل بحرین اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا وہ ان کی اپنی زبان کے الفاظ ہیں۔ راستہ سیدھا، دروازہ، پنکھا، تازہ اور اسی طرح کے کتنے ہی الفاظ ہیں جنھیں اہل بحرین بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ''بند کرنے'' کے لیے انھوں نے بَنّد یُبَنّدُ ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے۔ جسے یہ لوگ اپنا ہی لفظ سمجھتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ صرف فارسی جاننے والے کو تو خیر کوئی دِقّت ہی نہیں، اگر کوئی صرف اردو جاننے والا آدمی بھی وہاں چلا جائے تو ان شاء اللہ اسے چلانے میں کوئی دِقت پیش نہیں آئے گی۔

ظہران، خُبَر اور دمّام

(10 نومبر تا 18 نومبر 1959ء)

بحرین سے خُبَر

10 نومبر کی صبح ہمارا پروگرام بحرین سے خُبَر (سعودی عرب) جانے کا تھا۔ بحرین سے ہر دو گھنٹہ کے بعد ایک ہوائی جہاز ظہران روانہ ہوتا ہے اور صرف دس منٹ میں وہاں پہنچ جاتا ہے۔ جہاز اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اس میں کل دس بارہ آدمیوں کی جگہ ہوتی ہے۔ بقول مولانا کے جہاز کیا ہوتا ہے، کبوتر ہوتا ہے، جو بحرین سے اڑتا اور ظہران میں اتر جاتا ہے۔ کرایہ فی کس 33 روپے ہے۔ ہر مسافر کو اپنے ساتھ 20 کلو (تقریباً 26 سیر) سامان رکھنے کی اجازت ہے اور اس سے زائد سامان کا کرایہ دینا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس چونکہ سامان زیادہ تھا، اس لئے طے پایا کہ مولانا تو اسماعیل خاں صاحب کے ساتھ ہوائی جہاز سے سفر کریں اور میں سامان لے کر بذریعہ لانچ خُبَر پہنچ جاؤں، میری اجنبیت کے خیال سے بحرین کے ایک عرب دوست میرے ساتھ جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ مولانا ساڑھے نو بجے کے ہوائی جہاز سے روانہ ہو گئے اور میں اپنے بحرینی دوست کے ساتھ سامان لے کر بندرگاہ پہنچ گیا۔ میرے پاسپورٹ پر بحرین سے ''خروج'' کی مہر بھی وہیں بندرگاہ پر لگ گئی اور اس کے بعد ہم اپنا سامان لے کر لانچ پر سوار ہو گئے۔ لانچ والے نے ہم سے 6 روپے فی کس وصول کیے۔ اور ہم بارہ بجے کے قریب خُبَر کے لیے روانہ ہو گئے۔ بحرین سے خُبَر کا فاصلہ تقریباً پچیس میل ہے اور عام طور پر لانچ یہ فاصلہ چار گھنٹوں میں طے کرتا ہے۔ لیکن ہماری خوش قسمتی کہ اس دن سمندر میں ہوا کا رخ مشرق سے مغرب کو (یعنی جس سمت کو ہم جا رہے

تھے) تھا، اس لیے ہم ڈھائی گھنٹے میں خُبر پہنچ گئے۔ راستے میں سمندر اتنا اوتھلا تھا کہ بعض جگہ پانی کے نیچے سے زمین صاف نظر آ رہی تھی۔ اس راستہ میں ہمیں بحرین کا تیسرا جزیرہ بھی ملا، جو بہت چھوٹا سا ہے اور اس پر کوئی آبادی نہیں ہے۔

بحرین کے قریب سعودی عرب کے مشرقی ساحل پر تین بندرگاہ ہیں۔ ایک خُبر جو ایک معمولی بندرگاہ ہے اور اس سے صرف مسافر لانچوں کے ذریعے بحرین آتے جاتے ہیں۔ دوسرا دمام جو خُبر سے شمال کی طرف دس بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں مال برداری کے جہاز آ کر ٹھہرتے ہیں اور چونکہ اس کے قریب پانی گہرا نہیں ہوتا، اس لیے پہلے تمام جہاز سمندر میں تین چار میل دور ٹھہرتے تھے اور وہاں سے لانچوں کے ذریعے سامان بندرگاہ پر آتا تھا۔ لیکن اب سعودی عرب کی حکومت نے اس جگہ سمندر کے اندر پتھر ڈال کر تیرہ میل لمبا ایک خشک راستہ بنا دیا ہے اور اس پر ریل کی پٹڑی بھی بچھا دی ہے۔ اب اس راستہ اور ریل کی پٹڑی کے مکمل ہو جانے کے بعد کئی کئی جہاز یہاں آ کر ٹھہرتے ہیں اور جہازوں سے براہِ راست سامان ملک کے اندر آنا جانا شروع ہو گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دمام غالباً ایشیا کا سب سے بڑا بندرگاہ بن گیا ہے۔ یہ بندرگاہ چند ماہ ہوئے ابھی مکمل ہوا ہے ان دنوں اسے مکمل کیا جا رہا تھا۔ تیسرا راس تنورہ جو دمام سے تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ یہاں صرف تیل کے جہاز آ کر ٹھہرتے ہیں اور یہیں سے آرامکو کے تیل کا بڑا حصہ جہازوں میں لد کر باہر کے ملکوں کو جاتا ہے۔

یوں تو ہم، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، اڑھائی بجے کے قریب خُبر پہنچ گئے، لیکن پہنچ جانے کے باوجود تین بجے تک ہمیں لانچ کے اندر ہی رہنا پڑا، کیونکہ بندرگاہ پر جن کلرک صاحب کی ڈیوٹی تھی، وہ کہیں غائب تھے۔ جب تک وہ واپس تشریف نہیں لے آئے، مسافروں کو زمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ پھر میرے ساتھ ایک لطیفہ یہ بھی پیش آیا کہ میرا پاسپورٹ چونکہ پاکستانی تھا، اس لیے مجھے حکم ملا کہ آج کی گاڑی تو جا چکی، اس لیے کل گاڑی کے وقت تک یہیں بندرگاہ پر رہو، کیوں کہ جو غیر سعودی مسافر مکہ معظمہ جانے کے لیے خُبر کے راستے سے آتے ہیں، انہیں شہر میں ٹھہرنے کی اجازت

نہیں۔ یہ تو خیریت رہی کہ میں نے چلتے وقت مولانا سے سعودی سفیر کا وہ خط لے لیا تھا جو انہوں نے حدود پر سعودی افسران کے نام دستی طور پر ہمیں دیا تھا۔ میں نے جب یہ خط ان کلرک صاحب کو دکھایا تو ان کی سختی نرمی میں تبدیل ہوگئی اور انہوں نے مجھے بندرگاہ سے شہر جانے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے مجھ سے پچاس ریال (تقریباً 70 روپے) بھی وصول فرمائے جو ہر غیر سعودی کو سعودی مملکت میں داخل ہوتے وقت ادا کرنا پڑتے ہیں۔ راؤ محمد اختر صاحب سے، جو مجھے لینے کے لیے وہاں پہنچ گئے تھے، معلوم ہوا کہ انہوں نے پچاس ریال مولانا کی طرف سے بھی ایرپورٹ پر ادا کیے ہیں۔ کسٹم پر مجھ کو کوئی دقت پیش نہ آئی، اگرچہ میرے ساتھ کچھ کتابیں تھیں اور ان میں سے بعض کتابیں، ان لوگوں کی اصطلاح کے مطابق مذہبی تھیں۔ لیکن کسٹم آفیسر صاحب نے ان کتابوں پر شک وشبہ کی نگاہ نہیں ڈالی، کیونکہ بعض کتابوں کے دیکھنے سے انہیں یہ اندازہ ہوگیا کہ میں بھی ایک سلفی العقیدہ آدمی ہوں، اس لیے انہوں نے میری سختی سے تلاشی لینے کو ضروری نہ سمجھا۔ مجھے بھی سب سے زیادہ ڈر کتابوں ہی کا تھا۔ کیونکہ کتابوں کی تلاشی کے سلسلہ میں گزشتہ سفر (56ء) میں جدہ کے ہوائی اڈہ پر ہمیں جس پریشانی کا سامنا ہوا تھا، وہ مجھے خوب یاد ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں غیر مذہبی کتابوں کی تو خوب جانچ پڑتال ہوتی ہے، لیکن مذہبی کتابوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ سعودی عرب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں دوسری کتابوں کا تو یوں سمجھئے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا جاتا، لیکن مذہب اور خصوصاً عقائد سے متعلق کتابوں کو بڑے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات جب کسٹم والے خود ان کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے تو انہیں تحقیق کے لیے علماء کے پاس بھیج دیتے ہیں، یعنی جب تک علماء انہیں ناقابلِ اعتراض قرار نہ دے دیں، انہیں ملک کے اندر داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔

راؤ محمد اختر صاحب کے ایک دوست ہارون صاحب اپنی کار لے آئے تھے۔ کسٹم سے فارغ ہونے کے بعد اس کار میں سوار ہوکر ہم راؤ صاحب کے مکان پر پہنچے۔ وہیں مولانا مقیم تھے اور ان کے پاس ملاقات کے لیے آنے والوں کی ایک جماعت موجود تھی جن میں کچھ عرب بھی تھے، لیکن اکثریت ان پاکستانی باشندوں کی تھی، جو آرامکو کی ملازمت کے

سلسلے میں وہاں مقیم ہیں۔ یہ سب لوگ ایک جگہ نہیں رہتے، بلکہ ان میں سے بعض خبر میں رہتے ہیں، بعض ظہران میں، بعض دمام میں، بعض راس تنورہ میں بعض بقیق میں اور بعض دوسرے مقامات پر۔ پاکستانیوں کی مجموعی تعداد آرامکو کے ان مراکز میں ایک ہزار کے قریب ہے، لیکن یہ تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے، کیونکہ یہاں بھی حکومت کی طرف سے کمپنی پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ ''اجانب'' (Foreigner s) کو جلد سے جلد رخصت کرے اور ان کی جگہ سعودی عرب یا دوسرے عرب ملکوں کے باشندوں کو متعین کرے۔ عرب قومیت کا یہ ... ہے کہ سعودی عرب کی نظر میں سب سے مقدم سعودی ہے، پھر دوسرے عرب اور پھر دنیا کے باشندے، جن میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہے، اس پالیسی کے تحت لوگوں کا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ 63ء تک تمام پاکستانیوں کو کمپنی کی ملازمت سے رخصت کر دیا جائے گا۔ سعودی حکومت اپنے طلبہ کو بڑے زور وشور سے انگریزی تعلیم اور فنی تعلیم دلا رہی ہے۔ اگر چہ ابھی کئی سال تک یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ سعودی باشندے اس قابل ہوسکیں گے کہ اجانب کو رخصت کر کے تمام آسامیاں خود سنبھال سکیں۔

مغرب کی نماز ہم نے محلہ کی مسجد میں پڑھی۔ مسجد نئی بنی ہوئی تھی اور سادگی کے ساتھ پختہ، کشادہ اور خوبصورت۔ معلوم ہوا کہ سعودی حکومت نے خبر، دمام، ظہران، راس تنورہ، بقیق کی تمام بستیوں اور کمپنی کے ملازمین کے تمام کوارٹروں میں ایسی مسجدیں تعمیر کروائی ہیں اور ان کے تمام مصارف بھی خود برداشت کر رہی ہے۔ مسجدوں کا ذکر آیا ہے تو قارئین کے لیے یہ بات غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ تمام عرب ممالک میں ہمارے ہاں کی طرح مسجدوں میں وضو وغیرہ کا انتظام نہیں ہوتا، تمام لوگ اپنے اپنے گھروں سے وضو کر کے مسجد آتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تمام عرب ممالک میں لوگ جوتے پہنے پہنے مسجدوں میں بے دھڑک چلے آتے ہیں اور صرف نماز پڑھنے سے پیشتر چٹائی یا دری کے قریب جوتے اتار دیتے ہیں۔ بلکہ بعض تو اس وقت بھی جوتا نہیں اتارتے اور جوتوں سمیت نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ چیز اگرچہ تمام عرب میں مشترک ہے، لیکن سعودی عرب خصوصاً نجد کے باشندے تو اس میں انتہائی غلو برتتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسجد میں جوتا پہن کر داخل ہونا جائز ہے اور بکثرت موقعوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے مسجد کے اندر جوتوں

کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ لیکن ایسا صرف ضرورت کے تحت ہی ہوا ہے۔ اگر مسجد کا فرش پختہ نہ ہو یا دھوپ سے گرم ہو رہا ہو تو جوتا پہن کر مسجد میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اور جوتوں کے ساتھ نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ لیکن پختہ فرش اور بہترین قسم کی چٹائیوں اور دریوں کی موجودگی میں بھی جوتے لیکر مسجد میں داخل ہونا اور جوتوں سمیت نماز پڑھنا خواہ مخواہ کی زیادتی اور ہٹ دھرمی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں ہر حال میں مسجدوں کے اندر جوتے پہن کر جانے اور جوتوں سمیت نماز پڑھنے کو مسجد اور نماز کے احترام کے منافی خیال کیا جاتا ہے، بلکہ اگر کوئی شخص میدان میں بھی جوتوں سمیت نماز پڑھ لے تو اس پر سخت اعتراض کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اعتدال کی راہ دونوں کے درمیان ہے۔

مسجد کے امام صاحب ایک نجدی امام تھے، جو ابھی ابھی ریاض کے کسی مدرسہ سے فارغ ہو کر آئے تھے۔ وہ نماز پڑھانے کھڑے ہوئے تو تکبیر تحریمہ سے پہلے جیب سے مسواک نکال کر منہ میں پھیرنے لگے اور پھر اسی طرح انہوں نے اسے جیب میں ڈال کر نماز شروع کی۔ نماز اتنی تیز پڑھائی کہ ہم لوگوں کے لیے ان کا ساتھ دینا بڑا مشکل تھا۔ قرآن اس طرح روکھے سوکھے بلکہ غلط طریقہ پر پڑھا کہ ہمیں نہ صرف اس کے سننے سے کوئی لطف نہیں آیا بلکہ سخت کوفت ہوئی۔ مولانا کے بقول ہمارے دیہات کے مُلا بھی ان سے اچھا قرآن پڑھتے اور سکون سے نماز پڑھاتے ہیں۔ ہمارے پاکستانی احباب نے بتایا کہ یہ امام صاحب تو پھر بھی قرآن مجید غنیمت پڑھتے ہیں، ورنہ یہاں کی دوسری مسجدوں کا حال تو اس سے بھی بُرا ہے۔ ایک طرف تو مصریوں، شامیوں اور عراقیوں کی یہ "ترقی" ہے کہ وہ قرآن مجید کو بھی قوالیوں کی طرح گا کر پڑھتے ہیں اور دوسری طرف نجدی حضرات کی یہ "خشکی" کہ ان کے بڑے بڑے علماء تک گویا قرآن مجید کو صحیح مخارج اور عمدہ آواز کے ساتھ پڑھنا بدعت سمجھتے ہیں۔ پھر نجدی حضرات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو کبھی سکون سے کھڑے نہیں ہوتے، کبھی اپنے کپڑے ٹھیک کرنے لگ جاتے ہیں اور کبھی انہیں یاد آتا ہے کہ ان کے کُرتے کے بٹن بند نہیں ہیں یا ان کے سر کا رومال ٹیڑھا ہو گیا ہے اور وہ اسے ٹھیک کرنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو نماز کے دوران گھڑی پر وقت دیکھنے میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ یہ سب باتیں اگرچہ ہمارے لیے

نئی نہیں تھیں اور پہلے بھی ہمیں ان کا تجربہ تھا،لیکن اس سفر میں چونکہ پہلی مرتبہ بار بار ان کا مشاہدہ ہورہا تھا، اس لیے ہمیں سخت کوفت ہورہی تھی۔ مولانا تو رات گئے تک بار بار ان کا ذکر کرتے رہے۔

راس تنورہ

اگلے دن 11 نومبر کو شاہِ سعود کی تخت نشینی کی سالگرہ تھی اور اسی لیے کمپنی کے تمام ملازمین کو تین دن کی چھٹی تھی۔ یہ لوگ خوش تھے کہ چھٹیاں ایسے موقع پر آئی ہیں جبکہ مولانا بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ان لوگوں نے ہماری دعوتوں یا یوں کہیئے کہ دورے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنایا، جس کے تحت ہم اس روز صبح نو بجے راس تنورہ گئے، جو خبر سے شمال مشرق کی طرف تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر سعودی عرب کا ایک بندرگاہ ہے اور یہاں سے آرامکو کے تیل کا بڑا حصہ جہازوں میں لد کر بیرونی ممالک کو جاتا ہے اور یہاں کمپنی کی سب سے بڑی ریفائنری بھی ہے۔ خُبر سے راس تنورہ تک ساری سڑک نہایت عمدہ بنی ہوئی ہے کیونکہ کمپنی بہادر کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں موٹے موٹے پائپ لائن بھی نظر آئے جن کے ذریعے ظہران اور دوسری جگہوں سے پٹرول راس تنورہ کی ریفائنری میں پہنچتا ہے۔ راستے میں ایک گاؤں آیا، جس کے متعلق ہمارے ساتھیوں نے بتایا کہ اس میں حضرت یسع علیہ السلام کی قبر بتائی جاتی ہے، لیکن ہمیں حضرت یسع علیہ السلام کی قبر کے یہاں ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، کیونکہ حضرت یسع علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور فلسطین ہی کے علاقہ میں بود وباش رکھتے تھے۔

راس تنورہ پہنچے، تو پاکستان اور ہندوستان کے ملازمین کمپنی کے کوارٹروں میں ایک جگہ ڈیڑھ دو سو کے قریب پڑھے لکھے نوجوان جمع تھے اور مولانا کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ سلام اور تعارف کے بعد ان کے اور مولانا کے درمیان سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا جو ساڑھے دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک جاری رہا۔ تمام سوالات نہایت سنجیدہ اور علمی انداز کے تھے۔ مولانا بھی موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ ہر سوال کا جواب نہایت اطمینان اور تفصیل کے ساتھ دے رہے تھے۔ زیادہ تر سوالات سود، آسٹریلیا سے درآمد شدہ ڈبوں

کے گوشت، زکوٰۃ، ضبطِ ولادت اور کرنسی کے متعلق تھے۔ یوں تو ان کے سارے ہی سوالات حقیقی ضروریات اور مشکلات کے تحت تھے، لیکن جس مسئلہ نے ان کو سب سے زیادہ پریشان کر رکھا تھا، وہ تھا گوشت کا مسئلہ، کمپنی کے عرب ملازمین آسٹریلیا وغیرہ سے برآمد شدہ ڈبوں کا گوشت بے تکان کھاتے ہیں اور اس میں کسی طرح کی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ غضب یہ ہے کہ کمپنی کی کنٹین میں سؤر کے گوشت کے جو ڈبے فروخت ہوتے ہیں وہ دوسرے گوشت کے ڈبوں کے ساتھ ملا کر رکھے ہوتے ہیں، اور ان پر صرف انگریزی میں (Pork) لکھا ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو خیر جانتے بوجھتے یہ ڈبے خریدتے ہیں، لیکن اکثر یا تو انگریزی نہیں جانتے یا جانتے ہیں مگر (Pork) کا مطلب نہیں سمجھتے۔ اس لیے وہ غلطی سے یہ ڈبے خرید کر کھا لیتے ہیں۔ آسٹریلیا سے برآمد شدہ یہ گوشت چونکہ مقامی گوشت کے مقابلے میں بہت سستا ہوتا ہے اور صاف ستھرا بھی، اس لیے اس کی خوب فروخت ہوتی ہے۔ مولانا نے ان لوگوں کو اصل مسئلہ سمجھایا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر موقع ملا تو ریاض کے علماء کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں گے۔

ڈیڑھ بجے وہیں کوارٹروں کی مسجد میں ہم نے ظہر کی نماز پڑھی۔ اس مسجد کے امام صاحب۔ ایک پاکستانی پٹھان تھے جنہیں ان لوگوں نے خاص طور پر اپنی مسجد کی امامت کے لیے پاکستان سے بلوایا تھا۔

سوا تین بجے سے سوا چار بجے تک پھر سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دفعہ سوالات سنت، معیارِ حق، شیطان کی حقیقت وغیرہ موضوعات سے متعلق تھے۔ عصر کے بعد چائے پی گئی اور پھر ہم لوگ وہ جگہ دیکھنے گئے جہاں جہازوں پر تیل لادا جاتا ہے۔ سمندر میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ ان میں سے بعض جاپانی تھے، بعض امریکن اور بعض دوسرے ملکوں کے۔ بعض میں پائپ کے ذریعے تیل ڈالا جا رہا تھا اور بعض دور کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ قریب ہی ریفائنری تھی جس کے اندر تو اگرچہ ہم نہیں جا سکے، لیکن وہ باہر سے اچھی نظر آ رہی تھی۔ ہمارے ساتھی ہمیں اس کے متعلق دور ہی سے اشارہ کر کے بہت کچھ سمجھاتے رہے۔ بہت سی جگہوں پر زمین کو آگ لگی ہوئی تھی۔ ہمارے ساتھیوں نے بتایا کہ وہ گیس ہے جو پٹرول کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب پٹرول کو صاف کیا

جاتا ہے تو اس گیس کو فالتو اور بیکار سمجھ کر جلا دیا جاتا ہے۔ اب بعض جگہوں پر کمپنی نے یہ طریقہ بھی اختیار کیا ہے کہ انجکشن کے ذریعے اس گیس کو زمین کے اندر پھر سے داخل کر دیا جائے تا کہ اس سے ایک تو تیل کا دباؤ برقرار رہے اور دوسرے یہ گیس اس وقت کے لیے محفوظ رہے جب تیل ختم ہو جائے گا۔ یہ تقریباً اسی طرح کی گیس ہے جو ہمارے ہاں پاکستان میں دریافت ہوئی ہے اور اسے سوئی گیس کہا جاتا ہے۔ مولانا نے بتایا کہ 56ء میں حج سے واپسی پر جب ان کا ہوائی جہاز رات کے وقت ظہران کے قریب پہنچا، تو انہیں جگہ جگہ پر گیس جلتی نظر آ رہی تھی۔

مغرب کی نماز ہم نے وہیں ایک مسجد میں پڑھی اور پھر ظہران کے راستے خبر واپس آئے۔ ظہران خُبَر سے تین چار میل کے فاصلہ پر عربک امریکن آئل کمپنی (آرامکو) کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں کوئی شہر نہیں ہے اور نہ کوئی بازار۔ صرف کمپنی کا مرکزی دفتر ہے یا ملازمین کے رہائشی کوارٹر۔ ملازمین اپنی ضرورت کی تمام چیزیں یا تو خُبَر سے خریدتے ہیں یا دمام سے۔ رات کے وقت ظہران بڑا پُرشکوہ نظر آ رہا تھا۔ نہایت اعلیٰ سڑکیں اور عمارتیں اور ان پر اس قدر روشنی کا انتظام کہ دیکھنے والے کو مشکل ہی سے یہ یقین آئے کہ پٹرول نکلنے سے پہلے یہاں چٹیل میدان اور ریت کے اونچے اونچے تودوں کے سوا کوئی چیز نہ پائی جاتی تھی۔ اب تو اگر ظہران کو نیویارک کا ایک ٹکڑا بھی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا۔

راؤ صاحب کے گھر پہنچے تو چودھری غلام محمد صاحب کو ایک کمرے میں لیٹے ہوئے پایا۔ مولانا نے مزاحاً دریافت فرمایا کہ یہ کون چور ہے جو مالک مکان کی اجازت کے بغیر اندر گھس آیا ہے؟ چودھری صاحب نے بتایا کہ جب دوپہر کے وقت میں یہاں پہنچا، تو دیکھا کہ مکان کھلا پڑا ہے۔ اور اس میں کوئی شخص نہیں ہے۔ میں اطمینان سے اندر گھس آیا اور ایک کمرے میں آ کر سو رہا۔ اس وقت چودھری صاحب کے سر میں سخت درد تھا اور وہ نزلہ میں مبتلا تھے۔ بیچارے گزشتہ شام کویت سے چلے تھے اور رات انہیں کویت اور سعودی عرب کی سرحد پر ایک کھلی جگہ زمین پر بستر لگا کر بسر کرنا پڑی تھی۔ بہر حال ہم نے چودھری صاحب کے پہنچ جانے اور ہم سے آ ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، ورنہ اب تک ہمیں ان کی بڑی فکر تھی۔ چودھری صاحب آتے وقت اپنے ساتھ رولیفلکس کا ایک کیمرہ بھی لے آئے

تھے اور کویت کے قیام کے دوران میں انہوں نے اس کی اچھی خاصی مشق بھی بہم پہنچا لی تھی۔ اب ہمیں اطمینان تھا کہ آئندہ جن مقامات کی ہم سیاحت کریں گے، ان کی فوٹو بھی لے سکیں گے۔

ہم نے راؤ صاحب سے مکان کو کھلا چھوڑنے کی وجہ دریافت کی، تو انہوں نے بتایا کہ ہم تو بسا اوقات اسی طرح مکان کھلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، پھر سارا سارا دن باہر رہتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو اپنی ہر چیز محفوظ پاتے ہیں۔ اسماعیل خاں صاحب نے بتایا کہ میں جب آپ لوگوں کو لینے کے لیے بحرین گیا تھا، تو اپنے مکان کو کوئی تالا لگا کر نہیں گیا تھا اور جب تین دن کے بعد واپس آیا، تو میری ہر چیز محفوظ تھی۔ سعودی عرب میں امن وامان کے بہت سے واقعات تو ہم نے پہلے بھی سنے تھے اور گزشتہ سفر میں خود بھی اس کیفیت کا مشاہدہ کیا تھا، لیکن یہ دو واقعات تو ہمارے لیے حد درجہ حیرت انگیز تھے۔ سوچیے آخر یہ کس چیز کی برکت ہے؟ ہمارے ہاں بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اگر یہاں شرعی نظام قایم ہو گیا تو لوگوں کے ہاتھ کٹنا شروع ہو جائیں گے۔ جی ہاں، چند ہاتھ کٹیں گے، لیکن سارا ملک چین پائے گا۔

بُقَیق

اگلے دن 12 نومبر کو ہم لوگ اپنے پروگرام کے مطابق بقیق گئے، جو خُبَر سے مغرب کی طرف تقریباً 40 میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور یہاں آرامکو کو سعودی عرب میں تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ ملا ہے۔ یہاں بھی پاکستان کے بہت سے ملازمین رہتے ہیں۔ 10 بجے سے ساڑھے تین بجے دوپہر تک یہاں بھی سوالات وجوابات کا سلسلہ جاری رہا۔ حاضرین میں سب ہی طرح کے لوگ تھے۔ ایسے بھی تھے جو مولانا کی کتابیں پڑھے ہوئے اور ان سے متاثر تھے۔ ایسے بھی تھے جو پرویز صاحب کے لٹریچر سے متاثر تھے اور چند تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے بھی تھے۔ آج کے سوالات پاکستان کے موجودہ حالات میں اسلام کے لیے کام کرنے کے طریقوں، بنیادی جمہوریتوں، تبلیغی جماعت سے مل کر کام کرنے یا نہ کرنے اور اہل کتاب کا ذبیحہ جائز یا ناجائز ہونے سے متعلق تھے۔

پہلے سوال کا جواب مولانا نے یہ دیا کہ پاکستان میں اس وقت جو حالات پائے جاتے ہیں ان میں اگر جماعتیں کام نہ بھی کر سکیں تو افراد تو باقی ہیں۔ اور اللہ کے دین سے ان کا تعلق بھی باقی ہے، اور اگر انہوں نے اپنے خدا سے اس کے دین کی خدمت کا کوئی عہد و پیمان کیا تھا تو وہ بھی ختم نہیں ہو گیا۔ اس لیے ہر ایسے فرد کو اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی صوابدید کے مطابق دین کی وہ خدمت کرنی چاہیے جو وہ کر سکتا ہو۔ اس میں نہ کوئی چیز مانع ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

تبلیغی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنے کے متعلق فرمایا کہ ہم لوگ اپنی صوابدید کے مطابق دین کا کام کر رہے ہیں اور تبلیغی جماعت والے اپنی صوابدید کے مطابق۔ ہمارے اور ان کے طریقِ کار میں چونکہ اختلاف ہے، اس لیے مل کر کام کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن طریقِ کار میں اختلاف ہونے سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ ہمارے اور ان کے درمیان تصادم یا مخالفت ہو، ہم خواہ مخواہ ایک دوسرے کی مزاحمت کریں اور ایک دوسرے کے کام میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کریں۔ اس کے بجائے اگر ہم اور وہ ایک ہی خدا کے دین کی اخلاص کے ساتھ خدمت کر رہے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے کا خیر خواہ ہونا چاہیے اور جس حد تک ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ یا ایک دوسرے سے مدد لے سکتے ہیں اس میں ہم کو دریغ نہ کرنا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں رکھیں اور انہیں لوگوں میں پھیلاتے پھریں۔ آخر میں مولانا نے حاضرین سے یہ بھی فرمایا کہ آپ لوگ سب کچھ پڑھیے اور ہر ایک کے کام کو دیکھ کر خود فیصلہ کیجئے کہ آپ کا دل کس طریقِ کار سے زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ پھر جسے بھی آپ پسند کریں اس کو اختیار کر کے کام کیجئے۔

اہل کتاب کے ذبیحہ کے متعلق مولانا نے مختصر طور پر اپنی وہی رائے ظاہر فرمائی جو اپریل 1959ء کے ترجمان القرآن میں مفصل طور پر شایع ہو چکی ہے۔

ساڑھے بارہ بجے سے 3 بجے تک نماز، کھانے اور آرام کا وقفہ رہا۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ تک پھر سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ عصر کی نماز کے بعد ہم لوگ بقیق کے قاضی صاحب کے ہاں گئے۔ دراصل صبح ہی جب ہم بقیق پہنچے تھے، تو قاضی صاحب نے پیغام

بھیجا تھا اور مولانا کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ مولانا نے ان سے عصر کے بعد آنے کا وعدہ کیا۔ ہم گئے تو ہمارے ساتھ پچیس آدمی اور بھی ہو لیے جس سے قاضی صاحب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے قہوہ، پھر چائے اور پھر دوبارہ قہوہ سے ہماری تواضع فرمائی۔ قاضی صاحب یہاں بتحقیق میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے شعبہ کے انچارج بھی ہیں، اس لیے انہوں نے مولانا کا شکریہ ادا فرمایا کہ ان کے آنے پر یہ پاکستانی نوجوان دین کی باتیں سننے کے لیے جمع ہوئے۔

مغرب کے بعد ہم اپنی قیام گاہ پر واپس آئے اور عشاء کے بعد ایک عرب نوجوان، جن کا نام یعقوب ہے اور جو خبر کے مقامی باشندے ہیں، کے ہاں کھانے پر گئے۔ یعقوب ہیں تو نوجوان، لیکن گہرا دینی جذبہ رکھتے ہیں اور اس زمانہ میں دین کے تقاضوں اور اس کے لیے کام کرنے کی ضرورت سے خوب واقف ہیں۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ بیروت کے قیام کے زمانہ میں وہ حسن بنّا شہیدؒ اور مولانا مودودی کی کتابوں سے متاثر ہوئے، اس لیے نہ صرف یہ کہ امریکن یونیورسٹی کا ماحول انہیں بگاڑ نہ سکا، بلکہ اس زمانہ میں انہوں نے بہت سے دوسرے نوجوانوں کو بھی اس ماحول کا اثر قبول کرنے سے بچا لیا۔ جب ہم ان کے ہاں پہنچے تو وہاں ان ہی کی طرح کے آٹھ دس نوجوان موجود تھے۔ جن میں بعض مقامی تھے اور بعض شام، فلسطین اور مصر کے رہنے والے۔ وہیں ہماری ملاقات استاذ عبدالحکیم عابدین سے بھی ہوئی، جو اتفاق سے دو روز پیشتر ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں جدہ سے خبر آئے تھے۔ ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور ان کی زبانی مصر و شام کے بہت سے حالات معلوم ہوئے۔ استاذ عبدالحکیم عابدین، حسن بنّا شہید کے بہنوئی اور اخوان المسلمون (مصر) کے جنرل سیکرٹری تھے۔ یہ اخوان کے ان چار آدمیوں میں سے ایک ہیں، جنہیں 53ء میں مصری حکومت نے مصری قومیت سے محروم کیا تھا (اور قومیت سے محروم بھی صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ پہلے ہی ملک سے باہر تھے، ورنہ اگر وہ اندر ہوتے تو ان کا انجام بھی وہی ہوتا جو عبدالقادر عودہ شہید اور ان کے دوسرے ساتھیوں کا ہوا)۔ اب انہوں نے سعودی شہریت اختیار کر لی ہے۔ ان کے بچے جدہ میں رہتے ہیں اور وہ خود جدہ اور بیروت میں وکالت کرتے ہیں۔

کھانا کھایا اور اس کے بعد کافی دیر تک ان لوگوں سے گفتگو ہوتی رہی، جس سے ہمیں بھی اور انہیں بھی ایک دوسرے کے حالات سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

ظہران

13 نومبر کو ہم اپنے پروگرام کے مطابق ظہران گئے اور وہاں بھی 11 بجے سے سوا بارہ بجے تک سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ اس دن جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے کوارٹروں ہی کی مسجد میں پڑھی۔ خطیب و امام ایک نجدی عالم تھے۔ خطبہ تو انہوں نے غنیمت دیا لیکن نماز میں قرآن مجید کی قرائت صحیح نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نجد میں قرآن مجید کی صحیح قرائت سکھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور یہ اعتماد کر لیا گیا ہے کہ جب یہ لوگ عرب ہیں تو قرآن آپ سے آپ صحیح پڑھیں گے۔

جمعہ کے بعد کھانے اور آرام کرنے کا وقفہ رہا اور سوا چار بجے سے پونے چھ بجے تک پھر سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ اس دن کی یہ ساری گفتگو ٹیپ ریکارڈ کی گئی۔

کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں جو پاکستانی حضرات یہاں مقیم ہیں، ان میں اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہے جنہیں کمانے اور کھانے کے سوا کوئی دوسری فکر نہیں ہے۔ تہائی حصہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دینی حس رکھتے ہیں اور فکری لحاظ سے کسی نہ کسی مکتبِ فکر سے وابستہ ہیں یا اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ایک صاحب قادیانی بھی ہیں۔ مگر وہ اپنے آپ کو قادیانی ظاہر نہیں کرتے اور نہ ان کی یہاں کوئی سرگرمیاں ہیں۔ ایک صاحب احراری بھی ہیں، مگر عملاً وہ بھی خاموش ہیں۔ بارہ کے قریب تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ لوگ یہاں بھی مختلف بستیوں میں تبلیغی دوروں کے لیے نکلتے، لوگوں کو نماز کی تلقین کرتے اور ان کا کلمہ صحیح کراتے رہتے ہیں۔

چند لوگ ایسے بھی ہیں جو پرویز صاحب سے متاثر ہیں اور یہاں اچھی خاصی سرگرمی سے ان کے خیالات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ مولانا سے بڑی عقیدت سے ملتے رہے لیکن طرح طرح کے الٹے سیدھے سوالات کر کے انہیں الجھانے کی کوشش بھی کرتے رہے۔

13 نومبر کو انہوں نے مولانا کو اپنے ہاں آنے اور چند سوالات (جو انہوں نے پہلے سے لکھ کر

دیئے تھے) کا جواب دینے کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ سوالات بڑے سوچ و بچار کے بعد مرتب کیے تھے اور عام لوگوں میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ آج دیکھنا ہے کہ مودودی صاحب کتنے پانی میں ہیں۔ ہم عشاء کے بعد ان کے ہاں گئے۔ وہاں دو ڈھائی سو آدمی جمع تھے اور لاؤڈ سپیکر اور تمام سوالات و جوابات کو ٹیپ ریکارڈ کرنے کا انتظام تھا۔ مولانا نے ان تمام سوالات کا اور ان کے بعد جو بہت سے دوسرے سوالات کیے گئے، ان کا بھی بڑی تفصیل سے جواب دیا۔ جس کا تمام حاضرین پر بہت ہی اچھا اثر ہوا۔ اگرچہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا کے جوابات سے خود ان حضرات کی بھی اصلاح ہو گئی، لیکن یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ جو لوگ ابھی دام پرویزی میں نہیں پھنسے تھے وہ آئندہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔

دمام

اگلے دن 14 نومبر کو ہم لوگ عصر تک اپنی قیام گاہ ہی پر رہے اور مولانا آئندہ سفر کی تیاری کے سلسلے میں بعض کتابوں کا مطالعہ فرماتے رہے۔ مغرب کے قریب ہم چودھری محمد اکبر صاحب (سیالکوٹ) کے صاحبزادے انور پاشا صاحب کے ہاں دمام گئے۔ جو کاروبار کے سلسلے میں ان دنوں وہاں مقیم ہیں۔ انہوں نے مغرب کے بعد ہمیں اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا۔ اس بہانے سے ہمیں دمام دیکھنے کا بھی موقع مل گیا۔

دمام سعودی عرب کے منطقہ شرقیہ (جس میں خُبَر، راس تنورہ، دمام، بقیق اور قطیف وغیرہ کے اضلاع شامل ہیں) کا صدر مقام ہے۔ اور یہیں اس منطقہ کا گورنر رہتا ہے۔ پہلے اس منطقہ کا صدر مقام ہفوف تھا، لیکن جب سے تیل دریافت ہوا ہے اور آرامکو نے ظہران میں اپنا ہیڈ کوارٹر قایم کیا ہے، دمام کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں دمام، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، سعودی عرب کے مشرقی ساحل کا سب سے بڑا بندرگاہ اور تھوک مال کی منڈی بھی ہے اور یہاں سے ظہران، بقیق اور ہفوف وغیرہ کے راستے ریل اور سڑک دونوں ریاض تک جاتی ہیں۔

انور پاشا صاحب کے ہاں بہت سے لوگ جمع تھے، جو سب کے سب سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ سیالکوٹی لوگوں کی خُبَر، ظہران، راس تنورہ، بقیق اور ریاض وغیرہ ہر مقام پر

اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ ہم جہاں بھی گئے ہمیں سیالکوٹ کا کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ملا، یہاں تک کہ ان کے متعلق کمپنی کے ملازمین میں ایک لطیفہ یہ مشہور ہے کہ چند لوگ راکٹ کے ذریعے چاند پر پہنچے، تو انہیں وہاں چند آدمی ٹہلتے ہوئے ملے۔ انھوں نے ان سے دریافت کیا کہ تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے جواب دیا، کہ ہم سیالکوٹ کے۔ غالباً سیالکوٹ کے لوگ جو اس کثرت سے ملک سے باہر نکلے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد اس شہر کی بہت سی صنعتیں تباہ ہو گئیں اور معاشی طور پر یہ لوگ پریشان ہیں۔

عشاء کے بعد ہم دمام ہی کے ایک مقامی باشندے شیخ جاسم کے ہاں گئے، جو ایک روز پہلے مولانا کے پاس آئے تھے اور ان سے اپنے ہاں آنے کا وعدہ لے گئے تھے۔ وہاں پہنچے تو چند عرب نوجوان ایک کمرے میں جمع تھے اور انہوں نے مولانا سے اس زمانے میں دعوتِ اسلامی کے لیے کام کرنے کے متعلق ہدایات طلب کیں۔ یہ سلسلہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک جاری رہا اور اس کے بعد ہم خُبَر واپس آ گئے۔

گورنر سے ملاقات اور شاہی مہمانی

ان چار دنوں (11 تا 14 نومبر) میں ہم اس قدر مصروف رہے کہ ہمیں اپنے آئندہ سفر کے لیے تیاری کرنے کی بالکل فرصت نہ مل سکی۔ 15 نومبر کو مولانا نے کسی ملاقات کے لیے باہر جانے سے صاف انکار کر دیا اور آئندہ سفر کے سلسلے میں تیاری شروع کی۔ راؤ اختر صاحب کو دو کاموں کے لیے روانہ کیا۔ ایک تو کراچی سے روانہ ہوتے وقت سعودی سفیر نے ہمیں جو خطوط دیے تھے، ان میں سے ایک میں ہمیں تمام رسوم (ٹیکسوں) سے معاف کیا گیا تھا اس خط کا مجھے اور راؤ صاحب کو علم نہ تھا، اس لیے ہم نے ہوائی اڈہ اور بندرگاہ پر سعودی عرب میں داخلہ کے پچاس پچاس ریال ادا کر دیے تھے۔ مولانا نے راؤ صاحب کو یہ خط دیا کہ وہ ہوائی اڈہ اور بندرگاہ جا کر سو ریال واپس لے آئیں۔ اسی طرح دمام میں چودھری غلام محمد صاحب کا پاسپورٹ بھی روک لیا گیا تھا، اسے بھی واپس لینا تھا۔ دوسرے مشورہ ہوا کہ خُبَر سے ریاض روانہ ہونے سے پہلے منطقہ شرقیہ کے گورنر امیر سعود بن جلوی (جو شاہ سعود کے ماموں بھی ہیں) کے ہاں ایک کرٹسی کال (زیارۃ

المجاملہ) ضرور کر لینی چاہیے۔اس لیے راؤ اختر صاحب کو دارالامارۃ (قصر الامیر) بھی بھیجا گیا کہ ملاقات کے لیے وقت مقرر کرآئیں۔لیکن جب راؤ صاحب وہاں پہنچے تو امیر کے بڑے صاحبزادے امیر عبدالعزیز نے ان سے کہا کہ ہمیں ابھی تک مولانا کے خُبَر پہنچنے کی اطلاع نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ ائیر پورٹ ہوٹل میں ٹھہراتے، کیونکہ وہ شاہی مہمان ہیں اور انہیں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچانے کی ہمیں وزیراعظم کی طرف سے ہدایات موصول ہو چکی ہیں۔ امیر عبدالعزیز نے راؤ صاحب سے یہ گلہ بھی کیا کہ آپ نے اب تک مولانا کو اپنے ہاں کیوں ٹھہرائے رکھا؟ الغرض بارہ بجے کے قریب راؤ اختر صاحب کے ساتھ امیر کا ایک آدمی آیا اور اس نے امیر کی طرف سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مولانا سے اصرار کیا کہ جلد از جلد ایر پورٹ ہوٹل میں منتقل ہو جائیں۔ ہم نے سامان باندھنے کے لیے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی مہلت طلب کی اور پھر دو بجے کے قریب ہوٹل پہنچ گئے۔ ایر پورٹ کا یہ ہوٹل نہایت شاندار اور بالکل نئے طرز کا بنا ہوا ہے اور اس میں زیادہ تر حکومت ہی کے مہمان ٹھہرتے ہیں۔ غالباً ظہران، خُبَر اور دمام میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا ہوٹل ہے بھی نہیں۔

شام کو ساڑھے چار بجے ہم لوگ امیر سعود بن جلوی سے ملاقات کے لیے دارالامارۃ گئے۔ ایک نہایت شاندار کمرے میں امیر سعود کی نشست تھی اور پورا شاہی دربار کا سماں تھا۔ان کی صحت ان دنوں خراب تھی، اس لیے مولانا سے مصافحہ اور سلام کے بعد خود گفتگو نہ کر سکے۔ درمیان میں سیکرٹری تھا اور اس کے ذریعے گفتگو ہوتی رہی۔ مولانا نے انہیں اپنی چار کتابیں (مبادی الاسلام، الحجاب، الربا اور نظریۃ الاسلام الخلقیہ) پیش کیں اور کراچی سے لایا ہوا سوہن حلوہ کا ایک ڈبہ بھی دیا۔مغرب کے بعد انہوں نے ہم لوگوں کو کھانے پر بلایا۔مغرب کے بعد ہم دارالامارۃ پہنچے۔تو امیر خود تو موجود نہ تھے، انہوں نے کھانے میں شرکت سے اپنی خرابی صحت کی بنا پر معذرت کر دی تھی۔ان کے بڑے صاحبزادے امیر عبدالعزیز ان کی نیابت کے لیے موجود تھے اور ان ہی نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔کھانے پر ہمارے علاوہ بہت سے شیوخ موجود تھے۔ وزیراعظم قطر کا بڑا لڑکا اور ایک امریکن بھی شریک تھے۔کھانا بالکل مغربی طرز کا تھا اور مغربی طرز ہی پر چھری

اور کانٹے سے کھایا گیا۔

شاہ سعود اور دوسرے امراء کی جو دعوتیں صرف عربوں کے لیے ہوتی ہیں، وہ غالباً اب بھی عربی طرز پر ہوتی ہیں۔ اس دعوت پر میرے اور راؤ اختر صاحب کے ساتھ ایک عجیب لطیفہ پیش آیا، جو شاید دوسروں کے لیے تو لطیفہ ہو، لیکن ہمارے لیے ندامت کا باعث ہے۔ اور وہ یہ کہ سروس کرنے والے خادم باری باری تمام مہمانوں کے سامنے کھانے کی ڈش پیش کر رہے تھے۔ دوسری مرتبہ وہ مرغی کے گوشت کی ڈش لائے۔ مولانا سمجھ گئے اور انہوں نے یہ گوشت نہ اٹھایا، لیکن میں اور راؤ صاحب سمجھ نہ سکے اور ہم نے وہ گوشت لے کر کھا لیا۔ سروس کرنے والے خادم ہندوستانی تھے۔ انہوں نے ہمیں بعد میں بتایا کہ یہ ''ڈبہ''[1] کی مرغی تھی۔ ہمیں سخت افسوس ہوا۔ یاد نہیں کہ چودھری صاحب بھی محفوظ رہے یا وہ بھی ملوث ہو گئے۔

یہاں دمّام میں گجرات، پاکستان کے ایک ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں، جن کا نام عبدالمجید حسن ہے اور وہ سولہ سال سے یہیں مقیم ہیں۔ امیر سعود بن جلوی کے ذاتی ڈاکٹر ہیں اور آرامکو میں بھی آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں۔ اپنی پرائیویٹ پریکٹس الگ کرتے ہیں۔ انہوں نے مولانا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی، کیونکہ اسلام کے متعلق ان کے ذہن میں چند اشکالات تھے اور وہ ان کا حل چاہتے تھے۔ چودھری صاحب کو بھی ان سے اپنے لیے دوا لینا تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ان کے ہاں گئے۔ علیک سلیک اور رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے مولانا سے چائے پینے کی درخواست کی۔ چائے کے لیے ہم ان کے مکان کی سب سے اوپر کی منزل میں گئے، جہاں ان کی اپنے بال بچوں کے ساتھ رہائش ہے۔ اس وقت ان کے بچے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ ٹیلی ویژن پر اس وقت ظہران ایئر پورٹ کا پروگرام جاری تھا اور فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا۔ جب تک چائے تیار نہیں ہوئی، ہم بھی ٹیلی ویژن پر یہ میچ دیکھتے رہے۔ یہ میرے لیے ٹیلی ویژن دیکھنے کا پہلا موقع تھا۔ شکر ہے اس وقت صرف فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا، کوئی دوسرا پروگرام نہ تھا۔

1- واضح رہے کہ اب سعودی عرب میں ان ڈبوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ (م۔ع۔ جون 63ء)

ظہران میں ٹیلی ویژن کے دو مرکز ہیں۔ ایک آرامکو کے ہیڈکوارٹر میں اور دوسرا ایرپورٹ پر۔ ایرپورٹ کے پروگرام صرف انگریزی میں ہوتے ہیں اور آرامکو کے انگریزی اور عربی دونوں میں۔ یہ پروگرام صرف علمی اور معلوماتی ہی نہیں ہوتے، بلکہ ان میں ہر طرح کے پروگرام شامل ہوتے ہیں۔ عرب نوجوانوں پر جن کے پاس پیسہ بھی وافر ہے اور وقت بھی فالتو ہے اور ان پر اخلاقی لحاظ سے بھی کوئی پابندی نہیں ہے ان پروگراموں کا جو اثر ہوتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر والے سینما پر تو پابندی لگا سکتے ہیں۔ لیکن ٹیلی ویژن سے عرب نوجوانوں میں جو مغربی تہذیب کی تقلید کے بُرے اثرات پھیلتے ہیں، ان کی روک تھام کیسے ہو سکتی ہے؟

چائے کے بعد ہم لوگ ہوٹل آئے اور وہیں مولانا کے دیئے ہوئے وقت کے مطابق 9 بجے ڈاکٹر عبدالمجید حسن صاحب پہنچ گئے۔ انہوں نے مولانا سے دعا کے فلسفے کے متعلق سوالات کیے اور مولانا نے ان کے سوالات کا تفصیل سے جواب دیا۔ ایک بجے رات تک بہت سے پاکستانی نوجوان مولانا کے پاس بیٹھے رہے اور مختلف علمی اور دعوتی موضوعات پر سوالات کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ہم لوگ سو سکے۔

خُبر کے بازار

16 نومبر کو ہمارا پروگرام ایک تو بازار سے ضرورت کی چیزیں خریدنے کا تھا اور دوسرے آرامکو کی لائبریری دیکھنے کا۔ لائبریری پیشگی اجازت کے بغیر نہیں دیکھی جا سکتی، اس لیے راؤ اختر صاحب کو امیر کے سیکرٹری کے پاس بھیجا گیا تاکہ وہ ہمارے لیے لائبریری دیکھنے کا انتظام کرا دیں۔ راؤ صاحب واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ دس بجے امیر کا ایک آدمی آئے گا اور ہمیں لائبریری لے جائے گا۔ نو بجے ہم خُبر گئے اور وہاں دیر تک بازار میں اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے رہے۔ ساڑھے دس بجے مولانا راؤ اختر صاحب کے ساتھ لائبریری چلے گئے اور میں اور چودھری صاحب ساڑھے بارہ بجے تک بازار ہی میں رہے۔ خُبر کے بازاروں میں گھومنے سے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہاں چیزیں بہت گراں ہیں، یعنی بحرین سے کم از کم دگنی۔ دکانداروں کی بکری خوب ہوتی ہے، کیونکہ

کمپنی کے جو بھی امریکن، عرب یا دوسرے ملازمین ہیں۔ وہ سب یہیں سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے ہیں اور پیسہ وافر ہونے کی وجہ سے گرانی کی کم ہی پروا کرتے ہیں۔ خُبَر کے بازاروں میں ہمیں بہت ہی کم بے پردہ عورتیں گھومتی نظر آئیں۔ بے پردہ عورتیں یا تو امریکن تھیں یا کچھ شامی، فلسطینی، مصری اور لبنانی۔ یہ سب امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے ڈنڈے کا اثر ہے کہ کوئی مقامی عورت پردہ کے بغیر بازار میں نہیں نکل سکتی۔ امریکنوں پر تو خیر کوئی پابندی لگائی نہیں جا سکتی، البتہ پہلے شامی، فلسطینی، مصری اور لبنانی عورتوں پر بھی پردہ کی پابندی تھی۔ لیکن اب معلوم نہیں کیوں انہیں ڈھیل دے دی گئی ہے۔ (حال میں اخبارات سے معلوم ہوا کہ اب بے پردہ عورتوں کا نکلنا ممنوع ہو گیا ہے۔)

آرامکو کی لائبریری

ظہر کے بعد ہم بھی مولانا کے ساتھ آرامکو کی لائبریری پہنچ گئے آرامکو کی یہ ریسرچ لائبریری بہت ہی شاندار ہے۔ عرب اور مسلمان ملکوں کے متعلق جس زبان میں بھی جو کتاب لکھی ہے وہ یہاں موجود ہے۔ خصوصاً جزیرۂ عرب کے متعلق تو امریکنوں نے اتنی تحقیقات کی ہیں اور اس کے ایسے ایسے تفصیلی نقشے تیار کیے ہیں کہ ان کی مدد سے انہیں جزیرۂ عرب کے متعلق جو معلومات حاصل ہیں وہ یقیناً خود عربوں کو بھی حاصل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں ادب، تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے اسلامی موضوعات کی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی اس لائبریری میں موجود ہے۔ مولانا دو گھنٹے تک لائبریری کی فہرست دیکھ کر اپنے مقصد کی کتابوں کے نام نوٹ کرتے رہے اور اس کے بعد ہم لوگ واپس ہوٹل آ گئے۔

آرامکو کا مرکزی دفتر

آرامکو کی یہ لائبریری جس عمارت میں واقع ہے، وہ آرامکو کا مرکزی دفتر ہے اور کئی منزلہ ہے۔ اس کی تعمیر فولاد سے ایسے طرز پر کی گئی ہے کہ اس پر آگ یا زلزلہ کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ سنا ہے کہ پوری لاگت جو اس پر آئی ہے وہ 75 ملین ڈالر یعنی تقریباً 37 کروڑ روپے ہے۔ امریکن بظاہر سعودی حکومت اور سعودی ملازمین کی بڑی مدارات کرتا ہے اور موقع بے موقع ان کی نرم گرم بھی سہتا ہے، لیکن بالکل اس بنیے کی طرح جو اپنے گاہک یا

قرض دار کی بڑی آؤ بھگت کرتا ہے، لیکن اپنے مفاد سے نہیں چوکتا۔ امریکنوں نے اپنے پنجے سرزمین عرب میں کچھ اس زور سے گاڑے ہیں کہ وہ کبھی خود نکل جائیں تو نکل جائیں، نکالے سے نہیں نکل سکتے۔ عرب نوجوان جب ایک طرف آرامکو کے اس شاندار وسیع اور کسے ہوئے نظام کی طرف دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اپنی حکومت کے سروسامان اور نظام کو، تو ان کے دلوں میں امریکنوں کا رعب اور ان کی تہذیب کی برتری کا احساس شعوری اور غیر شعوری طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔

سفرِ ریاض

17 نومبر کو ہمارا پروگرام ریاض روانہ ہو جانے کا تھا۔ ہم لوگ صبح جلدی اٹھے اور نماز کے بعد اپنا سامان باندھنے لگے۔ گاڑی کا وقت 8 بجے تھا، لیکن ابھی ہم سامان باندھ ہی رہے تھے کہ ساڑھے سات بجے کے قریب اسماعیل خاں صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ ہفوف کے قریب ریل کی پٹڑی خراب ہوگئی ہے، اس لیے گاڑی 8 کے بجائے 10 بجے روانہ ہوگی۔ 10 بجے پھر ٹیلی فون آیا کہ ابھی پٹڑی ٹھیک نہیں ہوئی اس لیے گاڑی بارہ بجے روانہ ہوگی۔ 12 بجے اطلاع آئی کہ ابھی پٹڑی خراب ہے۔ گاڑی 3 بجے روانہ ہوگی۔ 3 بجے آخری اطلاع آئی کہ آج گاڑی روانہ ہی نہ ہوگی۔ ہم نے محض انتظار میں شام تک ہوٹل ہی میں وقت گزارا۔ مغرب سے پہلے ہم ظہران ریلوے اسٹیشن گئے۔ وہاں اسٹیشن والوں نے بتایا کہ کل گاڑی کے روانہ ہونے کا امکان ہے۔ اس لیے آپ لوگ صبح سات بجے پتہ کرلیں۔

یہاں ئی گاڑیوں کا نظم بھی خوب ہے۔ دمّام سے ریاض تک دو گاڑیاں جاتی ہے۔ ایک ایرکنڈیشنڈ، جس کے تمام ڈبے فسٹ کلاس ہی کے ہوتے ہیں اور 8 گھنٹے میں ریاض پہنچتی ہے۔ (دمام اور ریاض کے درمیان 370 میل کا فاصلہ ہے) یہ ہفتہ میں صرف تین دن یعنی ہفتہ، منگل اور جمعرات کو چلتی ہے۔ دوسری پسنجر جو ایرکنڈیشنڈ نہیں ہے اور 14 گھنٹے میں ریاض پہنچتی ہے یہ بھی ہفتہ میں صرف تین یا چار دن چلتی ہے۔ گاڑیوں کے روانہ ہونے کے دن اور اوقات اگرچہ مقرر ہیں، لیکن کسی گاڑی کے متعلق یہ قطعی نہیں ہے کہ وہ اپنے مقررہ دن اور وقت پر روانہ ہو ہی جائے گی۔ ہر چیز قابلِ تغیر ہے۔ کچھ ایسا ہی حال یہاں کے ہوائی جہازوں کا بھی ہے، اس لیے ہمارے پاکستانی احباب نے ان کا نام ''یمکن ایرلائنز'' اور ''یمکن ریلویز'' رکھا ہوا ہے اور سعودی باشندے بھی بعض اوقات انہیں ان ہی ناموں سے

یاد کرتے ہیں۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گاڑی یا ہوائی جہاز کے ریلٹ ہونے کی صورت میں جب ان کے ذمہ دار حضرات سے دریافت کیا جائے کہ گاڑی یا ہوائی جہاز کی روانگی کب ہوگی تو وہ کہیں گے۔ "یمکن بعد نصف ساعۃ، یمکن بعد ربع ساعۃ، یمکن بعد ساعۃ" لیکن یہ ساعہ ہے کہ اس کا ربع اور نصف بھی بعض اوقات کئی کئی گھنٹے لمبا ہو جاتا ہے۔ گزشتہ سفر میں اسی "یمکن" نے ہمیں دمشق کے ہوائی اڈہ پر چھ گھنٹے تک روکے رکھا۔ نہ ہم ہوائی اڈہ سے شہر جا سکتے تھے اور نہ ہوائی جہاز کے روانہ ہونے کی نوبت آئی تھی۔ (واضح رہے کہ ہمارا وہ ہوائی جہاز سعودی تھا)۔

18 نومبر کی صبح ہم اٹھے، تو معلوم ہوا کہ گاڑی کے روانہ ہونے کا آج بھی امکان نہیں ہے اس لیے ہم آرام سے اپنا کام کرتے رہے، لیکن ساڑھے نو بجے کے قریب یکا یک اطلاع آئی کہ گاڑی آج 11 بجے ظہران اسٹیشن سے روانہ ہو گی۔ ساڑھے دس بجے ہم اسٹیشن پہنچ گئے، لیکن گاڑی 12 بجے سے پہلے روانہ نہ ہو سکی۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب امیر سعود بن جلوی کے سیکرٹری صاحب آئے اور انہوں نے ہمارے لیے تین سیٹیں ریزرو کرا دیں اور ہم سے کہا کہ یہاں سے ریاض اطلاع کر دی گئی ہے۔ آپ لوگ ریاض پہنچ کر اسٹیشن سے سیدھے دارالضیافۃ الملکیہ (شاہی مہمان خانہ) چلے جائیں۔ گاڑی چار ڈبوں پر مشتمل اور ہمارے ہاں کی ریل کاروں سے مشابہ تھی اور پوری کی پوری ایرکنڈیشنڈ۔ صحرا میں ایرکنڈیشنڈ ڈبے بڑی ہی نعمت ہیں۔ ورنہ یہاں گرد اتنی اڑتی ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں آدمی کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ ایک بجے کے قریب ہم بقیق پہنچے۔ اسٹیشن پر 20 کے قریب پاکستانی احباب مولانا کو الوداعی سلام کہنے کے لیے موجود تھے۔ دو بجے کے قریب ہم ہفوف پہنچے، جو کبھی اس منطقہء شرقیہ کا صدر مقام تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہمیں یہ بہت وسیع اور نہایت خوبصورت اور شاداب شہر نظر آ رہا تھا۔ کئی میل تک نخلستان کا سلسلہ تھا۔ 5 بجے تک ہم ہفوف ہی پر رکے رہے، کیونکہ آگے ریل کی پٹڑی خراب تھی اور اس کی مرمت ہو رہی تھی۔ 5 بجے ہفوف سے روانہ ہوئے، لیکن 6 بجے اس مقام پر جا کر رک گئے جہاں پٹڑی کی مرمت ہو رہی تھی۔ مرمت بڑے زور وشور سے ہو رہی تھی، کیونکہ اگلے روز (19 نومبر کو) شاہ سعود دمام جانے کے لیے یہاں سے گزرنے والے تھے۔ مختلف

اسٹیشنوں پر ان کے استقبال کی تیاری بھی ہو رہی تھی۔ اگر شاہ سعود کو یہ سفر نہ کرنا ہوتا تو معلوم نہیں مرمت میں کتنے دن لگ جاتے اور ہمیں کتنے دن اور خُبر میں رکے رہنا پڑتا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس مقام سے گاڑی چل سکی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کون کون سے اسٹیشن آئے۔ ہمیں صرف حرض اور خرج کا علم ہو سکا، لیکن اندھیرے میں انہیں بھی نہ دیکھ سکے۔ رات کے ایک بجے جب ریاض پہنچے تو بھوک نے سخت پریشان کر رکھا تھا۔ چلتے وقت ہم نے لوگوں سے دریافت کیا تھا کہ گاڑی میں کھانا مل جاتا ہے؟ انہوں نے ہاں میں جواب دیا تھا۔ اس لیے ہم نے اپنے ساتھ کھانے کے لیے کوئی چیز نہ لی تھی۔ لیکن گاڑی میں پہنچ کر دیکھا کہ صرف ایک چھوٹی سی دکان ہے جس پر صرف چائے اور توس مل سکتے ہیں۔ چائے بھی دکان دار نے ایک تھرماس میں ڈال رکھی تھی۔ چند پیالیاں تھیں فوراً ختم ہو گئیں۔ دوپہر کو جب ہمیں بھوک لگی تو دو دو توس لے کر کھا لیے، لیکن شام کو اور رات کو وہ بھی نہ مل سکے۔ منٹگمری اسٹیشن سے گزرتے وقت شیخ محمد امین صاحب نے مولانا کی خدمت میں اپنی فیکٹری کے بسکٹوں کے کچھ ڈبے پیش کیے تھے۔ یہ بسکٹ یہاں کام آئے۔ انہیں کھا کر پانی پی لیا لیکن ان سے بھوک تو ختم نہ ہو سکتی تھی۔ بہرحال صحیح سلامت پہنچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور اسٹیشن سے دارالضیافہ پہنچنے کی فکر کرنے لگے۔

ریاض: 19 تا 28 نومبر 1959ء

ریاض وادی حنیفہ کے قریب سعودی حکومت کا پایۂ تخت ہے۔ یہ نجد کے جس علاقہ میں واقع ہے اسے عارض کہا جاتا ہے، جو قبیلہ بنو تمیم کا قدیم مسکن رہا ہے۔ 1818ء سے پہلے ریاض عارض کے دوسرے قصبوں کی طرح ایک معمولی قصبہ تھا، لیکن درعیہ کی تباہی کے بعد جب آلِ سعود نے اسے اپنا پایۂ تخت بنا لیا، تو اسے پورے نجد میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس وقت سے آج تک یہی آلِ سعود کا پایۂ تخت چلا آ رہا ہے، اگرچہ 1896ء میں حائل کے امراء آل الرشید نے اس پر قبضہ کر کے وقتی طور پر آل سعود کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن اس کے چند ہی سال بعد 1902ء میں موجودہ فرمانروا شاہِ سعود کے والد عبدالعزیز بن عبدالرحمان نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کی مدد سے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یہ

شہر شروع سے اپنی سرسبزی اور باغات کی وجہ سے مشہور رہا ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام ریاض (جمع روضہ) ہے۔

18 اور 19 نومبر کی درمیانی شب ہم ریاض پہنچ گئے۔ رات کا ایک بج چکا تھا ہم نے سوچا کہ ہم یہاں بالکل اجنبی ہیں اور کسی مناسب ہوٹل کا ہمیں علم نہیں ہے اس لیے پہلے دارالضیافہ ہولیں۔ اگر وہاں کوئی ذمہ دار آدمی مل گیا تو خیر، ورنہ قریب میں جو ہوٹل بھی مل جائے اسی میں قیام کرلیا جائے۔ چنانچہ مولانا تو اسٹیشن پر ٹھہرے، میں اور چودھری صاحب ٹیکسی لے کر دارالضیافہ روانہ ہوئے۔ راستے میں ریاض کی بہت سی سڑکوں اور بازاروں سے ہمارا گزر ہوا، جو نہایت شاندار اور جدید طرز پر بنے ہوئے تھے اور ان پر بجلی کی روشنی کا عمدہ انتظام تھا۔ دکانیں اگرچہ بند تھیں، لیکن اندازہ ہوا کہ گزشتہ چند سال کے اندر ریاض بہت ہی وسیع اور جدید طرز کا شہر بن چکا ہے۔ 49ء میں جب میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ساتھ پہلی مرتبہ ریاض آیا تھا تو یہ ایک معمولی قسم کا قصبہ تھا، ہمارے ہاں کے دیہات سے بھی گیا گزرا، نہ یہاں کوئی بازار تھا اور نہ کوئی پختہ سڑک (سوائے ایک سڑک کے جو شہر سے ہوائی اڈہ تک جاتی تھی)۔ بجلی تھی، لیکن بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد تک محدود۔ تنگ و تاریک قسم کی گلیوں میں معمولی قسم کی دکانیں تھیں اور ان ہی کو بازار کہا جاتا تھا۔ یہاں نہ کوئی ہوٹل تھا اور نہ کرائے کی کوئی سواری مل سکتی تھی۔ تمام تعمیرات حتیٰ کہ بادشاہ اور امراء کے محلات بھی کچے تھے۔ البتہ نئی تعمیرات کا آغاز ہو چکا تھا، جس کی ابتدا شاہی خاندان کے محلات کی تعمیر سے ہو رہی تھی۔ لیکن اب تو سارا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دارالضیافہ بھی اگرچہ (جیسا کہ میرا خیال تھا) وہی تھا، جس میں مَیں اور مولانا مسعود عالم صاحب ٹھہرے تھے، لیکن بالکل بدلا ہوا۔ پہلے بالکل کچا تھا، اور اب پختہ اور نہایت شاندار۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک ملازم باہر آیا۔ اس نے بتایا کہ مدیر الضیافہ شیخ ابن جمیح اس وقت موجود نہیں ہیں، آپ لوگ یا تو صبح آئیں یا اسی وقت ان کے مکان پر ان سے ملاقات کر لیں۔ رات کے وقت ہم نے ان کے ہاں جانا مناسب نہ سمجھا اور ٹیکسی والے سے کہا کہ کسی قریب کے ہوٹل میں ہمیں لے جائے۔ وہ ہمیں شارع البطحاء پر ایک ہوٹل ''فندق السلام'' میں لے گیا۔ معمولی قسم کا ہوٹل تھا، لیکن کرایہ بہت زیادہ، یعنی دس

ریال (13روپے) فی کس یومیہ، اس وقت ہم نے اسی کو غنیمت جانا اور وہیں اپنا سامان اتار لیا۔ بعد میں چودھری صاحب مولانا کو بھی یہیں لے آئے۔

ریاض کی شان وشوکت

صبح ناشتہ کے بعد فکر ہوئی کہ ریاض میں جن حضرات سے ہمیں ملنا ہے، ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ استاذ عبدالحکیم عابدین کے متعلق معلوم تھا کہ وہ ایک ہوٹل ''زہرۃ الشرق'' میں ٹھہرے ہیں۔ خُبَر کی ملاقات کے دوران میں انہوں نے ہمیں اپنے کمرے کا نمبر بھی دے دیا تھا۔ سوچا کہ پہلے ان سے مل لیا جائے اور پھر کوئی پروگرام طے کیا جائے۔ مولانا ہوٹل میں رہے میں اور چودھری صاحب ٹیکسی لے کر ''زہرۃ الشرق'' گئے، جو ریاض کا سب سے شاندار ہوٹل ہے اور اس کی سب سے شاندار سڑک ''شارع المطار'' (ہوائی اڈہ کی سڑک) پر واقع ہے اس کے تمام کمرے گرمی اور سردی دونوں موسموں میں ایر کنڈیشنڈ ہیں اور اس میں ایک دن قیام کا کرایہ 60ریال (80روپے) فی کس ہے۔ شان وشوکت اور خوبصورتی کے لحاظ سے اس کے پائے کا ہوٹل کم از کم میرے اندازے کے مطابق نہ پاکستان میں ہے اور نہ مصر، شام اور عراق میں۔ شارع المطار کی خوبصورتی اور شان وشوکت کے بھی کیا کہنے۔ ہمارے ہاں کراچی، لاہور کی کوئی سڑک بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس کے دونوں کناروں پر زراعت، مالیات، تعلیم، مواصلات اور دوسری وزارتوں کے جداجدا شاندار دفاتر واقع ہیں جن میں سے ہر ایک کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف آیا ہے۔ یہ سب جدید ترین مغربی طرز پر بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک کا طرز تعمیر نرالا ہے۔ گزشتہ چند سال کے اندر سعودی حکومت کی تمام وزارتوں کے دفاتر ریاض منتقل ہوگئے ہیں۔ صرف وزارت خارجہ اور وزارتِ داخلہ ابھی تک علی الترتیب جدہ اور مکہ معظمہ میں ہیں اور شاید آیندہ کئی سال تک وہیں رہیں۔

استاذ عبدالحکیم عابدین کے متعلق دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک دوسرے ہوٹل ''فندق الیمامہ'' میں منتقل ہوگئے ہیں۔ یہ ہوٹل بھی قریب ہی شارع المطار ہی پر واقع ہے اور اپنی شان وشوکت اور انتظامات میں ''زہرۃ الشرق'' سے کسی طرح کم نہیں ہے، وہاں

استاذ موصوف مل گئے۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ ہم ایک معمولی ہوٹل میں ٹھہر گئے ہیں تو انہوں نے چاہا کہ ہمیں شاہی مہمان بنوانے کی کوشش کریں۔ لیکن خواہ مخواہ کوشش کر کے مہمان بننا ہمیں پسند نہ تھا۔ استاذ عابدین کو ساتھ لے کر ہم مولانا کے پاس ''فندق السلام'' آئے اور وہاں یہی طے ہوا کہ جتنے دن بھی ریاض میں ٹھہرنا ہو ہم اسی ہوٹل میں ٹھہرے رہیں گے۔ معلوم ہوا کہ ریاض میں یا تو اسی طرح کے چند معمولی ہوٹل ہیں یا پھر ''زہرة الشرق'' اور'' الیمامہ'' جیسے دو شان دار ہوٹل، جن میں ٹھہرنا ہماری بساط سے باہر تھا۔ استاذ عبدالحکیم عابدین بار بار شرمندگی محسوس کرتے رہے اور اپنے ''فندق الیمامہ'' میں قیام پر معذرت کرتے رہے کہ اس ہوٹل میں میرا قیام اپنے مصارف پر نہیں ہے بلکہ میرا موکل جو اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے مجھے بیروت سے لایا ہے، خود بھی اس ہوٹل میں ٹھہرا ہے اور اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ وہیں ٹھہرا لیا ہے۔

اسی روز عصر کے قریب ہمارے مکہ معظّمہ کے دوست عبداللہ بن کلیب تشریف لائے جو ان دنوں اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں ریاض آئے ہوئے تھے۔ استاذ عبدالحکیم عابدین سے انہیں ہماری آمد کی اطلاع ہوئی تو فوراً ملاقات کے لیے آ گئے۔ ان کے ساتھ دو صاحب اور بھی تھے جن سے ہمارا تعارف پہلی مرتبہ ہوا۔ ایک شیخ مناع القطان جو ریاض کے کلیۃ الشریعہ میں پروفیسر ہیں[1] اور اصل میں مصر کے رہنے والے ہیں، لیکن اخوان سے تعلق ہونے کی وجہ سے نکال دیے گئے ہیں۔ دوسرے احمد باحشون جو حضرموت کے باشندے ہیں اور ریاض کے ایک ابتدائی مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شیخ مناع القطان نے ہمیں اگلے روز اپنے ہاں ناشتہ کی دعوت دی جو ہم نے منظور کر لی۔

شیخ عبدالعزیز بن باز

مغرب کے بعد نجد کے مشہور عالم شیخ عبدالعزیز بن باز چند اصحاب کے ساتھ تشریف لائے۔ استاذ عابدین سے انہیں ہماری ریاض میں آمد کی اطلاع ہو گئی تھی۔ شیخ عبدالعزیز گو

1- اب غالباً مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں (ستمبر 67ء)

پیدائشی نابینا ہیں اور زیادہ عمر کے بھی نہیں ہیں، لیکن ان کا شمار سعودی عرب کے چند بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ اپنے اخلاص، علم، ذہانت، سادگی، استغناء، طالب علمانہ مزاج اور سب سے بڑھ کر حق گوئی میں جرأت کی وجہ سے وہ پوری مملکت میں نہایت مشہور و محبوب ہیں۔ ان دنوں ان کے پاس کوئی سرکاری عہدہ نہیں تھا۔ صرف کلیۃ الشریعہ میں پڑھاتے تھے اور وہیں سے مشاہرہ پاتے تھے۔ اب مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ (اسلامیہ یونیورسٹی) قائم ہوئی ہے۔ تو انہیں اس کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔ ان کی حق گوئی کا ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ 49ء میں جب میں اور مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم ریاض آئے تھے، تو ایک روز شام کے وقت ہم لوگ مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے، آل الشیخ (شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خاندان کے علماء و مشائخ) کے علاوہ شیخ عبدالعزیز بن باز بھی موجود تھے۔ ان دنوں پاکستان میں سعودی حکومت کے سفیر سید عبدالحمید خطیب (مرحوم) تھے۔ سب لوگ ان کی دینداری کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ عبدالعزیز بولے "سید عبدالحمید خطیب کی میں بھی عزت کرتا ہوں اور پاکستان میں ان کی سرگرمیوں کا حال سن کر بڑی مسرت ہوتی ہے، مگر انہوں نے رمضان کے "امساکیہ" (نقشہ افطار و سحر) میں سلطان اور ولی عہد کی تصویر چھاپ کر بُرا کیا ہے۔ یہ چیز اچھی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آگے چل کر ان کی پرستش شروع ہو جائے[1]۔" شیخ کی محبوبیت کا یہ حال ہے کہ ہم نے اپنے سفر کے دوران میں سعودی مملکت کے اندر بھی اور اس سے باہر دوسرے عرب ملکوں میں بھی کوئی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا آدمی ایسا نہیں پایا جو ان کے علم، اخلاص اور

1۔ یہاں ضمناً یہ بات بیان کر دینا شدید نامناسب نہ ہو کہ دوسرے عرب ممالک کے علماء تو اب تصویر کو حلال سمجھتے ہیں۔ لیکن نجد کے علماء اس کی حُرمت پر متفق ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت سعودی عرب میں بھی علماء کی مرضی کے علی الرغم تصاویر کو رواج عام ہو گیا ہے اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ تاہم علماء کی رائے کا یہ اثر ضرور ہے کہ ہمیں ریاض کے کسی رئیس یا سرکاری افسر کے مکان میں اور کسی ہوٹل یا دکان میں کوئی تصویر علانیہ دیواروں پر لٹکی ہوئی نظر نہیں آئی۔ بازاروں میں کوئی اشتہاری بورڈ بھی تصویر کے ساتھ نہیں دیکھا۔

حق گوئی کا قائل اور مداح نہ ہو۔ پاکستان میں سعودی سفیر استاذ محمد الحمد الشبیلی نے ہمیں اِن کے نام ایک دستی خط دیا تھا، اس لیے ہمارا خیال تھا کہ ان کے ہاں خود حاضر ہوں، لیکن انہوں نے پیش قدمی فرمائی اور خود ہی ملاقات کے لیے تشریف لے آئے۔ دراصل عربوں کے ہاں مہمان کے استقبال اور تواضع کے جو اصول ہیں، ان میں ''القادم یُزار'' (یعنی یہ کہ مہمان سے اس کی جائے قیام پر جا کر ملاقات کی جائے اور پھر اسے اپنے ہاں بلایا جائے) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز گواس سے پہلے مولانا اور ان کے کارناموں۔۔۔ ان لوگوں کے بقول ''جہاد''۔۔۔ سے واقف تھے۔ اور ان کی چند کتابیں بھی پڑھ چکے تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان کبھی ملاقات یا مراسلت کا سلسلہ نہ رہا تھا۔ سلام و دُعا کے بعد بار بار مولانا سے خیریت دریافت فرماتے رہے۔

اہل نجد کی عادت ہے کہ وہ اپنے مہمان اور ملنے والے سے بار بار ''کیف حالکم؟'' کہتے ہیں اور ''عساکم طیبین، عساکم بخیرٍ'' کے اس قدر پے در پے سوالات کرتے ہیں کہ ایک عرب مہمان حیران رہ جاتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ بات بات پر وہ اپنے مخاطب کو دعائیں دیتے ہیں۔ ریاض میں ''طال عمرك'' (آپ کی عمر دراز ہو) تو ہر شخص کا تکیہ کلام ہے۔ ہر دعا کا ایک مخصوص جواب یہ لوگ آپس میں تو بڑی آسانی سے دے لیتے ہیں، لیکن مشکل ہم جیسے اجنبی لوگوں کو پیش آتی ہے۔ جواب نہ دِیں تو یہ بڑی بدتہذیبی ہے اور جواب دیں تو ہر مرتبہ پہلے سے مختلف کیا جواب دیں؟

ہم نے شیخ کو سعودی سفیر کا خط دیا اور انہوں نے وہیں اِسے اپنے ایک شاگرد سے پڑھوا کر سنا۔ اس کے بعد سفر کی غرض و غایت اور پروگرام کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں شیخ نے مولانا سے دریافت فرمایا: ''کیا آپ امیر عبداللہ بن عبدالرحمان (شاہ سعود کے چچا) کے ہاں جانا پسند کریں گے؟'' امیر عبداللہ بن عبدالرحمان کے متعلق شیخ نے بتایا کہ اس وقت یہ آلِ سعود (شاہی خاندان) کے سب سے بڑے اور اقرب الی الدین آدمی ہیں۔ مولانا تیار ہو گئے اور اس کے بعد ہم سب شیخ ہی کی موٹر میں بیٹھ کر امیر عبداللہ کے قصر پہنچے۔ لیکن معلوم ہوا کہ امیر موجود نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہم ان کے چھوٹے بھائی امیر مساعد بن عبدالرحمٰن (جو ان دنوں امیر فیصل کی عدم موجودگی میں قایم مقام وزیر اعظم تھے)

سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے۔

قدیم ریاض

راستے میں اندازہ ہوا کہ اگرچہ ریاض بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے اور اس میں بڑی شاندار سڑکیں اور عمارتیں بن چکی ہیں، لیکن ابھی قدیم ریاض بھی اپنی کچی گلیوں اور عمارتوں کے ساتھ باقی ہے۔ معلوم ہوا کہ جو مکانات کچے ہیں، انہیں قصداً کچا رکھا گیا ہے، کیونکہ یہاں کی آب و ہوا میں کچے مکانات ہی زیادہ مناسب ہیں۔ پختہ مکانات جب تک ایر کنڈیشنڈ نہ ہوں، ان میں گرمی اور سردی دونوں موسموں میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اب پرانے مکانات کو گرانے اور ان کی جگہ نئے پختہ مکانات بنانے کا سلسلہ جاری ہے اور امید ہے کہ آئندہ آٹھ دس سال میں سارا شہر پختہ اور نئے طرز پر تعمیر ہو جائے گا۔ امیر مساعد کا مکان بھی قدیم ریاض کی ایک گلی میں واقع ہے۔ اور اس پر کوئی جھنڈا یا علامتی نشان بھی نہیں ہے اور نہ ڈیوڑھی پر پولیس کا پہرہ ہے (دو چار سپاہی اندر کہیں ہوں تو اور بات ہے) اس لیے شیخ کا ڈرائیور ان کا مکان نہ پہچان سکا اور ہم ایک دوسری گلی میں ایک دوسرے امیر کے ہاں پہنچ گئے۔ ہمیں تو خیر کچھ پتہ ہی نہ تھا، لیکن شیخ عبدالعزیز اور استاذ عبدالحکیم عابدین کو وہاں پہنچتے ہی اندازہ ہو گیا کہ ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے، قہوہ اور چائے بھی پی، تاکہ ان پر یہ ظاہر نہ ہو کہ ہم غلطی سے ان کے ہاں آ گئے ہیں، وہاں سے نکلنے کے بعد استاذ عبدالحکیم عابدین نے ہمیں حقیقت حال سے مطلع کیا۔ اس کے بعد ہم امیر مساعد کے ہاں پہنچے، مگر وہ بھی موجود نہ تھے۔ پھر شیخ عبدالعزیز ہمیں اپنے مکان پر لے آئے۔ جو قدیم ریاض ہی کی ایک گلی میں واقع ہے۔ وہاں ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ لگا ہوا تھا۔ مجلس نہایت سادہ اور زمین پر قالین کے فرش کی تھی۔ تمام حاضرین نے رسمی سلام و مصافحہ کے بعد اپنا اپنا تعارف کرایا۔ اور اپنے پاکستانی "سلفی بھائیوں" کا حال دریافت کرنے لگے۔ نجدی علماء اور ان کے متعلقین جب بھی کسی پاکستانی یا ہندوستانی مسلمان سے ملتے ہیں یہاں کے اہل حدیث حضرات کے متعلق ضرور سوال کرتے ہیں۔ ہم نے مجمل الفاظ میں انہیں پاکستان کے اہلحدیث حضرات کی خیریت کی

اطلاع دی۔ اس کے بعد مولانا نے شیخ کی خدمت میں اپنی چار عربی کتابیں، رسالہ دینیات، اسلام کا نظام حیات، مسلمانوں کا ماضی و حال اور قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں پیش کیں۔

نجدی ضیافت

یہ بتانا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ اس اثنا میں شیخ نے بخور (لوبان کا دھواں) قہوہ اور چائے سے ہماری تواضع فرمائی۔ اس سے پہلے ہم عربی تہذیب کے ان لوازم کی ترتیب، اہمیت اور آداب کو اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ آج کی خالص نجدی مجلس میں ان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوا۔ سب سے پہلے شیخ کا ایک ملازم مجمر (انگارادان جو لکڑی کا بنا ہوتا ہے اور اس کے اوپر سرخ روغن کر کے باریک باریک سنہری کیل لگے ہوتے ہیں اور اوپر کے حصے میں کوئلے رکھنے کی جگہ ہوتی ہے) لے کر شیخ کے پاس آیا۔ شیخ نے اپنی جیب سے لوبان کا ایک ٹکڑا نکال کر کوئلوں پر رکھا، جس سے دھواں اٹھنے لگا۔ پھر اس ملازم نے مجمر لے کر تمام شرکائے مجلس کے سامنے دو تین مرتبہ چکر لگایا جو اپنے ہاتھوں سے چہروں اور کپڑوں پر دھواں لیتے رہے۔ بعض لوگ تو مجمر کو اپنے ہاتھ میں لے کر ایک دو منٹ تک اپنے رومال یا مشلہ (عربی چغہ) کے اندر رکھتے اور پھر اسے لوٹا دیتے۔ ہمارے لیے یہ منظر بڑا دلچسپ تھا۔ دوسروں کو دیکھ کر ہم بھی مجمر کے دھوئیں سے متمتع ہوئے۔ بخور کا یہ رواج عربوں کے ہاں بہت پرانا ہے اور اسے مہمان کی خاطر مدارات کا اہم ترین جز شمار کیا جاتا ہے۔ کتاب الاغانی اور ادب کی دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خلفاء کے دربار میں بھی بخور کا اسی طرح دور چلا کرتا تھا۔

پھر قہوہ کا دور شروع ہوا، اور اس کی شکل یہ تھی کہ وہی ملازم اپنے ایک ہاتھ میں قہوہ کا ایک لمبا سا برتن اور دوسرے ہاتھ میں قلم دان کی دواتوں جیسی چھوٹی چھوٹی چند پیالیاں لے کر نمودار ہوا۔ وہ باری باری ہر شخص کو ایک ایک پیالی دیتا اور اس میں قہوہ کے چند قطرے ڈال دیتا۔ ہر شخص قہوہ کے یہ قطرے پی کر پیالی ملازم کے حوالے کر دیتا۔ اس طرح جب پورا چکر ختم ہو جاتا، تو دوسرا چکر شروع ہوتا، اور جب تک کوئی شخص ایک خاص طریقہ

سے اپنی پیالی ہلا کر واپس نہ کر دیتا اس کی پیالی میں بار بار قہوہ ڈالنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد چائے (بلا دودھ) آئی اور پھر قہوہ کا ایک اور دور چلا۔ یہ کم سے کم ضیافت ہے جو ہر نجدی اپنے مہمان کے لیے لازماً کرتا ہے۔ نجدی حضرات کا یہ قہوہ الاچی اور بن (مکئی کے دانے کے برابر ایک سخت چیز جو یمن یا حبشہ سے برآمد کی جاتی ہے) کو کوٹ کر تیار کیا جاتا ہے اور اس قدر تلخ ہوتا ہے کہ اسے ہر مرتبہ چند قطروں سے زیادہ نہیں پیا جا سکتا۔ معلوم نہیں عربوں کے ہاں قہوہ کا یہ رواج کب سے ہوا، لیکن اب تو یہ لوگ اسے بڑے ہی مزے سے پیتے ہیں اور بعض تو اس کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ جب تک صبح اٹھ کر اس کی خدمت نہ کر لیں اور اس کے چند گھونٹ حلق سے نیچے نہ اتار لیں، اپنے اندر چستی محسوس نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ ایک عرب کو علی الصباح قہوہ بنا کر پیتے دیکھ کر مولانا فرمانے لگے کہ ہمارے ہاں حقہ پینے اور پان کھانے والوں کو ''شرم'' آنی چاہیے کہ انہیں اپنے حقے اور پان سے اتنا بھی عشق نہیں ہے جتنا ان لوگوں کو اپنے قہوہ سے ہے

اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

شاہ سعود کا قصر الناصریہ

عشاء کی نماز شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں ادا کر کے ہم اپنے ہوٹل کی طرف واپس ہوئے۔ راستے میں شیخ کے ڈرائیور نے ہمیں ریاض دکھایا۔ پہلے اس نے ہمیں شارع المطار اور شارع الجامعہ (یونیورسٹی کی سڑک) کی سیر کرائی، جو بجلی کی روشنی میں نہایت شاندار اور خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔ (کہتے ہیں کہ گزشتہ چار سال میں سعودی حکومت نے ریاض کی سڑکوں پر جو رقم صرف کی ہے وہ تقریباً 6,53,37167روپے ہے) پھر وہ ہمیں شاہ سعود کے محل ''الناصریہ'' لے گیا، جس کی خوبصورتی اور شان وشوکت کو بیان کرنا میرے جیسے کوتاہ قلم اور غیر ادیب آدمی کے لیے بڑا ہی مشکل ہے۔ کم از کم ایک میل لمبا اور نصف میل چوڑا باغ ہے اور اس کے وسط میں نہایت ہی شاندار محل۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس باغ کے اندر جانے اور محل کے ارد گرد گھومنے اور سیر کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جو شخص جب چاہے اس کی سیر کر سکتا ہے۔ اس پر ہمیں اپنے ہاں کے حکام عالی مقام بڑے یاد آئے۔

اگلے دن (20 نومبر) علی الصبح ریاض کے کلیۃ الشریعہ کے تین شامی طلبہ ہماری ملاقات کے لیے ہوٹل آئے۔ انہوں نے مولانا کی تمام عربی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں کلیۃ الشریعہ میں ایسے طلبہ کی تعداد جنہوں نے مولانا کی تمام عربی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں بیس سے زائد ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ خود یہ کتابیں پڑھتے ہیں بلکہ دمشق سے انہیں منگوا کر دوسرے طلبہ میں بھی پھیلاتے اور فروخت کرتے ہیں۔ یہ تینوں طلبہ دراصل ہمیں اپنے ایک اجتماع میں دعوت دینے کے لیے آئے تھے، جسے یہ لوگ اسی روز عصر کے بعد خاص طور پر مولانا سے ملاقات کے لیے اپنے کالج میں منعقد کر رہے تھے اور اس میں صرف وہی طلبہ شریک ہو رہے تھے جو پہلے سے مولانا سے متعارف اور ان کی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔

باپردہ عورتوں کا بازار

9 بجے (صبح) ہم اپنے وعدے کے مطابق شیخ مناع القطان کے ہاں گئے، ان کا مکان سبزی منڈی کے پاس تھا۔ وہاں منڈی میں ہم نے دیکھا کہ عورتوں کا ایک بازار الگ لگا ہوا ہے، جس میں صرف عورتیں کپڑے، برتن، مرغیاں، انڈے اور دوسری چیزیں فروخت کر رہی تھیں اور عورتیں ہی خریدار تھیں۔ ان میں کوئی ایک عورت بھی ہمیں بے پردہ اور بے نقاب نظر نہ آئی۔ نقاب کے باوجود یہ سب بآسانی خرید و فروخت کر رہی تھیں یہی منظر 49ء میں ہم نے کویت میں بھی دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمیں ان لوگوں کی عقل پر حیرت ہوئی، جو کہتے ہیں کہ عورت پردہ کے ساتھ کوئی کام نہیں کر سکتی۔

عرب قومیت کا ثمرہ

ناشتہ کے بعد دیر تک شیخ مناع القطان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ خاص طور پر عرب ممالک میں عرب قومیت کی تحریک سے سخت خطرہ کا اظہار کرتے رہے۔ انہوں نے ہمیں ایک مشہور عرب شاعر ''القروی'' کا قصیدہ سنایا، جس میں وہ کہتا ہے۔

بلادک قدمها علیٰ کل ملۃ   ومن اجلها انطر ومن اجلها صم

سلام علیٰ کفر یُوحِدّ بیننا — واھلا وسھلا بعده بجھنَّم

قد مزَّقت ھذه المذاھب بیننا — وقد حَطَّمتُنا بین نابِ ومَنسِمُ

(اپنے وطن کو ہر دین وملت پر مقدم رکھو۔ اسی کے لیے افطار کرو اور اسی کے لیے روزہ رکھو۔ سلام ہو اس کفر پر جو ہمارے درمیان اتحاد پیدا کر دے۔ اس کے بعد اگر جہنم بھی نصیب ہو تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے ان مذاہب نے تو ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اونٹ کے دانتوں اور کھروں کے درمیان ہمیں پیس ڈالا ہے۔)

یہ اشعار سنا کر انہوں نے کہا کہ عرب قومیت کی یہ تحریک ایک سیدھی سادی بے ضرر قسم کی قومی تحریک نہیں ہے بلکہ درپردہ یہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے اور الحاد و دہریت کی طرف دھکیلنے کی تحریک ہے، جس کی سربراہی زیادہ تر یا تو لبنان کے عیسائی کر رہے ہیں یا مسلمانوں میں سے وہ فرنگیت زدہ لوگ جو دین کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس قصیدے پر مصر کی موجودہ حکومت نے قروی کو نشان القداسہ (Medal of Holiness) عطا فرمایا ہے اور عرب قوم پرستوں کے حلقے میں وہ ''قدیس القومیۃ العربیۃ'' کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ یعنی عرب قومیت کا مہا پروہت (High Priest) شیخ مناع کے ہاں کچھ دیر ٹھہر کر اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔

اس روز جمعہ تھا۔ نماز کے وقت سے کچھ پہلے استاذ عبدالحکیم عابدین اپنے ایک دوست شیخ عبداللہ المسعری کے ساتھ تشریف لائے جو سعودی حکومت کی وزارتِ قانون کے سیکرٹری ہیں۔ ان کے ساتھ ہم یونیورسٹی کے قریب ایک مسجد میں جمعہ پڑھنے کے لیے گئے۔ ایک نوجوان خطیب خطبہ دے رہا تھا۔ خطبہ کیا دے رہا تھا، اس نے پہلے سے ایک خطبہ کاغذ پر لکھ رکھا تھا یا کہیں سے نقل کر لیا تھا اور اسی کو پڑھ رہا تھا۔ !! ہے کہ ریاض میں بڑے بڑے علماء تک کا یہی حال ہے۔ حتیٰ کہ مفتیٔ اکبر شیخ محمد بن ابراہیم بھی ''مجموعۂ خطب ایام الجمعہ'' نامی کتاب سے ایک خطبہ زبانی یاد کر کے سنا دیتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑے بڑے دینی مناصب آل الشیخ (شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خاندان) کے لیے مخصوص

ہیں اور دوسرے لوگ صرف اسی صورت میں کسی دینی منصب پر مقرر کیے جاتے ہیں جب کہ آل الشیخ میں کوئی آدمی موجود نہ ہو۔ حرم مکی کے خطیب اگرچہ شیخ عبدالمہیمن (مصری) ہیں، لیکن وہ حرم کے خطیب اول نہیں ہیں۔ بلکہ خطیب اول آل الشیخ کے ایک فرزند شیخ عبدالعزیز بن حسن ہیں۔ جو ان دنوں وزارتِ تعلیم کے سیکرٹری تھے اور اب وزیر ہو گئے ہیں۔ سارا سال ریاض میں رہتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھار مکہ معظمہ جا کر حرم میں خطبہ دے آتے ہیں۔

کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کا اجتماع

عصر کے بعد ہم اپنے پروگرام کے مطابق کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کے اجتماع میں گئے، کوئی پچیس کے قریب طلبہ تھے، جن میں سے اکثر شامی تھے۔ انہوں نے مولانا سے بے انتہا عقیدت ومحبت کا اظہار کیا اور پھر مختلف علمی موضوعات خصوصاً اس زمانہ میں دعوتِ اسلامی کا کام کرنے کے متعلق سوالات کرتے رہے۔

مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم سے ملاقات

مغرب کے بعد ہم استاذ عبدالحلیم عابدین کے ساتھ مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم سے ملاقات کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ یہ بھی پیدائشی نابینا ہیں اور اس وقت آل الشیخ کے سب سے بڑے اور بارسوخ بزرگ ہیں۔ کسی خاص موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی، عام قسم کی باتیں ہوتی رہیں یا پھر ہمارا سفر اور اس کا پروگرام موضوع رہا۔

شیخ عمر بن حسن اور محکمہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اگلے دن (21 نومبر) صبح کے وقت شیخ عمر بن حسن چند دوسرے علماء کے ساتھ مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ یہ بھی آل الشیخ میں سے ہیں اور پوری سعودی حکومت کے محکمہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے صدر ہیں۔ حکومتِ سعودیہ کی نہایت قابلِ تعریف خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں ایک باقاعدہ محکمہ اس کام کے لیے مقرر ہے کہ

شریعت کے منکرات کی روک تھام کرے اور معروفات کا حکم دے۔ اس محکمہ کی اپنی الگ پولیس اور جیل ہے۔ یہ محکمہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جس کی بدولت مغربیت کا سیلاب اس مملکت میں اس شدت کے ساتھ نہیں آ سکا ہے جس کا مشاہدہ دوسرے مسلم ممالک میں ہو رہا ہے۔ شیخ عمر بن حسن بڑے ہی ہنس مکھ اور فصیح اللسان آدمی ہیں۔ جتنی دیر بیٹھے رہے بڑی شیریں اور موثر زبان میں خدا اور رسولؐ کی باتیں کرتے رہے جن سے محسوس ہوا کہ ان کے دل میں اعلائے کلمتہ الحق اور اصلاح خلق کا گہرا جذبہ ہے۔ آخر میں وہ مولانا کو مفتی اکبر کے چھوٹے بھائی شیخ عبداللطیف بن ابراہیم (جو ریاض میں کلیتہ الشریعہ اور دینی تعلیم کے دوسرے تمام ادارات کے نگرانِ اعلیٰ ہیں) سے ملاقات کرانے کے لیے کلیتہ الشریعہ لے گئے۔ اس روز مجھے اور چودھری صاحب کو بازار کا ایک ضروری کام تھا، اس لیے ہم مولانا کے ساتھ کلیتہ الشریعہ نہ جا سکے۔

مولانا نے کلیہ میں شیخ عبداللطیف کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے بھی ملاقات کی، اور ان کے درس بھی سنے۔ مولانا نے واپس آ کر بتایا کہ تمام درس فصیح زبان میں تھے اور تمام اساتذہ اچھی تیاری کے بعد لیکچر دے رہے تھے۔ شیخ مناع القطان اور شیخ عبدالرزاق عفیفی کے لیکچر مولانا کو خاص طور پر پسند آئے۔ شیخ عفیفی اس کالج میں فقہ کے استاذ ہیں۔ دراصل مصری ہیں، لیکن اب انہوں نے سعودی شہریت اختیار کر لی ہے۔ شیخ محمد حامد الفقی[1] کے انتقال کے بعد مصر کی جمعیتہ انصار السنتہ المحمدیہ کے صدر یہی مقرر کیے گئے ہیں۔ بہت ہی باعلم اور نہایت حلیم الطبع اور منکسر المزاج آدمی ہیں۔ ہیں تو مصری، لیکن اپنی ڈاڑھی سے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ ہندوستان یا پاکستان کے علماء میں سے ہیں۔

جامعتہ الملک سعود اور ریاض کا کلیتہ الشریعتہ

ریاض میں 1377ھ (1957ء) سے جامعتہ الملک سعود، کے نام سے ایک یونیورسٹی

۱۔ یہ مصر میں جمعیت اہل الحدیث کے طرز کی جماعت ہے اور اس کا مسلک بھی وہی ہے جو ہمارے ہاں کے اہل حدیث کا ہے۔

قائم ہو چکی ہے اور اس وقت اس کے تحت چار کالج، کلیۃ آلاداب (آرٹس کالج) کلیۃ العلوم (سائنس کالج) کلیۃ التجارہ (فینانشل کالج) اور کلیۃ الصیدلیہ (میڈیکل کالج) ریاض میں قایم ہیں اور ایک کالج کلیۃ الشریعہ کے نام سے مکہ معظّمہ میں چل رہا ہے۔ ریاض کا شریعت کالج، یعنی کلیۃ الشریعہ یونیورسٹی کے ماتحت نہیں ہے، بلکہ اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل (جہاں تک ہم نے سنا ہے) اس وقت سعودی عرب میں بھی علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ (جو یونیورسٹی اور حکومت کے نظم ونسق پر حاوی ہے) کے درمیان اختلاف رونما ہو چکا ہے اور ایک طرح کی کشمکش کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی قایم ہونے سے پہلے ریاض کے علماء اپنے گھروں پر درس کی مجلسیں قائم کرتے تھے اور ان ہی کی سند، سندِ فراغت خیال کی جاتی تھی۔ لیکن جب یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے تحت کالج اور جابجا ابتدائی اور ثانوی مدرسے کھولے گئے تو یونیورسٹی والوں نے دینی علوم کی تعلیم بلکہ صحیح معنوں میں عدالتوں کے لیے قاضی اور وکیل پیدا کرنے کے لیے بھی مصر وشام کے طرز پر دینی کالج قائم کرنا چاہا لیکن علماء ایک تو اپنے آپ کو یونیورسٹی کے تحت دینا پسند نہ کرتے تھے اور دوسرے انہیں یہ گوارہ نہ تھا کہ جس طریق پر اب تک دینی علوم کی تدریس کا سلسلہ چلتا رہا ہے، اس میں تغیر کیا جائے۔ بالآخر جس بات پر یہ کشمکش ختم ہوئی، یا یوں کہیے کہ فی الحال رکی ہوئی ہے، وہ یہ کہ یونیورسٹی والوں نے ریاض میں دوسرے کالج تو قایم کیے لیکن اپنا کلیۃ الشریعہ مکہ معظّمہ میں کھولا۔ دوسری طرف علماء کی مجالس تدریس کو بھی ایک باقاعدہ شکل دینے کے لیے کلیۃ الشریعہ ہی کے نام سے ایک کالج ریاض میں کھول دیا گیا، جس کا سارا نظم ونسق، نصاب اور ہر چیز علماء کی مرضی کے مطابق طے پاتی ہے۔ ریاض اور مکہ معظّمہ کے کلیۃ الشریعہ میں فرق یہ ہے کہ ریاض کے کلیۃ الشریعہ کے ہر طالب علم کو ماہانہ تین سو ریال (تقریباً چار سو روپیہ) اور اس کے تحت جو دینی مدارس ہیں ان کے ہر طالب علم کو ماہانہ 150 ریال (تقریباً 200 روپیہ) وظیفہ دیا جاتا ہے[1]۔ لیکن فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کے لیے ملازمت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ کسی مسجد میں خطابت یا دینی

1۔ اب یہی حیثیت مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کی ہے۔

مدرسہ میں تدریس کی جگہ خالی ہو اور قسمت یاوری کرے تو وہ اسے پر کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس مکہ معظمہ کے کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کو یونیورسٹی کے دوسرے کالجوں کی طرح تعلیم کے دوران میں کوئی وظیفہ نہیں دیا جاتا، لیکن فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد ان کے لیے ملازمت کی ضمانت ہے۔ جب تک ملازمت نہیں دی جائے گی، ان میں سے ہر ایک کو 1200 ریال (1600 روپیہ) ماہانہ لازماً ملتے رہیں گے۔ اس طرح گویا سعودی مملکت کے اندر بھی دین اور دنیاوی تعلیم کے دو الگ الگ نظام بن رہے ہیں۔ اس وقت تو حالت ملی جُلی سی چل رہی ہے، لیکن چند سال کے بعد کیفیت یہ ہو جائے گی کہ حکومت کی عام مشینری کے لیے کارکن یونیورسٹی کے دوسرے کالجوں سے نکلیں گے، عدالتوں کے قاضی اور وکیل مکہ معظمہ کے کلیۃ الشریعہ سے حاصل ہوں گے اور مساجد کے لیے خطیب اور امام ریاض کا کلیۃ الشریعہ مہیا کرے گا۔ یعنی اسی قسم کے جدا جدا عناصر پیدا ہو جائیں گے، جس طرح کے دوسرے عرب ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبہ کے متعلق ہمیں یہ معلوم کر کے سخت دکھ ہوا کہ ان میں کمیونزم اور دوسرے ملحدانہ نظریات سے متاثر طلبہ کا اچھا خاصا عنصر پایا جاتا ہے او وہ اکثر دین اور اس کے صریح احکام کا مذاق اڑاتا رہتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

استاذ حمد الجاسر

کلیۃ الشریعہ سے واپسی پر مولانا نے استاذ حمد الجاسر سے ان کے پریس میں ملاقات کی اور تفصیلی ملاقات کے لیے ان سے اگلے دن کا وقت لیا۔ استاذ حمد الجاسر ریاض کے ادیب بلکہ صحیح معنوں میں شیخ الادباء شمار کیے جاتے ہیں۔ ریاض کے متعلق کوئی گفتگو یا مضمون اس وقت تک مکمل نہیں کہا جا سکتا، جب تک اس میں حمد الجاسر کا ذکر نہ ہو۔ یہ نجد ہی کے رہنے والے اور اس زمانہ میں عرب کے جغرافیہ پر جو چند آدمی سند مانے جاتے ہیں ان میں سے ایک ہیں۔ عرب جغرافیہ کے متعلق ان کے تحقیقاتی مضامین مجمع علمی (دمشق) کے ماہانہ پرچہ میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چند سال سے انہوں نے ریاض میں مطابع الریاض کے نام سے سب سے پہلا پریس قائم کیا ہے اور اب اس میں ایک ہفتہ وار اخبار

''الیمامہ'' بھی شایع کر رہے ہیں۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر تک ان کا یہ پرچہ ریاض سے شایع ہونے والا واحد پرچہ تھا، لیکن اب وہاں سے ایک اور ہفتہ وار پرچہ ''القصیم'' اور ایک ماہ نامہ ''الجزیرہ'' بھی شایع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مولانا ان سے مل کر اپنے سفر کے متعلق معلومات اور بعض اہم تاریخی مقامات کی تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ وہ سخت مشغول تھے اور یوں بھی پریس کی کھٹا کھٹ میں تفصیلی گفتگو ممکن نہ تھی، اس لیے انہوں نے اپنے مکان پر تفصیلی ملاقات کے لیے مولانا کو اگلے دن کا وقت دیا۔

علماء کی سادگی

تین بجے بعد دوپہر ہم شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں گئے۔ انہوں نے ہمیں کھانے پر بلایا تھا۔ عرب ممالک خصوصاً نجد، حجاز، اور شام کے لوگ دوپہر کا کھانا بڑی دیر سے کھاتے ہیں، یعنی تین اور چار بجے کے درمیان، اور پھر سنا ہے کہ رات کا کھانا یا تو کھاتے ہی نہیں یا اگر کھاتے ہیں تو بہت ہلکا کھاتے ہیں، اس لیے ان کی جو بھی دعوتیں ہوتی ہیں دوپہر ہی کے کھانے پر ہوتی ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں اور بھی متعدد اصحاب مدعو تھے، جن میں اکثر ان کے شاگرد اور عقیدت مند تھے۔ کھانا بالکل سادہ اور عربی انداز کا تھا۔ یہاں علماء کی سادگی اور امراء کی شان و شوکت دونوں قابلِ دید ہیں۔ اکثر علماء اب تک بڑی سادہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خصوصاً شیخ عبدالعزیز بن باز تو نہایت ہی سادہ رہتے ہیں۔ البتہ بعض علماء اب آہستہ آہستہ امیرانہ شان کی طرف پیش قدمی کرنے لگے ہیں۔

عصر کے بعد ہم اپنے ہوٹل واپس آئے، خیال تھا کہ کچھ دیر آرام کیا جائے، مگر فوراً ہی کلیتہ الشریعہ کے چند طلبہ آ گئے اور مختلف علمی مسائل پر مولانا سے گفتگو کرتے رہے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ عرب قومیت کا زہر نہ صرف ریاض کی یونیورسٹی، بلکہ کلیتہ الشریعہ تک میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک طالبعلم نے مولانا کو عرب قومیت کے خلاف لکھا ہوا اپنا ایک مضمون بھی سنایا اور مولانا سے اس کے سلسلے میں مشورہ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دو صاحب حضرموت کے اور ایک صاحب انڈونیشیا کے بھی آ گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد نو کے قریب پاکستانی حضرات تشریف لائے جو ان دنوں تعلیم یا معاش کے سلسلے میں

ریاض میں قیام پذیر ہیں۔ ہمارا کمرہ پوری طرح بھر گیا، کچھ دیر تو ہم ان کے ساتھ بیٹھے، لیکن مغرب کے بعد ہی چونکہ ہمارا پروگرام شیخ عبداللطیف بن ابراہیم اور امیر عبداللہ بن عبدالرحمان کے ہاں جانے کا تھا، اس لیے ہم نے ان لوگوں کو شکریہ اور معذرت کے ساتھ رخصت کر دیا۔

پہلے ہم لوگ شیخ عبداللطیف کے ہاں حاضر ہوئے۔ ان سے کلیۃ الشریعہ کے نظامِ تعلیم اور اساتذہ کے متعلق گفتگو رہی۔ کلیۃ الشریعہ کا نصاب دینے کا انہوں نے وعدہ کیا، مگر بعد میں شاید وہ بھول گئے اور ہمیں بھی یاددہانی کرانے کا موقع نہ مل سکا، اس لیے ہم یہ نصاب حاصل نہ کر سکے۔

امیر عبداللہ بن عبدالرحمان

اس کے بعد ہم امیر عبداللہ بن عبدالرحمان کے ہاں پہنچے۔ وہ اپنے قصر پر موجود تھے اور انہوں نے نہایت تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ نہایت باعلم اور مطلع قسم کے آدمی ہیں اور اخبارات اور کتابوں کا برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی ذاتی لائبریری بڑی وسیع ہے اور اس میں برابر اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے مولانا کی چند کتابیں پہلے سے پڑھی ہوئی تھیں۔، بقیہ کتابوں کے مطالعہ کا انہوں نے شوق ظاہر فرمایا اور ہم نے ان سے عربی کتابوں کا ایک مکمل سیٹ دینے کا وعدہ کیا (جسے اگلی ملاقات پر ہم نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا) گفتگو کے دوران میں درعیہ کا ذکر آیا، تو انہوں نے فرمایا کہ ”درعیہ یہاں سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں میرا اپنا قصر ہے، اس لیے میں آپ لوگوں کو پرسوں وہاں آنے اور شام تک وہیں ٹھہرنے کی دعوت دیتا ہوں، تاکہ آپ لوگ درعیہ کی تباہی کے آثار بھی دیکھ سکیں اور میرے باغ کی سیر بھی کر سکیں۔“ ہم نے بخوشی اس دعوت کو قبول کر لیا۔

عشاء کے بعد ہم شیخ عمر بن حسن کے ہاں حاضر ہوئے۔ دوسرے علماء کی نسبت سے ان کا مکان پختہ اور شاندار ہے اور کسی گلی میں ہونے کے بجائے ایک بڑی سڑک کے

کنارے واقع ہے۔ اس وقت ان کے پاس محکمہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سپاہیوں کا ایک دستہ موجود تھا اور غالباً وہ ان کی دن بھر کی کارروائی کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہیں رخصت کر دیا۔ گفتگو میں وہ مولانا کے کارناموں ۔۔۔۔۔ بقول ان کے ''جہاد'' ۔۔۔۔ کی مناسبت سے صحابہ کرام اور سلف صالحین کے فضائل اور مجاہدین کے اَجرِ اعظیم کا ذکر فرماتے اور مولانا کو بار بار دعائیں دیتے رہے۔ پھر ان کی گفتگو کا رخ تقلید کی مذمت اور اس کے رد میں ائمہ اربعہ کے اقوال کی طرف پھر گیا۔ خوشی ہوئی کہ یہ لوگ کم از کم نظری لحاظ سے تو تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ خواہ عملاً حنبلی علما ہی کی قدیم کتابیں پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور ان کا دائرۂ علم ان ہی تک محدود ہے۔ دراصل ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ ہم امام احمد بن حنبلؒ کی تقلید نہیں کرتے بلکہ ان کا اتباع کرتے ہیں اور اگر کبھی ان کا یا امام ابن تیمیہؒ وابن قیمؒ کا کوئی قول حدیث کے خلاف محسوس کرتے ہیں تو اسے ترک کر دیتے ہیں۔ خود امام ابن قیمؒ نے اپنی کتاب ''اعلام الموقعین'' میں اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اپنی بعض کتابوں میں ائمہ کی تقلید سے منع کرتے ہوئے ان کے اتباع کی دعوت دی ہے۔

استاد حمد الجاسر کی لائبریری

اگلے دن (22 نومبر) کو علی الصباح استاد حمد الجاسر ہمارے ہوٹل تشریف لائے اور ہمیں ایک ٹیکسی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ وہاں دو کمروں میں نہایت قیمتی کتابوں پر مشتمل ان کی ذاتی لائبریری تھی۔ وہاں ان کی عالمانہ شان دیکھنے میں آئی۔ کتابیں دکھانے لگے تو انہیں کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ اپنے زنان خانہ سے چائے لائے، لیکن اسے درمیان ہی میں رکھ دیا اور کتابوں کے دیکھنے دکھانے میں غرق ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈی ہو گئی، بلکہ کتاب گرنے سے ایک پیالی ٹوٹ بھی گئی۔ مگر انہوں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ کسی مقام کے متعلق ہم سوال کرتے تو وہ فوراً بتاتے کہ یہ مقام کہاں واقع ہے۔ اس کا پرانا نام کیا تھا اور اب کس نام سے مشہور ہے۔ اگر کبھی کسی مقام کے متعلق شبہ ہوتا تو متقدمین کا کوئی شعر پڑھتے اور اس سے اس مقام کی تحقیق کر لیتے۔ تین گھنٹے تک ہم ان کے پاس رہے، مولانا نے عرب کے مختلف مقامات و آثار کے متعلق ان سے معلومات حاصل

کیں۔ کچھ مجھے کاپی پر نوٹ کرادیں اور کچھ اپنے نقشے پر پنسل سے درج کر لیں۔ فارغ ہونے کے بعد ہم نے ان سے اجازت چاہی تو وہ ہمیں دور تک پیدل چھوڑنے آئے۔

ظہر کے بعد شیخ عبدالعزیز بن باز کے ایک شاگرد شیخ محمد حسن کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ شیخ عبدالعزیز اور ان کے تمام شاگرد اور عقیدت مند بھی مدعو تھے۔ شیخ محمد حسن فلسطینی مہاجر ہیں اور نابلس کے قریب کے رہنے والے ہیں۔

امیر مساعد بن عبدالرحمان

اس کے بعد ہم استاذ عبدالحکیم عابدین کے ساتھ امیر مساعد بن عبدالرحمان سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ امیر مساعد مولانا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ پہلے سے مولانا کو اچھی طرح جانتے تھے۔ 49ء میں حج کے موقع پر یہ مکہ معظمہ میں موجود تھے۔ حج سے پہلے ایک دن انہوں نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو بڑے شوق سے اپنی جائے قیام پر بلایا اور ان سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے متعلق تفصیلی گفتگو کی۔ مولانا مسعود عالمؒ نے انہیں جماعت کی وہ تمام کتابیں بھی پیش کیں، جو اس وقت تک چھپ چکی تھیں۔ اب کی مرتبہ انہوں نے مزید کتابوں کی فرمائش کی، جن کے مہیا کرنے کا ہم نے وعدہ کیا (اور اگلی ملاقات پر ان کی خدمت میں پیش کر دیں)۔ امیر مساعد نے بتایا کہ جب شاہ سعود پاکستان گئے تھے اس وقت میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس وقت مولانا جیل میں تھے۔ شاہ سعود نے مسٹر غلام محمد گورنر جنرل سے مولانا کو رہا کرنے کی سفارش کی، مگر انہوں نے یہ جواب دیا کہ مولانا معافی مانگ لیں تو ہم انہیں رہا کر دیں، مگر چونکہ مولانا نے معافی نہیں مانگی، اس لیے رہائی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد امیر مساعد نے مولانا کو ان کی ثابت قدمی پر داد دی اور ان کے لیے خدا کے ہاں اجر کی دعا کی۔ انہوں نے فرمایا کہ معافی مانگ لینے کا مطلب تو یہ ہوتا کہ مولانا اپنے آپ کو مجرم تسلیم کر لیتے۔ ہمارے سفر کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو امیر نے ہمیں یقین دلایا کہ سفر میں سہولتوں اور تمام مقامی امراء کو ہدایات کے سلسلے میں جو کچھ ممکن ہے اس میں وہ اور سعودی حکومت کے دوسرے کارکن کوتاہی نہ کریں گے۔

امیر مساعد دیکھنے میں بالکل نوعمر نظر آتے ہیں۔ داڑھی صاف کرتے ہیں، اس لیے

ان کی عمر کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ ان کے جسم کی ساخت ہی ایسی ہو یا واقعی ان کی عمر کم ہو، کیونکہ ان کے والد عبدالرحمان بن فیصل کا انتقال 32ء میں ہوا ہے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہم نے اجازت چاہی اور ہوٹل واپس آ گئے۔

عصر کے بعد ہفوف کے مشائخ کے چار صاحبزادے مولانا سے ملاقات کے لیے ہوٹل تشریف لائے۔ انہوں نے مولانا کی اکثر عربی کتابیں پہلے سے پڑھ رکھی تھیں، اس لیے ان سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہفوف کے علماء کو مولانا کی آمد کا سخت انتظار رہا، لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مولانا سیدھے ریاض پہنچ گئے تو انہیں سخت افسوس ہوا۔ مولانا سے ان صاحبزادوں کی گفتگو کچھ تو ہفوف کے آثار کے متعلق رہی اور کچھ کتاب ''پردہ'' کی مناسبت سے عرب ممالک میں بے پردگی کی رو کے متعلق۔ الحمد للہ پردہ کے مسئلہ میں نجد کے علماء مولانا کی رائے سے متفق ہیں، ورنہ دوسرے عرب ممالک کے علماء نے تو اس مسئلہ میں عملی تو عملی فکری اعتبار سے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

مغرب کے بعد کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کا ایک جم غفیر آ پہنچا جس میں کچھ طلبہ پاکستان و ہندوستان کے بھی تھے۔ طلبہ اور مشائخ کی آمد نے ہوٹل کے مالک کی بھی آنکھیں کھول دیں۔ شروع میں ایک آدھ دن اس نے ہمیں کوئی اہمیت نہ دی تھی، لیکن اب وہ ہمارا بہت ہی خیال رکھنے لگا۔ اس نے ہمارے کمرے میں بہت سی مزید کرسیوں کا اضافہ کر دیا، لیکن آنے والوں کے لیے وہ بھی ناکافی تھیں۔ بہت سے طلبہ کو چارپائیوں پر بیٹھنا پڑا۔

شیخ عبداللہ بن خمیس

عشاء کے بعد شیخ عبداللہ بن خمیس بھی تشریف لائے، جو ان دنوں ریاض کے ایک بڑے عدالتی عہدہ دار تھے اور اب نائب وزیر مقرر ہو گئے ہیں۔ ادب سے انہیں خاصی دلچسپی ہے اور ادبی موضوعات پر ان کی بعض کتابیں بھی ہیں۔ فقہ اور تاریخ و جغرافیہ پر بھی ان کی اچھی نگاہ ہے۔ درعیہ کے رہنے والے ہیں اور اب بھی اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔ مولانا سے مختلف فقہی اور تاریخی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ پاکستان اور کشمیر کے حالات پر بھی بعض سوالات کیے۔ مولانا کے جوابات کا ان پر اور تمام طلبہ پر اچھا اثر رہا۔ رات کے

بارہ بجے کے بعد یہ حضرات واپس تشریف لے گئے، یہاں تک کہ ہمیں درمیان میں کھانا کھانے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد کہیں کھانا کھایا۔

درعیہ

23 نومبر کی دوپہر 11 بجے ہمارا پروگرام درعیہ جانے کا تھا۔ امیر عبداللہ کی گاڑی ہمیں لینے کے لیے ہوٹل پر آ گئی۔ امیر خود صبح ہی درعیہ روانہ ہو گئے تھے۔ ہم جس موٹر سے روانہ ہوئے، اسے ان کے سیکرٹری کمال انجم چلا رہے تھے، جو ایک فلسطینی مہاجر ہیں اور گزشتہ آٹھ نو سال سے امیر عبداللہ کے ہاں ملازم ہیں۔ غالباً بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لیے عام عربوں کی بہ نسبت انگریزی اچھی بولتے ہیں۔

وادیٔ حنیفہ اور مُسیلمہ کذّاب کا وطن

ریاض سے درعیہ تک سڑک پختہ اور بہت عمدہ ہے۔ ریاض سے نکلتے ہی ہم وادیٔ حنیفہ میں پہنچے جو سنا ہے کہ ڈیڑھ سو میل کے لگ بھگ لمبی ہے۔ یہ وہی وادی ہے جو قبیلہ بنو حنیفہ کا مسکن رہی ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام وادیٔ حنیفہ ہے۔ اسی وادی میں ریاض سے تقریباً 45 اور درعیہ سے تقریباً 30 میل کے فاصلہ پر عَقْرباء نامی ایک جگہ ہے جہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حضرت خالدؓ بن ولید اور مُسیلمہ کذاب کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ اس خونریز جنگ میں جو صحابہ کرامؓ شہید ہوئے، ان کی قبریں اب بھی وہاں پائی جاتی ہیں۔ عقرباء ہی کے ایک حصہ کا نام جبیلہ ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں سب سے پہلے مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس سے جنوب مغرب کی طرف چند میل کے فاصلہ پر ایک مقام عُیَینہ ہے جو مُسیلمہ کذاب کی جائے پیدائش ہے۔ ہم ان تاریخی مقامات کو دیکھنے کی شدید خواہش رکھتے تھے، مگر وہاں کا راستہ بالکل کچا تھا اور پچھلے دو دنوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وادیوں میں پانی بہنے لگا تھا اور راستے خراب ہو گئے تھے۔ اس لیے ہم ان مقامات کو دیکھنے کا پروگرام نہ بنا سکے۔

درعیہ کے تاریخی آثار

12 بجے کے قریب ہم درعیہ پہنچ گئے، یہ بڑی ہی سرسبز و شاداب جگہ ہے اور اس میں کھجور کے متعدد باغ پائے جاتے ہیں۔ جو سب کے سب کنوؤں کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ 1818ء تک یہی جگہ آلِ سعود کا پایۂ تخت اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوتِ اصلاح وتجدید کا مرکز رہی ہے، لیکن 1818ء میں مصر کے ترکی گورنر محمد علی پاشا کی بیوی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے حملہ کر کے اسے بالکل تباہ کر دیا، یہاں تک کہ آلِ سعود کو یہاں سے بھاگ کر ریاض کو اپنے مرکز بنانا پڑا۔ دور سے ساری بستی کھنڈروں اور مٹی کے بڑے بڑے ڈھیروں کا مجموعہ نظر آ رہی تھی۔ ہم نے وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کی تباہی کے آثار کا مشاہدہ کیا۔ ساری بستی میں صرف چند بکھرے ہوئے گھر آباد ہیں، باقی ساری بستی ویران پڑی ہے۔ امراء آلِ سعود کے محلات کی دیواریں اپنے دروازوں اور کھڑکیوں سمیت اب تک قایم ہیں اور ان میں بعض کافی بلند ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ دیواریں کچی ہونے کے باوجود اب تک کیونکر قائم ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ اس علاقہ کی مٹی بڑی مضبوط ہے اور بارش یہاں کم ہوتی ہے۔ ایک جگہ کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہاں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی مسجد تھی۔ چودھری صاحب نے اس مسجد کے اور امراء آلِ سعود کے محلات کے چار فوٹو لیے۔

اس کے بعد ہم امیر عبداللہ کے قصر پہنچے۔ امیر اور ان کے ساتھ استاذ عبدالحکیم عابدین موجود تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے مولانا سے تعارف و ملاقات کے لیے درعیہ کے بہت سے شیوخ کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ جن میں شیخ عبداللہ بن خمیس بھی تھے۔ ہندوستان و چین کے تعلقات اور کشمیر کے بارے میں پنڈت نہرو کی پالیسی پر گفتگو ہوتی رہی۔ پاکستان کے مذہبی فرقوں، خصوصاً شیعہ حضرات کے متعلق بھی یہ لوگ بڑے سوالات کرتے رہے۔

عرب قومیت کا فتنہ

3 بجے کے قریب دوپہر کا کھانا ہوا۔ بالکل مغربی طرز پر۔ مولانا نے کھانے کے

دوران اپنی گفتگو میں عرب قومیت کے فتنہ کی خوب خبر لی اور ان لوگوں کو بتایا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان کا معاملہ، عربوں کے ساتھ اسرائیل کے معاملہ سے کسی طرح کم یا مختلف نہیں ہے، لیکن عرب قومیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آپ کے اس ملک میں پنڈت نہرو آئے تو یہاں کے بہت سے اخبارات نے انہیں رسول السلام (امن کا پیامبر) کا لقب دیتے ہوئے ان کا شان دار استقبال کیا، لیکن آپ ہی بتائیں کہ اگر پاکستان کے لوگ بن گوریوں۔۔۔ وزیر اعظم اسرائیل۔۔۔ کو اپنے ہاں بلوائیں اور پھر اس کا اسی شان سے استقبال کریں، تو آپ لوگوں کی کیا کیفیت ہو؟ امیر عبداللہ نے اس بات کی مذمت کی کہ واقعی بعض عرب حکومتیں ہندوستان کو پاکستان پر ترجیح دیتی ہیں، لیکن اپنی مملکت کے متعلق انہوں نے بتایا کہ یہاں بہرحال پاکستان کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔

کھانے کے بعد ہم نے امیر عبداللہ کے باغ کی سیر کی۔ کھجوروں کا سرسبز و شاداب باغ تھا، جس میں کھجور کے علاوہ مالٹے اور سنگترے کے بھی درخت تھے۔ انگور بھی تھے۔ نارنگی کو یہ لوگ ''یوسف آفندی'' کہتے ہیں۔ آفندی ترکی لفظ ہے جو ہر اسم علم کے بعد اسی طرح استعمال ہوتا ہے، جس طرح اردو میں، صاحب، یا ہندی میں بابو۔ اردن، شام اور مصر میں بھی نارنگی کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ غالبًا ''یوسف'' نامی کوئی صاحب ہوں گے جو پہلی مرتبہ نارنگی کا درخت ان ممالک میں لائے۔

عصر کے قریب ہم ریاض واپس ہوئے۔ راستہ میں کمال النجم کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ عرب قومیت سے متاثر ہیں۔ مولانا نے ان سے فرمایا کہ سنائیے آپ کے ہاں فلسطین میں عرب عیسائیوں کا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ یہودی اور عرب علاقے کے درمیان بڑی سہولت سے آتے جاتے ہیں، جب کہ مسلمان عربوں کے لیے اُدھر جانا اور یہودیوں کے لیے اِدھر آنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مولانا نے دریافت فرمایا: ''آپ لوگ توقع رکھتے ہیں کہ اگر کبھی عربوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے، تو یہ عیسائی عربوں کا ساتھ دیں گے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ اس میں شک ہی ہے۔ مولانا نے فرمایا: ''مگر عالم اسلامی کے غیر عرب مسلمانوں میں سے ہر شخص آپ کا ساتھ دے گا۔'' اس پر استاذ کمال النجم نے کچھ کہا تو نہیں، مگر امید ہے کہ انہوں نے

محسوس کرلیا ہوگا کہ ہمارے عرب بھائی کس کی خاطر کس کی ہمدردی کھو رہے ہیں[1]۔

کتابوں کا قیمتی ہدیہ

عشاء کے بعد ہم استاذ عبدالحکیم عابدین کے ساتھ مفتی اکبر کے بڑے صاحبزادے شیخ عبدالعزیز بن محمد کے ہاں گئے۔ انہوں نے ہمارے لیے پھلوں کی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ ریاض میں زیادہ تر پھل لبنان سے ہوائی جہاز کے ذریعے آتے ہیں۔ یہ لوگ دوپہر کا کھانا چونکہ بہت دیر سے کھاتے ہیں، اس لیے رات کو پھلوں وغیرہ کا ناشتہ کر لیتے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بن محمد کے ہاں بعض اور لوگ بھی موجود تھے۔ سعودی عرب میں بادشاہ اور دوسرے امراء کے خرچ پر حدیث، عقائد اور فقہ کی بہت سی کتابیں شایع کی گئی ہیں۔ شیخ عبدالعزیز ان کی اشاعت کے انچارج ہیں۔ انہوں نے مولانا کو اِن کتابوں کا ایک ایک نسخہ ہدیۃً عنایت فرمایا جس پر مولانا نے شیخ عبدالعزیز کا اور ان کے واسطہ سے ان کے والد ماجدہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی بعض عربی کتابیں (جو اس سفر کی حالت میں ساتھ ہو سکتی تھیں) ان کی خدمت میں پیش کیں اور آئندہ وعدہ کیا کہ جب بھی کوئی نئی کتاب شایع ہو گی، ان کی خدمت میں بھیج دی جایا کرے گی۔

اگلے روز (24 نومبر) ظہر کے بعد شیخ عمر بن حسن کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ ان کے ہاں پہنچے، تو شیخ اپنے ایک بزرگ شیخ عبداللطیف کے فتاویٰ "رسائل ومسائل" پڑھ رہے تھے اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے چند حضرات کو سنا رہے تھے، کچھ دیر ہم بھی سنتے رہے۔ آخر میں شیخ نے کتاب کا وہی نسخہ جسے وہ پڑھ رہے تھے، مولانا کو بطور ہدیہ پیش کر دیا۔

سعودی حکومت کی عنایات

کھانے کے بعد ہم شیخ عبدالعزیز بن باز کی مزاج پرسی کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ "پرسوں میں نے مولانا کے متعلق شاہ سعود۔۔۔ کو جو ان دنوں

1- جون 67ء کی عرب اسرائیل جنگ نے اس حقیقت کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ (ستمبر 67ء)

دمام میں تھے۔۔۔تار دیا تھا، آج ان کا جواب آیا ہے اور انہوں نے دریافت فرمایا ہے کہ مولانا کے ساتھ کتنے آدمی ہیں اور ان کا ارادہ کن کن مقامات کو دیکھنے کا ہے؟'' شیخ نے اسی وقت ہم سے تمام مقامات کے نام معلوم کر کے بادشاہ کے تار کا جواب دے دیا۔ اسی وقت معلوم ہوا کہ قائم مقام وزیر اعظم امیر مساعد نے ہمارے متعلق وزارت داخلہ اور وزارتِ تعلیم کو تار دے دیے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ان تاروں کے نمبر اور تاریخ کا رقعہ بھی بھجوا دیا۔

عصر کے بعد شیخ عبداللہ بن خمیس کے ہاں ہماری چائے کی دعوت تھی۔ شیخ نے ہمیں اپنی دو نئی مطبوعہ کتابیں ''الادب الشعبی فی جزیرۃ العرب'' اور ''شہر فی دمشق'' بطور ہدیہ عنایت فرمائیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دو ماہ تک ان کا ارادہ ریاض سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا ہے[1]، اس کے لیے انہوں نے مولانا سے مضامین کا مطالبہ کیا۔ ہم نے وعدہ کیا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد مضامین کی ترسیل کا سلسلہ شروع کر دیں گے۔

فِلبی سے ملاقات

عشاء کے بعد امیر عبداللہ بن عبدالرحمان کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ امیر نے مولانا کے اعزاز میں بہت سے دوسرے امراء اور شیوخ کو بھی دعوت دی تھی۔ امیر عبداللہ نے اسی دوپہر کو مولانا کی کتاب ''الربا'' (سود) پڑھی تھی۔ کافی دیر تک اس کی تعریف کرتے رہے۔ سود کی حرمت پر مولانا نے انجیل سے استشہاد کیا تھا۔ اس مناسبت سے انجیل کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر ابنِ جریر کی تفسیر اور تاریخ موضوعِ گفتگو رہی۔ اندازہ ہوا کہ قدیم کتابوں کے متعلق بھی شیخ کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔

کھانے کے دوران معلوم ہوا کہ اسی میز پر مسٹر سینٹ جان فلبی (الحاج عبداللہ فلبی) بھی موجود ہیں۔ سینٹ جان فلبی مشہور انگریز مستشرق ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم سے پہلے جہلم کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ پھر 16ء میں جنگی خدمات کے سلسلے میں عراق گئے۔ عرب جغرافیہ سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔ 20ء کے لگ بھگ نجد گئے اور وہیں شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر

1- یہ رسالہ مارچ 60ء سے الجزیرہ کے نام سے جاری ہو گیا ہے اور ہمارے پاس مسلسل آ رہا ہے۔

داخل اسلام ہوئے اور مستقل طور پر ریاض میں اقامت اختیار کرلی۔ عرب جغرافیہ کے متعلق ان کی بہت سی کتابیں ہیں جو اس قدر تحقیقی شمار کی جاتی ہیں کہ مغربی ممالک میں جب تک یہ کتابیں کسی مصنف کے سامنے نہ ہوں وہ عرب جغرافیہ کے متعلق کوئی چیز نہیں لکھ سکتا۔ ہمیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ فلبی ریاض میں موجود ہوں گے، لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ امیر عبداللہ کی اس دعوت میں موجود ہیں تو ہماری نگاہیں فوراً ان کی تلاش کے لیے اٹھ گئیں وہ ہمارے قریب ہی بیٹھے تھے مگر بالکل عربی لباس میں تھے اور رنگ میں بھی انگریزوں جیسی سرخی نہ تھی۔ اچھی خاصی داڑھی بھی تھی اس لیے ہم انہیں نہ پہچان سکے۔ کھانے کے بعد امیر عبداللہ نے خاص طور سے ان کا مولانا سے تعارف کرایا اور پھر دونوں میں چند منٹ تک گفتگو ہوتی رہی۔ گفتگو عربی میں کرتے تھے اور بقول مولانا کے بالکل بدوؤں کی زبان انہی کے لہجے میں بولتے تھے۔ ان دنوں مولانا ان کی ایک تازہ مطبوعہ کتاب (In the Land of Midian) ''سرزمینِ مدین میں'' کا مطالعہ کر رہے تھے، جس میں انہوں نے مدین کی سرزمین کے حالات بیان کیے ہیں۔ اسی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ مولانا نے تفصیلی گفتگو کے لیے ان سے اگلے روز صبح کا وقت لیا۔ تاکہ سفر کے متعلق ان کی معلومات سے استفادہ کیا جا سکے۔ امیر عبداللہ اور فلبی کی مزاحیہ انداز میں خوب جھڑپ رہی۔ امیر عبداللہ نے بتایا کہ ان حضرت کی ساری کوشش یہ ہے کہ آثار کے ذریعے ان تمام چیزوں کو صحیح ثابت کیا جائے جن کا ذکر تورات اور انجیل میں آیا ہے۔ یہ نہ قرآن کو سمجھتے ہیں اور نہ حدیث کو۔ لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ یہ مجھ سے اچھی عربی جانتے ہیں، حالانکہ ان کی عربی اتنی ہی ہے جتنی میری انگریزی۔'' امیر نے ان کے جہل ۔۔۔۔ دراصل چالاکی ۔۔۔ کی دو مثالیں بھی دیں۔ ایک یہ کہ ان کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بادشاہ تھے، کیونکہ قرآن کہتا ہے: ''الم تر الی الذی حاج ابراہیم ان اتاہ اللہ الملک '' اور انجیل سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ دولتمند آدمی تھے۔ دوسرے یہ کہ بلقیس (ملکہ سبا) اور حضرت سلیمانؑ کے درمیان ہزاروں سال کا زمانہ تھا۔

تمام لوگ یکے بعد دیگرے اجازت لے کر جانے لگے تو امیر نے مولانا کو روک لیا۔ پہلے فلبی ہی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ امیر نے بتایا کہ ''ہمیں معلوم ہے کہ اس شخص

کا اسلام محض جغرافی قسم کا ہے اور اس کے خیالات ابھی تک عیسائیوں جیسے ہیں، لیکن پھر بھی ہمارا خیال نہیں ہے کہ یہ خائن یا انگریزوں کا جاسوس ہے، کیونکہ ہمارا تجربہ ہے کہ اس سے کوئی بات ہضم نہیں ہوتی، اور پھر چالیس سال کے عرصہ میں اس سے کوئی چیز ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے اس کے خائن یا جاسوس ہونے کا شبہ ہوتا ہو۔'' مولانا نے فرمایا: ''میرا خیال ہے کہ یہ شخص صرف اس لیے مسلمان ہوا ہے کہ اسے عرب جغرافیہ سے دلچسپی تھی، لیکن مسلمان ہوئے بغیر اس کے لیے جزیرۂ عرب میں گھومنا ممکن نہ تھا، اس لیے مسلمان ہوگیا۔'' مولانا نے بتایا کہ میں نے اس کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، لیکن کسی سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اسے اسلام سے بھی کوئی تعلق ہے۔ ان دنوں میں اس کی کتاب ''سرزمین مدین میں'' پڑھ رہا ہوں۔ اس میں دو تین موقعوں پر اس نے صحرا میں کرسمس منانے کا ذکر کیا ہے اور پھر یہ کہ اسکی تمام کتابیں اس کے اصل نام سینٹ جان فِلبی کے نام سے شائع ہوئی ہیں نہ کہ عبداللہ فلبی کے نام سے۔''

فِلبی کو سعودی حکومت کی طرف سے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس کے متعلق امیر عبداللہ نے بتایا کہ یہ بہت معمولی ہے اور یہ شخص فقیر ہی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ تعجب ہے۔ غالباً آپ حضرات کو یہ خیال نہیں کہ اس کی بہت سی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور ان سب کی آمدنی اسے ملتی ہے۔

سعودی عرب کے معاشی مسائل

دیر ہوگئی تھی اس لیے مولانا نے پھر اجازت چاہی، لیکن امیر نے ابھی اور بیٹھنے کی خواہش کی۔ اب کی مرتبہ گفتگو اسکندر مرزا اور ظفر اللہ خاں پر رہی۔ پھر گفتگو کا رخ سعودی عرب میں زراعت وصنعت کی طرف پھر گیا۔ مولانا نے امیر کو توجہ دلائی کہ مملکت کو کم از کم خوراک میں خود کفیل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس وقت تو، جیسا کہ ہم نے دیکھا اور سنا ہے، یہ حال ہے کہ کھانے اور پہننے کی ہر چیز حتیٰ کہ گوشت، ترکاری، انڈے، نمک اور پیاز تک باہر سے آتی ہے۔ مولانا نے اچھے انداز میں یہ بھی واضح کیا کہ صرف پٹرول کی آمدنی اور اس کے ذریعے باہر سے کھانے پہننے اور دوسرے استعمالات کا جو سامان حاصل ہو جائے،

اسی پر بھروسہ کرتے رہنا بالآخر عربوں کو بڑی پریشان کن حالت میں مبتلا کرسکتا ہے۔

امیر نے ان تمام باتوں کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ ہم نے زراعت کی ترقی کے لیے انتہائی کوشش کی ہے، بہت سے لوگوں کو زمینیں بھی دی ہیں اور انہیں ہر طرح کی سہولت پہنچانے کا انتظام کیا ہے، لیکن لوگ ہیں کہ زراعت پر محنت نہیں کرتے اور اس کے بجائے تیل کی کمپنی میں ملازمت کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ وہاں معمولی کام پر خوب آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن بہرحال ہماری کوشش جاری ہے اور اس بارے میں ہم بڑے فکرمند ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے پھر اجازت چاہی تو امیر مولانا کو قصر کے باہر تک چھوڑنے آئے اور اس وقت تک ٹھہرے رہے جب تک ہماری موٹر روانہ نہیں ہوگئی۔ استاذ عبدالحکیم عابدین نے بتایا کہ امیر عبداللہ وزیر اعظم تک کو الوداع کہنے کے لیے قصر سے باہر نہیں آتے۔ گفتگو بھی وہ بڑی محبت اور لگاؤ سے کرتے رہے۔

نظریاتی کشمکش

اسی رات ہمیں ایک اور صحبت میں عرب کی دو اہم شخصیتوں کے درمیان ایک دلچسپ اور گرما گرم بحث سننے کا اتفاق ہوا۔ جس سے سعودی عرب کے اندرونی حالات کے متعلق ہماری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ ان میں سے ایک صاحب علماء کی تعریف اور مدافعت کر رہے تھے، اور دوسرے صاحب کہہ رہے تھے کہ "ان علماء کی عام نوجوانوں کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے، نوجوان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ علماء اسلام کے صحیح نمائندہ نہیں ہیں۔" دوسری طرف سے شیخ عبدالعزیز بن باز کا نام لیا گیا۔ فریقِ مخالف نے کہا: "وہ بلاشبہ جری، مخلص اور اپنی حد تک عالم ہیں، لیکن انکا دائرۂ معلومات نہایت تنگ ہے اور یہ سوائے چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل بیان کرنے کے موجودہ زمانے کے بڑے اور اہم مسائل کا اسلامی نقطۂ نظر سے حل پیش نہیں کرسکتے۔ مانا کہ یہ تمام علماء بے ایمان نہیں، لیکن عاجز ضرور ہیں۔" پہلے صاحب کہہ رہے تھے کہ "اصلاح بہرحال ان ہی علماء کے ذریعے ہوسکتی ہے، ضرورت ان سے اچھے انداز میں کام لینے کی ہے"۔ دوسرے صاحب کہہ رہے تھے کہ "یہاں اصلاح نوجوانوں کے ذریعے ہوگی۔ اس وقت اسلام سے انحراف، بے دینی اور مغرب پرستی کی جو

روح پھیلتی جا رہی ہے اس کا مقابلہ کرنا ان علماء کے بس کا روگ نہیں۔ یہ علماء عوام کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور اس زمانے کی دوسری مفید ایجادات کے استعمال سے روکتے ہیں، حالانکہ یہ تعلیم پھیلے گی اور اس وقت یہ علماء کچھ نہ کر سکیں گے اور سوائے اس کے کہ ان کے خلاف عوام میں نفرت بڑھ جائے اور کچھ نہ ہوگا۔ دوسری طرف یہ امراء کی عیاشیوں کو دیکھتے ہیں، لیکن کچھ نہیں کر سکتے۔ شیخ عبدالعزیز بڑی ہی جرأت اور بے باکانہ انداز سے بادشاہ اور دوسرے امراء پر تنقید کرتے ہیں، لیکن بادشاہ اور بعض امراء تو بلاشبہ ان کی بڑی قدر کرتے ہیں، لیکن عام امراء اور اصحاب اقتدار خوب سمجھتے ہیں کہ ان کی گرمی اور تنقید کا وزن کیا ہے، اس لیے وہ ان کو خوش کرنے کے لیے بس چھوٹے چھوٹے معاملات میں ان کی باتوں کو مان لیتے ہیں۔"

ان دونوں صاحبوں کی زبانی ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی پریشانی ہوئی کہ یہاں کے امراء میں سے امیر عبداللہ بن عبدالرحمان اور مساعد بن عبدالرحمٰن کو چھوڑ کر قریب قریب سب ہی کے گھروں میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو اس زمانہ کے کسی مغرب زدہ گھرانے میں ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے بیٹے اور بیٹیاں انگریزی اور فرنچ پڑھتی اور بولتی ہیں۔ گھروں میں عورتوں کے لباس اور وضع قطع پوری طرح مغربی ہیں۔ بعض تو اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کے بیٹے اور بیٹیاں امریکہ ہی میں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور ان کی استانیاں اور نگران سب کی سب امریکن ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ نئی پود جب بڑھے گی اور اقتدار کی باگیں اس کے ہاتھ میں آئیں گی تو ملک کا کیا حال ہوگا۔

11 بجے کے قریب ہم ہوٹل واپس آئے اور بڑی دیر تک اس صورتِ حال پر افسوس کرتے رہے۔

فِلبی سے دوسری ملاقات

اگلے دن (25 نومبر) صبح دس بجے ہم سینٹ جان فِلبی سے ملاقات کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ قدیم ریاض کی ایک گلی میں ان کا مکان تھا۔ اگرچہ دو منزلہ تھا، لیکن بہت پرانا اور بوسیدہ۔ اس میں وہ بالکل عربوں کی طرح رہتے تھے۔ معاشرت میں انگریزیت کا

کوئی رنگ نظر نہیں آتا تھا، ہمیں انہوں نے اپنی لائبریری میں بٹھایا اور کافی دیر تک مختلف کتابیں دکھاتے رہے۔ انگریزی رسالوں میں ان کے جو تازہ مضامین شائع ہوتے تھے وہ بھی ہمیں دکھاتے رہے۔ اب کی مرتبہ گفتگو انگریزی میں ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے بتایا کہ ابھی چند سال ہوئے انہوں نے مدین کے علاقہ کا جو دورہ کیا تھا، اس کے لیے مرحوم شاہ عبدالعزیز (موجودہ فرمانروا شاہ سعود کے والد) نے پندرہ ہزار ریال دیے تھے اور ایک جیپ اور ایک کار کا بھی انتظام کیا تھا۔ انہوں نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ بھی بیان کیا اور وہ اس طرح کہ وہ جہلم میں ڈپٹی کمشنر تھے، اپنے دفتر کے ایک حافظ صاحب (جن کا انہوں نے نام بھی بتایا تھا، مگر میں بھول گیا) سے انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور اس طرح انہیں اسلام سے متعلق مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ کیمبرج میں پنڈت نہرو کے کلاس فیلو رہے ہیں۔ پھر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی اور سفر کے سلسلہ میں انہوں نے بعض مفید مشورے دیے۔ انہوں نے مولانا اور چودھری صاحب کے پتے بھی اپنے پاس نوٹ کیے کہ شاید کبھی پاکستان آنا ہو تو ملاقات ہو سکے[1]۔

عربی کھانے

ظہر کے بعد مفتی اکبر کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ تین بجے کے قریب ہم ان کے ہاں پہنچے۔ مفتی صاحب نے دعوت کا خاص اہتمام کیا تھا اور آلِ الشیخ کے تقریباً سب ہی مشائخ کو مدعو کیا تھا، جن میں ان کے بڑے بھائی شیخ عبداللہ بن ابراہیم (جو نابینا ہیں اور بہت ضعیف ہونے کی وجہ سے ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے) بھی شامل تھے۔ پہلے ایک کمرے میں نشست رہی۔ پھر کھانے کے لیے دوسرے کمرے میں گئے۔ وہاں ایک بہت بڑی سینی میں چاولوں پر پورا بکرا سالم پکا کر رکھا ہوا تھا۔ مولانا نے تعجب سے پوچھا کہ پورا سالم بکرا کیسے پکا لیا جاتا ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ سالم بکرا پکا لینا تو کوئی چیز

1- اس کے بعد 62ء میں فلبی کا بیروت میں انتقال ہوگیا۔ رحمۃ اللہ علی کل حال۔

ہی نہیں، ابھی دو سال ہوئے حجاز کے کسی مقام پر بادشاہ کی دعوت میں ایک سوڈانی باورچی نے سالم اونٹ پکا کر پیش کیا تھا۔ مولانا نے فرمایا: ''اگر ہاتھی حلال ہوتا تو عرب کے باورچی شاید اسے بھی مسلّم پکا ڈالتے۔'' مفتی صاحب نے فرمایا: ''جی ہاں، ہمارے ہاں نجد میں بعض دیگیں اتنی بڑی ہیں کہ ان میں تین اونٹ ایک ساتھ پکائے جا سکتے ہیں۔'' مولانا نے فرمایا: ''غالباً یہ دیگیں حضرت سلیمانؑ کے وقت سے چلی آ رہی ہوں گی۔'' اس دعوت میں ایک اور لطیفہ یہ رہا کہ استاذ عبدالحکیم عابدین دسترخوان پر مولانا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ عربوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے مہمان کے سامنے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ڈالتے رہتے ہیں۔ استاذ عبدالحکیم عابدین نے بکرے کی سری سے آنکھ نکالی اور مولانا سے پوچھنے لگے کہ کیا آپ اسے کھانا پسند فرمائیں گے؟ مولانا نے جھرجھری لی اور یہ تحفہ لینے سے معذوری ظاہر کی۔ معلوم ہوا کہ عربوں کے ہاں آنکھ کو بڑا ہی مزے دار تصور کیا جاتا ہے اور اسے بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ ہمارے لیے یہ چیز بڑی حیرت انگیز تھی۔

کھانے کے بعد پھر نشست رہی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس مجلس میں مفتی صاحب نے بھی یہ بات دہرائی کہ اگر ابن تیمیہؒ اور محمد بن عبدالوہابؒ کا کوئی قول حدیث کے خلاف ہوتا ہے، تو ہم اسے ترک کر دیتے ہیں۔

عرب میں لونڈی، غلاموں کی خرید و فروخت

عصر کے بعد ہندوستان کے چند طلبہ نے جو ریاض کے کلیۃ الشریعہ یا اس کے معہد میں پڑھتے ہیں۔ ہمیں اپنے ہاں چائے پر بلایا۔ اس وقت سخت بارش ہو رہی تھی، لیکن یہ حضرات ہمیں لینے کے لیے بر وقت پہنچ گئے۔ ہمیں قدیم ریاض کی ایک گلی میں جانا تھا۔ بارش میں تمام گلیوں کا بہت برا حال تھا اور پرنالوں سے پانی گزرنے والوں کے سروں پر گر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے۔ نہایت خستہ اور تنگ و تاریک قسم کا مکان تھا۔ معلوم ہوا کہ کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کے لیے قیام کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں ہے، اپنے طور پر جو طالبعلم جہاں انتظام کر سکتا ہے کر لیتا ہے۔ ریاض کے بہت سے لوگوں نے نئے محلوں میں پختہ مکان بنا لیے ہیں اور اپنے پرانے کچے مکانات وقف کر دیے ہیں۔ عموماً

طلبہ کا قیام ان ہی مکانوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جس مکان میں ہم پہنچے تھے، وہ بھی اسی قسم کا مکان تھا۔ وہاں طلبہ کے علاوہ شیخ عبدالرزاق عفیفی سے بھی ہماری ملاقات ہوئی ۔ ان سے تسرّی ۔۔۔ یعنی لونڈیوں ۔۔۔۔۔ کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ سعودی عرب میں اس زمانہ میں بھی غلاموں اور لونڈیوں کا رواج ہے۔ شیخ عفیفی نے بتایا کہ یہاں جو غلام اور لونڈیاں آتی ہیں وہ یا تو مسقط اور عمان کی طرف سے آتی ہیں یا لبنان کی طرف سے ۔ انکے جواز کی وجہ صرف یہ بیان کی جاتی ہے کہ لونڈی یا غلام ۔۔۔ آ کر یہ کہتی ہے کہ ''میں لونڈی ہوں اور میرے آباؤ اجداد قدیم زمانہ سے غلام چلے آتے ہیں۔'' اس کے صرف اس بیان پر اسے خرید لیا جاتا ہے اور اس کے لانے والے سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ وہ اِسے کیسے لایا ہے، وہ اسے لالچ دے کر بھی لاسکتا ہے۔ ڈرا کر بھی لاسکتا ہے اور اس کے ماں باپ سے خرید کر بھی لاسکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی لونڈی ۔۔۔ یا غلام ۔۔۔ کہہ دے کہ مجھے زبردستی لونڈی یا غلام بنایا گیا ہے تو اسے آزاد کر دیا جاتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ''آخر وہ یہ بات کیسے کہہ سکتی ہے؟ آزاد ہو کر وہ تنہا جائے گی کہاں؟'' اس پر شیخ عفیفی خاموش ہوگئے ۔ انہوں نے پھر بتایا کہ لونڈیوں کے جواز پر بعض لوگ فقہا کی کتابوں سے یہ مسئلہ بھی نکالتے ہیں کہ کافر کو فروخت کیا جاسکتا ہے، کافر خود بھی اپنے آپ کو فروخت کر سکتا ہے اور اپنے بیٹے یا بیٹی کو بھی فروخت کرسکتا ہے۔ لہٰذا اسے یا اس کے بیٹے یا بیٹی کو خریدا جاسکتا ہے، گویا حط فی عنق الفقیہ تخرج سالماً (الا بلا برسرِ ملّا) والا معاملہ ہے[1]۔

عشاء کے بعد ہم شیخ سلیمان العبید رئیس محکمۃ الکبریٰ (جج ہائی کورٹ) کے ہاں کھانے پر گئے۔

اگلے دن (26 نومبر) ہم شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں صبح کے ناشتہ پر گئے۔ شیخ نے

1۔ اب سعودی عرب میں تسری کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ 49ء میں اس موضوع پر مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی مفتی اکبر شیخ محمد ابراہیم سے بھی گفتگو ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو ''دیار عرب میں چند ماہ''۔ صفحہ 220۔

مولانا کی بعض کتابیں پڑھ لی تھیں۔ بڑی دیر تک ان کی تعریف کرتے رہے اور اس سلسلہ میں ہر ممکن تعاون کا بھی وعدہ کرتے رہے۔

9 بجے (صبح) کے قریب ہم استاذ حمد الجاسر سے ملاقات کے لیے ان کے پریس گئے۔ بارش ہو رہی تھی۔ گلیوں کا بُرا حال تھا۔ بعض جگہوں پر تو ہماری موٹر پھنستے پھنستے بچی۔

10 بجے ہمارا پروگرام شیخ سلیمان العبید کی دعوت پر ان کے محکمہ (عدالت) جانے کا تھا، مگر ہمیں بارش کی وجہ سے استاذ حمد الجاسر کے پریس میں دیر ہو گئی۔ شیخ کی گاڑی ہوٹل آ کر واپس چلی گئی۔ ہم چاہتے تھے کہ عدالت جا کر سعودی نظام عدالت کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ مگر افسوس کہ بارش نے یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

سرکاری دفاتر میں نماز کی پابندی

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میں تنہا وزارتِ تعلیم کے دفتر گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ وزارتِ تعلیم سے ایک تو جزیزہ عرب کے متعلق کچھ نقشے حاصل کیے جائیں اور دوسرے یونیورسٹی کے تحت چلنے والے کالجوں اور سکولوں کا نصاب۔ شیخ عبدالعزیز بن حسن (سیکرٹری وزارتِ تعلیم) موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ماتحتوں کو یہ دونوں چیزیں فراہم کرنے کا حکم دیا۔ مگر انہوں نے لانے میں بڑی دیر کر دی۔ اس اثناء میں نماز ظہر کا وقت ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہیں دفتر میں ایک شخص نے اذان دی اور تمام لوگ کام چھوڑ کر ایک وسیع کمرے میں پہنچ گئے، جو نماز کے لیے مخصوص تھا اور اس کے دروازے پر خوبصورت خط میں ''المسجد'' لکھا تھا۔ شیخ عبدالعزیز نے جماعت کرائی اور نماز کے بعد تمام لوگ واپس آ کر اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ شیخ عبدالعزیز جامعہ ازہر کلیۃ اصول الدین College of Theocracy کے فارغ التحصیل ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، حرم مکی کے خطیب اول بھی ہیں۔

نجد کی عامی زبان

ہمارا دوپہر کا کھانا ریاض کے ایک تاجر شیخ محمد بن عبدالرحمان الشویعر کے ہاں تھا۔

بے چاروں نے بڑا اہتمام کیا تھا، مگر دوسرے تمام حضرات نے ایک دوسری جگہ دعوت کی وجہ سے معذرت کردی تھی۔ استاذ عبدالحکیم عابدین اسی روز اسی وقت ہوائی جہاز سے جدہ روانہ ہورہے تھے۔ بارش بھی ہورہی تھی، اس لیے دعوت میں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا آدمی نہ تھا، شیخ شویعر سے افہام وتفہیم میں ہمیں جو دقت پیش آئی، وہ یاد ہی رہے گی۔ اب تک ہمارا واسطہ یاتو شیوخ سے پڑا تھا یا کلیۃ الشریعہ کے طلبہ واساتذہ سے، اور یہ سب فصیح زبان بولتے تھے، اس لیے ان سے افہام وتفہیم میں کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ شیخ شویعر کی زبان میں ایک تو لکنت تھی، دوسرے وہ نجد کی ٹھیٹھ عامی زبان استعمال کررہے تھے۔ ہم نے ان سے عرض بھی کیا کہ ہم عامی زبان سمجھ نہیں سکتے، مگر شاید وہ بھی ہماری بات نہ سمجھ سکے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی گفتگو میں سوائے اس کے کہ ہم ان کی باتوں کا ''نعم'' یا ''لا'' میں جواب دیتے رہیں، ان سے کوئی گفتگو نہ کرسکے۔ نجد وحجاز کی عامی زبان اگرچہ مصر، شام، عراق اوراردن کے مقابلے میں بڑی حد تک قابلِ فہم اور اقرب الی الفصحیٰ ہے، مگر پھر بھی اس کا اس وقت تک پوری طرح سمجھنا مشکل ہے، جب تک آدمی چند ماہ وہاں رہ نہ لے۔

شیخ عبداللہ المسعری

مغرب کی نماز کے بعد ہم شیخ عبداللہ المسعری کے ہاں کھانے پر گئے وہاں ان کے دوست استاذ سعید الجندل سے بھی ملاقات ہوئی، جو مکہ کے ہائی سکول المعہد العلمی السعودی کے انچارج ہیں۔ ان دنوں اپنے کسی کام کے سلسلے میں ریاض آئے ہوئے تھے، وہ بڑی دیر تک ریاض اور مکہ معظمہ کے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دین سے غفلت بلکہ بے راہ روی وبے زاری کی شکایت کرتے رہے۔

شاہ سعود کی مہمان نوازی

عشاء کے بعد شیخ عبدالعزیز بن باز ہوٹل تشریف لائے۔ دن میں ان کے نام ونام سے شاہ سعود کا ایک تار آیا تھا، جس کے ذریعہ سے انہوں نے اپنے ذاتی مصارف کی مد سے ہمارے سفرخرچ کے لیے تین ہزار ریال (تقریباً چار ہزار روپے) بھیجے تھے۔ چنانچہ

شیخ عبدالعزیز اس وقت یہ رقم لے کر تشریف لائے تھے۔ ہم نے اسی وقت شاہ سعود کے نام شکریہ کا تار لکھ کر روانہ کیا۔ یہ صرف شیخ اور شاہ کے اخلاق کریمانہ کا کرشمہ تھا۔ ورنہ ہماری طرف سے کبھی اشارۃً و کنایۃً ایسی کسی خواہش کا اظہار نہ ہوا تھا۔ ہم تو اس سفر میں صرف انتظامی سہولتیں چاہتے تھے۔

ریاض میں حلقۂ اخوان

اگلے دن (27 نومبر) جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز سے کچھ پہلے شیخ مناع القطان ہوٹل تشریف لائے اور ہمیں ساتھ لے کر شرکتہ المبانی المصر یہ لے گئے، جو نئی عمارتیں تعمیر کرنے والی ایک کمپنی ہے۔ اس کے مدیر (انچارج) استاذ عبدالحکیم اور عادل مصری ہیں۔ ان کا تعلق بھی اخوان سے تھا اور اسی وجہ سے انقلاب کے بعد مصر سے ریاض آ گئے تھے۔ کمپنی کے احاطہ میں ایک چھوٹی مگر خوبصورت مسجد ہے، جس میں زیادہ تر کمپنی ہی کے مزدور اور ملازمین نماز پڑھتے ہیں۔ شیخ مناع القطان نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز پڑھائی۔ بارش کی مناسبت سے خطبہ کا موضوع یہ تھا کہ جس طرح انسان کو روئے زمین پر زندہ رہنے کے لیے بارش کی ضرورت ہے، اسی طرح اسے امن و امان کی زندگی بسر کرنے کے لیے دین کی ضرورت ہے۔ خطبہ نہایت موثر اور فصیح زبان میں تھا۔ مصری علماء کی تقریر کی زبان یوں بھی فصیح ہوتی ہے، لیکن جس شخص نے حسن البناء شہید کی صحبت بھی پائی ہو اس کی زبان میں فصاحت کے ساتھ سوز اور اخلاص کی بھی آمیزش ہو جاتی ہے۔

3 بجے شیخ عبداللطیف کے ہاں کھانے کی دعوت تھی، اس لیے نماز کے بعد ان کے ہاں حاضر ہوئے۔ واپسی پر شیخ نے مولانا کو اور مجھے بہت سی کتابوں کا تحفہ دیا۔ افسوس چودھری صاحب کی طبیعت اس روز اچھی نہیں تھی اور وہ ہمارے ساتھ دعوت میں نہ جا سکے تھے، اس لیے کتابوں کے تحفہ سے محروم رہے۔

ریاض اور مکہ کے درمیان ذرائع آمد و رفت،

ہمیں اپنے پروگرام اور ارادے کے خلاف ریاض میں کئی دن زیادہ لگ گئے تھے،

اس لیے اب ہم جلد از جلد وہاں سے مکہ معظّمہ روانہ ہونا چاہتے تھے۔ ریاض سے جدہ اگر چہ ہوائی جہاز بھی جاتے تھے، لیکن ظہران سے روانہ ہوتے وقت ہمارے ذہن میں یہ پروگرام تھا کہ ہم ریاض سے کوئی ٹیکسی لے لیں گے اور اسی سے مکہ معظّمہ جائیں گے، کیوں کہ ہم اس ملک میں محض گزر جانے کے لیے نہیں بلکہ ملک اور اس کے تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ مگر ریاض میں معلوم ہوا کہ یہاں سے مکہ معظّمہ تک کوئی پختہ سڑک نہیں ہے اور راستے میں کہیں سخت پتھریلی جگہ آتی ہے اور کہیں سخت ریتلی۔ اس لیے چھوٹی گاڑی کا تو سوال ہی نہیں کوئی بڑی گاڑی بھی مسافروں کو لے کر نہیں جاتی۔ صرف بار برداری کے ٹرک آتے جاتے ہیں، جو عموماً تین دن اور چار راتوں میں ریاض سے مکہ معظّمہ یا مکہ معظّمہ سے ریاض پہنچتے ہیں۔ یہی ٹرک سامان کے ساتھ مسافروں کو بھی لے جاتے ہیں۔ اور عموماً 40 ریال (52 روپے) فی کس کرایہ وصول کرتے ہیں۔ مقامات کو دیکھنے کے خیال سے ارادہ ہوا کہ کسی ٹرک ہی کے ذریعہ سفر کر لیا جائے۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ ٹرک عموماً رات کو چلتے ہیں اور دن میں کسی جگہ ٹھہرے رہتے ہیں، اس لیے ان کے ذریعے راستے میں کسی مقام کا دیکھنا ممکن نہیں۔ پھر ریاض اور مکہ معظّمہ کے درمیان سوائے طائف کے کوئی ایسا تاریخی مقام بھی نہیں ہے جس کا ہمارے مقصدِ سفر سے براہِ راست تعلق ہو، کیونکہ ہم تو صرف ان مقامات کو دیکھنا چاہتے تھے، جن کا تعلق قرآن مجید سے ہے، یا سیرت پاک سے۔ علاوہ ازیں ان دنوں بارش کی وجہ سے راستہ اور بھی خراب ہو گیا تھا اور کوئی ٹرک آ جا نہیں رہا تھا۔ ٹرک کے ذریعے سفر کرنے کے لیے لازماً ہمیں دو تین دن اور ریاض میں رکنا پڑتا، اس لیے احباب اور ملنے والوں کے مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ خود ہوائی جہاز کے ذریعے جدہ روانہ ہو جائیں اور پھر وہاں سے مکہ معظّمہ اور طائف چلے جائیں، اور اپنا بھاری سامان کسی ٹرک کے ذریعے مکہ معظّمہ بھیج دیں۔ مگر اس میں بھی یہ مشکل سامنے آئی کہ کوئی ٹرک والا اس وقت تک سامان لے جانے کے لیے تیار نہ تھا، جب تک اس کا مالک اس کے ساتھ نہ ہو۔ مجبوراً یہ طے کیا گیا کہ کتابیں تو ظہران بھیج دی جائیں تاکہ وہاں سے ان کو پاکستان روانہ کر دیا جائے اور باقی سامان اپنے ساتھ لے کر ہوائی جہاز سے جدہ روانہ ہو جائیں۔ اس غرض کے لیے میں ہوائی جہاز کا وقت اور کرایہ معلوم کرنے کے لیے ہوائی اڈہ

گیا۔ وہاں یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوا کہ ریاض سے جدہ تک ہوائی جہاز کا کرایہ ایک سعودی باشندے کے لیے سو ریال اور غیر سعودی مسافر کے لیے دو سو ریال ہے۔ معلوم نہیں یہ سعودی باشندوں کے لئے رعایت ہے یا غیر سعودی باشندوں کے لئے جرمانہ؟ ہمارے لئے قومیت کے لحاظ سے کرایوں کے فرق کا یہ پہلا تجربہ تھا، اپنے ملک میں ہمیں کبھی اس کا تصور بھی نہ ہوا تھا۔

ریاض کے سلفی حضرات

عصر اور مغرب کے درمیان ہم شیخ عبدالرزاق عفیفی کے ہاں گئے۔ وہاں ان کے بہت سے سلفی احباب موجود تھے۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ ہمارا پروگرام اس سفر میں مصر جانے کا بھی ہے تو انہوں نے ہمیں قاہرہ اور اسکندریہ کے بہت سے سلفی حضرات کے پتے دیے تاکہ وہاں پہنچ کر ان سے ملاقات کر سکیں۔

جدّہ کے لیے روانگی

اگلے دن (28 نومبر) ہمیں ریاض سے روانہ ہونا تھا۔ اس شہر کے شیوخ و عمائد نے جس اخلاص و محبت سے ہماری مہمانی کی تھی اس کا تقاضا تھا کہ روانہ ہونے سے پہلے ہم ان سے الوداعی ملاقات کرتے۔ لیکن بارش کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا۔ اس کے باوجود مولانا، امیر عبداللہ سے ملنے کے لیے گئے۔

پاکستانی سفیر کا ٹیلیفون

ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت 12 بجے دوپہر تھا۔ 11 بجے کے قریب ہم ہوٹل سے اپنا سامان نکلوا رہے تھے کہ جدہ سے ہمارے نام پاکستانی سفیر چودھری علی اکبر خاں صاحب کا ٹیلیفون آیا، جس میں انہوں نے ہمیں باصرار دعوت دی کہ جدہ آئیں تو ان ہی کے ہاں قیام کریں۔ انہون نے جس محبت اور اخلاص سے یہ دعوت دی، اس کے پیشِ نظر ہمارے لیے اسے رد کرنا مشکل تھا۔

ہم ہوائی اڈہ پر پہنچے تو شرکتہ المبانی المصر یہ کے مدیر عبدالعظیم اور بعض دوسرے احباب الوداعی ملاقات کے لیے وہاں موجود تھے۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور سامان کا وزن کرایا۔ 30 کلو فی کس سامان لے جانے کی اجازت تھی۔ اس طرح ہم کل 90 کلو سامان بلا اُجرت لے جاسکتے تھے، لیکن ہمارے سامان کا کل وزن 187 کلو ہوا۔ زائد سامان یعنی 98 کلو کا کرایہ اپنے ساتھ رکھنے کی صورت میں 194 ریال اور ہوائی جہاز کے گودام میں رکھنے کی صورت میں 97 ریال بنتا تھا۔ ہمیں بہر حال یہ کرایہ دینا ہی تھا اور ہم اس کے لیے تیار تھے۔ لیکن جب ہوائی اڈے والوں کو مولانا کی شخصیت کا علم ہوا تو انہوں نے بطور مہمان نوازی ہم سے زائد سامان کا کرایہ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ سعودی عرب کے سوا اس مہمان نوازی کا تصور آدمی اور کہاں کر سکتا ہے؟ یہ بھی ''یمکن ایر لائنز'' کی خصوصیات میں سے ہے۔

اس روز ہوائی جہاز لیٹ تھا۔ تقریباً عصر کے وقت ہم ریاض سے جدّہ روانہ ہوئے۔
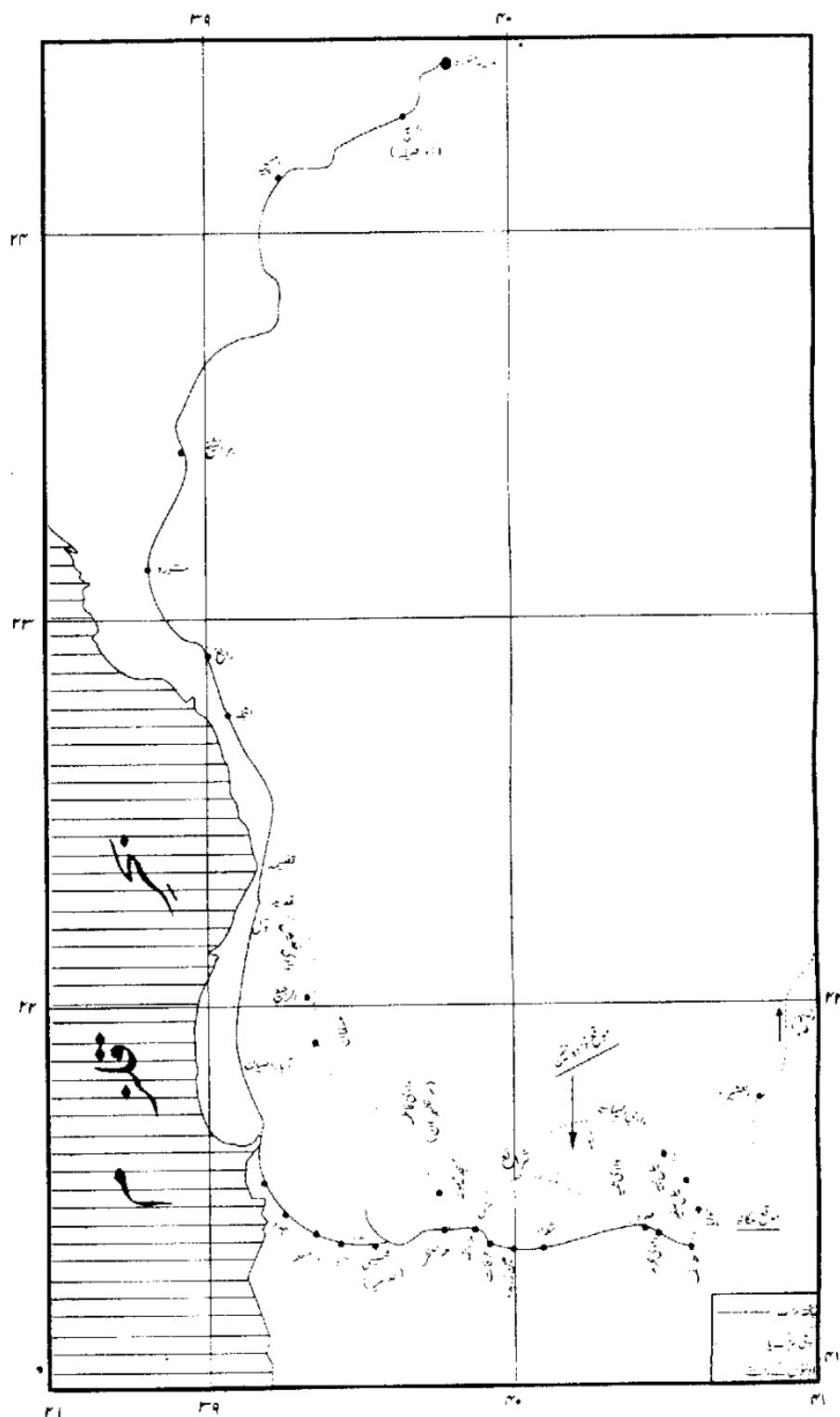
جدّہ میں

جدّہ وصولی

ریاض اور جدہ کے درمیان تقریباً 600 میل کا فاصلہ ہے۔ جہاز میں بیٹھے ہوئے چاروں طرف، بلکہ اوپر اور نیچے بھی، بادل ہی بادل نظر آ رہے تھے۔ جہاز کبھی بادلوں کے اوپر سے گزرتا، کبھی نیچے سے اور کبھی ان کے درمیان سے۔ دور سے بادلوں کے ٹکڑے بالکل دھنی ہوئی سفید اور چمک دار روئی کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ ہوائی جہاز سے بادلوں کا منظر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ مجھے اس سے پہلے یہ منظر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جا کر مطلع صاف ہوا اور نیچے سے زمین نظر آنے لگی۔ مغرب کے وقت ہم جدّہ کے ہوائی اڈہ پر پہنچ گئے۔ اڈے پر چودھری علی اکبر خاں صاحب اور استاذ عبدالحکیم عابدین موجود تھے۔ ان کے ساتھ پاکستان کے ماسٹر عبدالحکیم صاحب بھی تھے جو ضلع لائل پور کے رہنے والے ہیں اور آج کل پاکستانی سفارت خانہ کے قائم کردہ ایک مدرسہ میں تعلیم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جہاز سے اترنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں بھی جہاز کے سامان کی تلاشی لی جائے گی کیونکہ ہمارا جہاز دراصل بیروت سے آ رہا تھا۔ دوسرے مسافروں کی تو تلاشی ہوئی مگر ہمارے سامان کو یونہی چھوڑ دیا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ رعایت ہمارے ساتھ ہوئی ہو، اور ممکن ہے کہ ریاض سے آنے والے تمام مسافروں کو تلاشی سے معاف رکھا گیا ہو۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم چودھری علی اکبر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ جدہ میں پاکستانی سفارت خانہ تو شہر کے اندر ہے لیکن چودھری صاحب کی قیام گاہ شہر سے تین چار میل کے فاصلہ پر ایک نئی آبادی میں اس سڑک پر ہے جو جدہ

سے مدینہ منورہ جاتی ہے۔

ریاض میں گزشتہ کئی دنوں سے بارش کا سلسلہ جاری تھا اس لیے وہاں سردی اچھی خاصی ہوگئی تھی اور ہم نے اپنے گرم کپڑے نکال کر پہن لیے تھے۔ لیکن جدہ پہنچتے ہی گرم کپڑوں نے کاٹنا شروع کر دیا۔ وہاں ہمارے ہاں کے آخر مارچ یا شروع اپریل کا سا موسم تھا۔ معلوم ہوا کہ جدہ کی زیادہ سے زیادہ سردی بس اتنی ہے۔

سفیرِ پاکستان کی دعوت

اسی رات چودھری علی اکبر خاں صاحب کے ہاں مولانا کے اعزاز میں ایک پر تکلف اور شاندار دعوت کا انتظام تھا۔ جس میں انہوں نے جدہ کے بہت سے عرب تجار، پاکستانی حضرات اور اردن، ہندوستان اور بعض دوسرے ملکوں کے سفراء کو بھی بلایا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک مصری ڈاکٹر صاحب بھی تشریف رکھتے تھے جو عرب قوم پرستی کی حمایت، نحاس پاشا کی تعریف اور حسن بنّا شہید کی مذمت فرما رہے تھے۔ چودھری غلام محمد صاحب ان کی باتوں پر صبر نہ کر سکے اور کافی دیر تک ان سے بحث کرتے رہے۔ اس دعوت میں جن پاکستانی حضرات سے شرفِ نیاز حاصل ہوا ان میں جناب انور علی صاحب بھی تھے جو آج کل سعودی اسٹیٹ بینک کے گورنر ہیں اور جنہوں نے سعودی حکومت کے مالیات کو سنبھالنے میں نہایت قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

ہمارا ارادہ جدہ میں قیام کا نہ تھا۔ اصل مقصود مکہ معظمہ تھا، تاہم جدہ میں بھی بعض ایسے کام تھے جن کے لیے وہاں رکنا ضروری تھا۔

اگلے دن (29 نومبر 1959ء) علی الصباح ہم چودھری علی اکبر خاں صاحب کے ساتھ پاکستانی سفارت خانہ آئے اور اپنے پاسپورٹوں پر کویت، یمن اور بعض دوسرے ممالک کا مزید اندراج کرایا۔ کویت کے احباب کا تو اصرار تھا کہ سفر کا پروگرام اس طرح بنایا جائے کہ مصر و شام کے سفر کے بعد ہم لوگ کویت ضرور پہنچیں۔ یمن کے سفر کی بھی کوئی صورت نکل آنے کا امکان تھا، اس لیے پاسپورٹوں پر ان ممالک کا مزید اندراج ضروری تھا۔

مصری سفارت خانہ

اس کے بعد چودھری علی اکبر خاں صاحب (مرحوم) ہی کے ساتھ جمہوریہ عربیہ متحدہ کے سفارت خانہ آئے۔ جمہوریہ کا ویزا تو ہمارے پاس تھا، لیکن ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں مصر پہنچ جانے کے بعد جزیرہ نمائے سینا کے داخلہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آ جائے۔ کیونکہ یہ علاقہ فوجی ہے اور وہاں حکومت کی خالص اجازت کے بغیر داخلہ نہیں ہو سکتا۔ سفیر نے ہمارے نام اور پیشے لکھے اور یہ کہ کس غرض سے جزیزہ نمائے سینا جانا چاہتے ہیں۔ مصر میں جن لوگوں سے ہمیں ملنا تھا، ان کے نام بھی دریافت کیے اور پھر وعدہ کیا کہ اپنی حکومت کو لکھ کر معلوم کریں گے اور پھر ہمیں اطلاع دیں گے۔

مصری سفیر بڑے ہی پُر تکلف لہجے میں گفتگو کرتے رہے۔ غالباً تکلف کی وجہ یہ تھی کہ ہم سے ان کو مجبوراً فصیح عربی میں گفتگو کرنا پڑی۔ عام طور پر عرب ممالک کے تعلیم یافتہ لوگ بھی بے تکلف گفتگو عامی زبان ہی میں کرتے ہیں اور مسلسل بولنے کی نوبت آ جائے تو انہیں خاصی دقت پیش آتی ہے۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے اور یہ کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے قابلِ قدر تھی۔ مگر مصر میں قومیت کے تین تصورات بیک وقت چل رہے ہیں۔ مصر کے اندر فرعونی تہذیب کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ عرب ممالک میں عرب قومیت کی علمبرداری کی جاتی ہے اور غیر عرب مسلمانوں کے سامنے اسلامی برادری کا ذکر اچھے خاصے جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

شیخ محمد نصیف

مصری سفارت خانہ سے فارغ ہو کر ہم شیخ محمد نصیف کے ہاں انہیں سلام کرنے اور ان کی مزاج پرسی کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ شیخ محمد نصیف نہ صرف جدہ کے بلکہ پورے حجاز کے ممتاز آدمی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم، دولت، حسنِ اخلاق، تواضع اور ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ عمر 80 سال کے لگ بھگ ہے۔ دنیا بھر کے علماء اور اہل علم حضرات

سے ان کے تعلقات ہیں۔ باہر سے حج کے لیے آنے والے تمام علم دوست حضرات جدہ میں انہی کے ہاں قیام کرتے ہیں۔ ان کا گھر گویا دنیا بھر کے اہل علم کے لیے مہمان خانہ ہے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ نہایت شاندار اور وسیع ہے اور مقامی شائقین کے لیے اس کی حیثیت پبلک لائبریری کی ہے۔ عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے سلفی ہیں لیکن مزاج میں بہت ہی اعتدال ہے۔ متقدمین علماء کی کتابیں چھپوا کر دنیا بھر کے اہل علم کو وقتاً فوقتاً بھیجتے رہنا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ 49ء میں مولانا مسعود عالم مرحوم کا قیام بھی ان ہی کے ہاں ہوا تھا۔ 56ء میں مولانا مودودی بھی ان ہی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ اب بھی ہم ان ہی کے ہاں قیام کرتے، لیکن چودھری علی اکبر خاں صاحب کی مہمان نوازی نے ہمیں اپنے ہاں کھینچ لیا۔ شیخ نصیف اپنی روایاتی محبت اور حُسنِ اخلاق سے پیش آئے۔ انہیں اس بات کا افسوس تو ہوا کہ اب کی مرتبہ ہم ان کے ہاں قیام نہ کر سکے، لیکن چودھری علی اکبر خاں صاحب کی وجہ سے اس کا اظہار نہ کر سکے۔ صرف اتنا کہا کہ ''سفیر صاحب کا حق مقدم تھا۔'' معلوم ہوا کہ ان کی آنکھیں خراب ہو گئی تھیں، جن کے علاج کے لیے وہ مصر گئے تھے اور ابھی چند دن پہلے وہاں سے واپس آئے تھے اس وقت بھی انہیں مکمل آرام نہ ہوا تھا۔

واپسی پر شیخ نصیف نے اپنی عادت کے مطابق چند کتابیں مولانا کو بطور ہدیہ پیش فرمائیں اور جدہ سے ہماری واپسی سے پہلے پہلے مزید کتابیں اور بھیج دیں۔

شام کو اپنی کمزوری اور بیماری کے باوجود بازدید کے لیے چودھری علی اکبر خاں صاحب کی کوٹھی پر تشریف لائے۔ اندازہ ہوا کہ عربوں کے ہاں ''ردِ زیارت'' کی کس قدر اہمیت ہے۔ شیخ نصیف حجاز کی گزشتہ پچاس سال کی جیتی جاگتی تاریخ ہیں۔ حجاز میں ترکی عہد کے حالات و واقعات بڑی دلچسپی اور مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ جدہ اور مکہ معظّمہ کے علماء اور ادباء ان سے حالات و واقعات سننے کے لیے اکثر ان کے ہاں جمع رہتے ہیں۔ کسی کو حجاز کی گزشتہ تاریخ سے متعلق کوئی کتاب یا مضمون لکھنا ہو تو وہ ان کے ہاں آ کر واقعات اور ان کی ترتیب کا اطمینان کراتا ہے۔ جدہ اور مکہ معظّمہ کے پرچوں میں کتنے ہی ایسے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن کے لکھنے والوں نے مواد زیادہ تر ان ہی کی مجلسوں سے لیا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس وہ ایک گھنٹہ بیٹھے رہے اور سلطان عبدالحمید کے عہد

کے حالات و واقعات سناتے رہے۔ اور واقعات تو مجھے یاد نہیں رہے۔ صرف ایک واقعہ اپنی انتہائی دلچسپی کی وجہ سے ذہن میں رہ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کے لیے باقاعدہ بازار لگا کرتے تھے اور لوگ وہیں سے اپنی ''ضرورت کا سامان'' خریدا کرتے تھے۔ میں جوان ہو چکا تھا، لیکن ابھی میری شادی نہ ہوئی تھی۔ بعض دوستوں کے مشورے پر میرے والد مرحوم نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ دیکھو تم جوان ہو چکے ہو، لیکن ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ تمھاری شادی کی جا سکے، اس لیے بہتر ہے کہ مکہ معظمہ چلے جاؤ اور اپنے لیے کوئی لونڈی لے آؤ۔ پہلے تو یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ لیکن بالآخر والد اور ان کے دوستوں کے اصرار پر رضامند ہو گیا۔ اگلے دن مکہ معظمہ آیا اور غلاموں اور لونڈیوں کے بازار پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ مختلف دکانوں پر لونڈیاں باقاعدہ کھڑی ہیں اور ان کی بولی دی جا رہی ہے۔ اور جو لوگ بولی دے رہے ہیں، وہ آگے بڑھ کر ان کے جسم کے ہر حصہ کا۔۔۔ سوائے ایک حصہ کے۔۔۔ ہاتھ لگا لگا کر جائزہ لے رہے ہیں۔ اس منظر سے میری طبیعت اس قدر مکدر ہوئی کہ میں الٹے پاؤں بازار سے باہر نکل آیا۔ میں نے سوچا کہ جو عورت کسی مرد کو ہاتھ لگانے سے نہیں روک سکتی وہ آخر میرے کس کام کی ہو سکتی ہے؟

شیخ مصطفٰے عالم

اگلے روز (30 نومبر) ہمارا پروگرام مکہ معظمہ روانہ ہو جانے کا تھا، لیکن صبح ہی نماز کے بعد شیخ مصطفٰے عالم تشریف لے آئے۔ موصوف دراصل مصر کے رہنے والے ہیں۔ ان کا تعلق بھی اخوان سے تھا، اس لیے جیل میں بھی رہے۔ 56ء میں ان کی رہائی ہوئی اور یہ رہائی کے بعد حج کے لیے مکہ معظمہ آئے، لیکن پھر مصر واپس نہیں گئے۔ اس وقت سے ان کا قیام جدہ میں ہے اور یہاں ایک دینی مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے پاس ایک گھنٹہ تک بیٹھے، مصری اخوان کے حالات سناتے رہے۔

جدّہ سے مکہ معظّمہ

10 بجے کے قریب وہ مبارک ساعت آئی کہ ہم نے غسل کیا، احرام کے کپڑے پہنے، دوگانہ مسنون نماز ادا کی اور پھر زبان پر لبیک اللھم لبیک ۔۔۔۔ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جدہ میقات کے اندر واقعہ ہے اس لئے احرام کا اپنی قیام گاہ ہی سے باندھنا ضروری تھا۔ ہم نے اپنا زیادہ تر سامان تو چودھری علی اکبر خاں صاحب کے ہاں چھوڑا۔ اپنے ساتھ صرف بستر اور کچھ ضروری سامان لیا اور مکہ معظّمہ جانے والی ٹیکسیوں کے اڈے پر پہنچے۔ وہیں استاذ عبدالحکیم عابدین بھی مل گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ مکہ معظّمہ جا رہے تھے۔ ہم نے سات سیٹوں کی ٹیکسی 24 ریال کرایہ پر لی۔ ٹیکسی کا یہ کرایہ حج کے علاوہ دوسرے دنوں کے لیے ہے ورنہ حج کے زمانے میں حاجیوں سے جو کرایہ وصول کیا جاتا ہے وہ اس سے کم از کم دس بارہ گنا زیادہ ہوتا ہے۔ جدّہ اور مکہ معظّمہ کے درمیان 45 میل کا فاصلہ ہے اور سڑک نہایت شاندار ہے، نئی سکیم کے تحت اس وقت اس سڑک کو دوہرا کیا جا رہا تھا۔ ایک راستہ مکہ معظّمہ جانے والوں کے لیے اور دوسرا مکہ معظّمہ کی طرف سے آنے والوں کے لیے۔ دوسری نئی سڑک آدھی تیار ہو چکی تھی اور خیال تھا کہ اگلے سال تک بقیہ سڑک بھی تیار ہو جائے گی۔ اب یہ سڑک مکمل ہو چکی ہے۔

راستے کے تاریخی آثار

تقریباً پندرہ منٹ تو ہمیں جدہ ہی کی آبادی سے نکلنے میں لگ گئے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ شہر کس قدر پھیل چکا ہے۔ اب بھی مکہ معظّمہ کی طرف مزید آبادی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے بعد پہاڑی سلسلہ شروع ہوا۔ یہ وہی سلسلہ ہے جو بحر قلزم کے ساحل کے

ساتھ ساتھ یمن سے اردن تک چلا گیا ہے۔ پھر ریگستانی علاقہ شروع ہوا۔ سب سے پہلی بستی جو ہمیں ملی وہ ام السلم تھی۔ اس کے بعد بحرہ آیا۔ پھر حدہ سے گزر ہوا۔ 32 میل چلنے کے بعد سڑک کی بائیں طرف ایک بستی آئی، جس کا موجودہ نام شمیسی ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا نام حدیبیہ تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں صلح حدیبیہ واقع ہوئی تھی۔ جس جگہ پر صحابہ کرامؓ کا لشکر ٹھہرا تھا۔ وہ بالکل سڑک کے کنارے پر ہے اور اب وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس مسجد پر رکنے کا ارادہ کیا، لیکن پھر یہ طے کیا کہ پہلے عمرہ سے فارغ ہو لیں، اس کے بعد کسی دن خاص طور پر اس مسجد کو دیکھنے کے لیے مکہ معظمہ سے آئیں گے۔ کچھ آگے بڑھے تو سڑک کے دونوں کناروں پر بورڈ لگا ہوا تھا کہ غیر مسلم یہاں سے آگے نہ بڑھیں، کیونکہ حرم کے حدود شروع ہونے والے تھے۔ آدھ میل اور بڑھے تو حرم کے حدود بھی آ گئے اور وہاں سڑک کے دونوں طرف اعلام الحرم (حرم کے نشانات) بنے ہوئے تھے۔

مکہ معظمہ: 30 نومبر تا 4 دسمبر 1959ء

اعلام الحرم سے چند میل کے بعد مکہ معظمہ کی آبادی شروع ہو گئی۔ سامنے ایک صاف پہاڑ دکھائی دے رہا تھا، جس کے متعلق ڈرائیور اور استاذ عبدالحکیم عابدین نے بتایا کہ یہی جبلِ نور ہے جس میں غارِ حرا واقع ہے۔ گزشتہ سفروں میں دونوں مرتبہ رات ہی کے وقت یہاں سے گزر ہوا تھا اس لیے اندازہ نہ ہو سکا کہ جبلِ نور یہاں سے بھی نظر آتا ہے۔

آگے بڑھے تو عبداللہ بن کلیب سڑک پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ہم سے ایک دن پہلے ریاض سے روانہ ہو گئے تھے اور پھر ایک دن جدہ ٹھہر کر مکہ معظمہ آ گئے تھے۔ مسجد الحرام کے قریب ہی جس طرف سعودی ہسپتال اور بوہروں کی رباط ہے۔ ہمارے پاکستانی سفارت خانہ نے ایک چہار منزلہ عمارت کی تیسری منزل کرایہ پر لے رکھی ہے جو حج کے دنوں میں سفارت خانہ کے عملہ کے لیے دفتر کا کام بھی دیتی ہے اور اسی میں سرکاری و غیر سرکاری مہمان بھی جنہیں سفیر صاحب اجازت دیں، قیام کرتے ہیں۔ حج کے سوا دوسرے دنوں میں یہ عموماً خالی رہتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال اور گاہے بگاہے آنے والے

مہمانوں کی خدمت کے لیے ایک ملازم بھی مقرر ہے۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے تو حرم میں ظہر کی اذان ہو چکی تھی اور عین جماعت کا وقت تھا۔ ہم نے سامان نیچے ایک دکاندار کی حفاظت میں چھوڑا اور خود جماعت میں شریک ہونے کے لیے حرم کا رخ کیا۔ حرم میں داخل ہوئے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ ہم نے کعبہ۔۔۔۔ زادھا اللہ شرفا۔۔۔ پر محبت واحترام بھری نگاہ ڈالی اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ نماز کے بعد استاذ عبدالحکیم عابدین طواف کے لیے چلے گئے۔ اور ہم اپنی جائے قیام کی طرف واپس آ گئے۔ سامان اوپر چڑھا کر مرتب کیا۔ اس کے بعد سفارت خانہ کی طرف سے فلیٹ کی دیکھ بھال پر متعین ملازم بھی آ گیا۔ جو مشرقی پاکستان کا رہنے والا تھا اور اس کا نام عبدالمصور تھا۔ اس نے ہمیں چائے بنا کر پلائی، جس پر ہم اس کے نہایت شکر گزار ہوئے۔

خطیبِ حرم سے ملاقات

چائے کے بعد عمرہ کے لیے ہم نکل ہی رہے تھے کہ حرم کے خطیب شیخ ابو السمح عبدالمہیمن آ گئے۔ ان کا مکان ہمارے فلیٹ کے بالکل سامنے اسی گلی میں تھا۔ انہوں نے جب مولانا کی آمد کی خبر سنی تو فوراً تشریف لائے۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد گزشتہ مرتبہ (56ء) حج کی مصروفیات کی وجہ سے ملاقات نہ ہو سکنے پر افسوس کرتے رہے۔ انہوں نے ہمیں کسی دن اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی جسے ہم نے بخوشی قبول کر لیا۔

عمرہ

اس کے بعد ہم عمرہ کے لیے نکلے۔ عمرہ کے لیے باب السلام سے داخل ہونا مسنون ہے۔ باب السلام میں داخل ہونے کے لیے ہمیں کافی لمبا چکر لگانا پڑا۔ کیونکہ ہمارا قیام باب ابراہیم کی طرف تھا اور باب السلام اس کی مخالف سمت میں واقع ہے۔ جس وقت ہم عمرہ (طواف، مقامِ ابراہیم پر دو رکعتیں اور صفا و مروہ کے درمیان سعی) سے فارغ ہوئے، تو عصر کی اذان ہو گئی۔ ہم نے عصر کی نماز حرم ہی میں ادا کی اور پھر اپنی جائے قیام پر واپس آئے اور احرام کھول کر کپڑے تبدیل کیے۔ جسم میں اگرچہ سخت تکان تھی لیکن دل خوشی سے

لبریز تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے گھر کی زیارت اور عمرہ کی سعادت پھر نصیب فرمائی۔ الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔

عصر کے بعد ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عبداللہ بن کلیب اور ان کے اور ہمارے دوست مقبول عبدالکافی تشریف لائے۔ مکہ معظمہ میں ہمارے مطوف شیخ عقیل عطاس بھی تشریف لائے، بڑی ہی محبت اور گرم جوشی سے ملاقات کی۔ رسمی گفتگو کے بعد کہنے لگے کہ "یہاں میرے ایک دوست شیخ سلیمان الصنیع ہیں جو مقامی مجلسِ شوریٰ کے رکن بھی ہیں۔ انہیں مکہ معظمہ کے آثار سے گہری واقفیت اور دلچسپی ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔ آثار کے دیکھنے اور سمجھنے میں وہ آپ لوگوں کی بڑی مدد کریں گے۔" پہلے ہی قدم پر یہ خوش خبری سن کر ہم نے خوشی اور اطمینان کا سانس لیا۔ مغرب کے بعد حرم میں بعض پاکستانی احباب سے بھی ملاقات ہوئی۔

حرم کی نماز

حج کے دنوں میں تو نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہی ہے، لیکن دوسرے دنوں میں بھی یہ تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ ظہر اور عصر کی نمازوں میں مطاف اور چاروں طرف کے برآمدے نمازیوں سے بھر جاتے ہیں، مغرب، عشاء اور صبح کی نمازوں میں مطاف اور برآمدوں کے علاوہ صحن (جہاں کنکریاں بچھی ہوئی ہیں) میں بھی ان کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ یہ تعداد حج کے دنوں کے مقابلہ میں کتنی ہی کم ہو، لیکن پھر بھی دنیا بھر کی کسی مسجد میں نمازیوں کی اتنی تعداد کبھی نہ ہوتی ہوگی۔ نماز باجماعت کے اوقات کو چھوڑ کر سال بھر میں ایک منٹ بھی ایسا نہیں آتا۔ جب اللہ کے بندے کعبہ کا طواف اور حجرِ اسود کی تقبیل واستلام نہ کر رہے ہوں۔ سنا ہے چند سال ہوئے مکہ معظمہ میں سخت بارش ہوئی، جس کی وجہ سے مطاف پانی سے بھر گیا۔ لیکن اس حال میں بھی اللہ کے بہت سے بندے پانی میں تیر کر طواف کرتے رہے۔ اللہ کے ایک برگزیدہ بندے نے بے آب وگیاہ ریگستان کے اندر اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کیا اور دنیا بھر کے انسانوں کو اس کی طرف پکارا۔ یہ اسی پکار کی بازگشت ہے کہ دنیا بھر کا مسلمان ہر ملک اور ہر خطہ سے ہر موسم میں لبیک اللھم لبیک

لبیک لا شریک لک لبیک ۔۔۔ کہتا ہوا اس گھر کی طرف کھنچا چلا آتا ہے، اور جو نہیں آ سکتا، وہ اس کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ آج سے چار ہزار سال پہلے سے جاری ہے اور جب تک روئے زمین پر اسلام کے ماننے والے باقی ہیں، یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا۔ یہ اسلام کے دین الٰہی ہونے کی نہایت اہم دلیل ہے۔

پاکستانی شفاخانہ

اگلے دن (یکم دسمبر) مولانا جائے قیام پر رہے۔ چودھری غلام محمد صاحب کی طبیعت خراب تھی اس لیے ہم دونوں ہسپتال گئے۔ مکہ معظمہ میں حاجیوں کی طبی امداد کے لیے پاکستان کی طرف سے ایک شفاخانہ قائم ہے، جو سال کے دوسرے دنوں میں بھی کام کرتا رہتا ہے۔ چودھری صاحب نے وہاں سے دوا لی اور ٹیکہ لگوایا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ شفاخانہ بہت خوب کام کر رہا ہے۔

وزارتِ داخلیہ

اس کے بعد میں اور چودھری صاحب وزارتِ داخلیہ گئے۔ جس کا دفتر ریاض کے بجائے مکہ معظمہ میں ہے، اس کے مدیر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ امیر مساعد کے تار پر ہم نے مدیر الامن العام (انسپکٹر جنرل پولیس) کو ہدایات بھیج دی ہیں۔ آپ لوگ ان سے ملیے۔ مدیر الامن العام کے پاس آئے تو انہوں نے بتایا کہ ہم نے تمام مقامات پر آپ لوگوں کو التسهیلات والارشادات اللازمه (ضروری ہدایات اور آسانیاں) بہم پہنچانے کے لیے تار روانہ کر دیے ہیں، اس لیے اب آپ لوگ پورے ملک میں جہاں چاہیں، پھر سکتے ہیں، کہیں کوئی دقت پیش آئے تو پولیس والوں سے مدد لیجیے۔ یہ سب آسانیاں امیر مساعد کے تار کی وجہ سے حاصل ہوئیں، ورنہ محض پاسپورٹ پر ایک اجنبی مسافر کے لیے سوائے ان مقامات کے جن کی تصریح اس کے پاسپورٹ پر کر دی گئی ہو، سعودی مملکت کے اندر گھومنا ممکن نہیں۔ جو لوگ عمرہ کے لیے جاتے ہیں، انہیں صرف مکہ معظمہ، جدہ اور مدینہ منورہ میں گھومنے پھرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

حرم مکہ۔ مطاف کی توسیع کے بعد

مکہ مکرمہ۔ حرم کے مشرق کی جانب سڑک۔ اس جگہ دار ارقم تھا۔

آثار کی زیارت

عصر کے بعد ہمارا پروگرام مکہ معظّمہ کے آثار دیکھنے کے لیے نکلنے کا تھا، شیخ عقیل عطاس سے پروگرام پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا، چنانچہ وہ اور ان کے بیٹے اپنی موٹر لے کر بروقت ہمارے ہاں آ پہنچے۔ ان کے ساتھ شیخ سلیمان الصنیع بھی تھے۔ ان سے طے پایا کہ آغاز جبلِ نور، منیٰ اور عرفات سے کیا جائے۔ جبلِ ثور (وہ پہاڑ جس میں غارِ ثور واقع ہے) اور دوسرے آثار ان کے بعد دیکھے جائیں گے۔

دارالارقم

ہم اس سڑک پر چلے جو صفا کے پاس سے شمال کو منیٰ کی طرف جاتی ہے۔ ابھی ہم صفا کے قریب ہی تھے کہ شیخ سلیمان نے سڑک پر ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ دارالارقم کا نصف حصہ نئی تعمیرات کے سلسلے میں اب اس سڑک کے نیچے آ گیا ہے۔ اور بقیہ نصف حصہ قریب کی دکانوں میں سے ایک دکان میں شامل کر دیا گیا ہے۔ گویا اب دارالارقم نامی کوئی عمارت مکہ معظّمہ میں موجود نہیں ہے۔

دارالارقم کو دعوت اسلامی کی پوری تاریخ میں جو اہمیت اور اولیت حاصل ہے، وہ کسی بھی دوسری جگہ کو حاصل نہیں ہے، یہی وہ جگہ تھی جہاں ہجرت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کفار مکہ کے شر سے بچنے کے لیے چھپ چھپا کر جمع ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو صبر و استقلال کی تلقین فرماتے اور اگر قرآن پاک کی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو انہیں پڑھ کر سناتے۔ یہی وہ گھر تھا جس کا حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں ذکر آتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ یہاں جمع تھے کہ حضرت عمرؓ کو (جب کہ وہ ابھی اسلام نہ لائے تھے) اس کی اطلاع ملی اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بزعم خود قتل کرنے کے لیے گھر سے نکلے۔ راستے میں انہیں اپنی بہن اور بہنوئی کے مسلمان ہو جانے کی خبر ملی۔ چنانچہ وہ ان کی طرف پلٹ گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ـــ خود ان کا دل اسلام کے لیے کھول دیا۔ سیدھے دارالارقم آئے اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو گئے۔ یہ گھر جس کی تاریخ اسلام میں یہ حیثیت اور اہمیت ہو، اس کا سرے سے نام و نشان مٹ جانا ہمارے لیے انتہائی روحانی اذیت کا باعث ہوا۔ انا للّٰہ و انا الیه راجعون ۔کیا کوئی بھی ایسی اسکیم نہیں بن سکتی تھی کہ یہ گھر اپنی جگہ قائم رہتا اور سڑکوں اور دکانوں کو کسی اور طرح سے تعمیر کر لیا جاتا؟

مکہ معظمہ میں جتنے دوسرے آثار ۔۔۔ گھر اور مساجد ۔۔۔ ہیں، ان کی نسبت تاریخی لحاظ سے بہرحال یقینی نہیں ہے، لیکن دارالارقم کی نسبت تاریخی لحاظ سے تقریباً یقینی اور قطعی تھی۔ یہ جس جگہ پر آج سے چند سال پہلے تک قائم تھا، تمام مسلمان بادشاہوں اور امراء نے اس کی اس لحاظ سے ہمیشہ حفاظت کی کہ یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں دارالارقم قائم تھا۔ ہر دور میں اس جگہ قرآن و حدیث کی تعلیم کا کوئی نہ کوئی سلسلہ جاری رہا۔ عمارتیں اگرچہ گرتی اور پھر سے بنتی رہی ہوں گی، لیکن بہرحال جگہ وہی رہی۔ آخری عمارت جسے 49ء میں ہم نے خود دیکھا ہے، غالباً نویں صدی ہجری کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے دروازے پر بھی دارالارقم لکھا ہوا تھا۔ اور اس کے اندر بھی بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے، جن میں سے ایک پر یہ عبارت کندہ تھی:

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

"فی بیوت اذن اللّٰہ ان ترفع و یذکر فیھا اسمه یسبح
له فیھا بالغدو و الاصال ... ھذا مختباء رسول اللّٰہ
و دار الخیزران و فیھا مبداء الاسلام"

دوسرے پتھر پر عمارت کے بانی کی حیثیت سے "ابو جعفر محمد بن علی بن ابی منصور الاصفہانی وزیر الشام والموصل" کا نام کندہ تھا۔ ہمارے پہلے سفر کے زمانہ میں شیخ ابوالسمح عبدالظاہر مرحوم (موجودہ خطیب حرم کے بڑے بھائی) کا درس قرآن و حدیث اس میں ہوا کرتا تھا۔ مگر اب ہم وہاں کیا دیکھتے؟ افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تاریخی آثار سے سعودی حکومت کا تغافل ایک ایسی چیز ہے جو عرب کی سیاحت کرنے والے ہر شخص کو بُری طرح کھٹکتی ہے۔ مشرکانہ افعال کو روکنا بالکل برحق۔ مگر اسلام کے نہایت قیمتی آثار تاریخ کو ضائع کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

جبل ابوقبیس

آگے بڑھے تو سڑک کے ساتھ ہی ایک پہاڑی سلسلہ ملا، جو حرم سے بھی حجر اسود کے رخ سے نظر آتا ہے۔ اسے جبل ابی قبیس کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بنو ہاشم اسی طرف آباد تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انشقاقِ قمر کا معجزہ بھی اسی پہاڑ پر واقع ہوا تھا، اگر چہ یہ بات قطعی نہیں ہے۔ زیادہ تر روایات میں اس واقعہ کے منیٰ میں ہونے کا ذکر ہے۔

آگے بڑھے تو سڑک کی دائیں طرف زرد رنگ کی ایک خوبصورت عمارت میں لڑکیوں کا مدرسہ آیا۔ اس کے متعلق بتایا گیا کہ یہ عمارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش پر واقع ہے۔ اس سے کچھ پہلے سڑک کی دائیں طرف چند گلیاں اور ان میں لوگوں کے مکانات اور دکانیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ شعب ابی طالب اسی جگہ تھی۔ اب پہاڑوں کو صاف کر دیا گیا ہے اور لوگوں نے صاف زمین پر دکانیں اور مکانات تعمیر کر لیے ہیں۔ ان ہی گلیوں میں ایک جگہ کو حضرت علیؓ کی جائے پیدائش کہا جاتا ہے۔ شعبِ ابی طالب ـــ جبلِ ابی قبیس سے ملی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان ایک گھاٹی تھی، جہاں ہجرت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ بنو ہاشم تین سال تک محصور رہے اور کفار مکہ نے حضورؐ کے پورے قبیلے کا معاشی و معاشرتی مقاطعہ کیے رکھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش کے سامنے سڑک سے دوسری طرف حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوسفیانؓ کے مکانات کی جگہ بتائی جاتی ہے۔ محلّہ مسفلہ میں ایک جگہ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان کی جگہ کہا جاتا ہے۔ گزشتہ سفر (1956ء) میں ہمارا قیام اسی محلّہ مسفلہ میں رہا تھا۔

مسجد الرائیہ اور مسجد الجن

کچھ اور آگے بڑھے تو سڑک کی بائیں طرف ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ اس کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہ مسجد الرائیہ ہے۔ مسجد الرائیہ اسے اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اس

جگہ واقع ہے جہاں فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر اپنا رایہ (جھنڈا) نصب فرمایا تھا۔

اس سے کچھ ہی آگے ایک اور مسجد ہے جسے مسجد الجن کہا جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ یہ مسجد جیسا کہ مشہور ہے اس جگہ واقع ہے جہاں جنوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا تھا اور پھر وہ ایمان لائے تھے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا۔

آپ کہہ دیجیے کہ میری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ چند جنوں نے مجھے (قرآن پڑھتے) سنا، تو انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک حیرت انگیز کلام سنا ہے جو بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے۔ چنانچہ ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ جنوں کے قرآن سننے اور ایمان لانے کا یہ واقعہ وادی بطن نخلہ میں پیش آیا جو مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان واقع ہے۔

المعلیٰ کا قبرستان

کچھ اور آگے بڑھے تو بائیں ہاتھ کو مکہ معظمہ کا قبرستان، جسے المعلیٰ یا المعلاۃ کہا جاتا ہے، آ گیا۔ المعلیٰ جاہلیت کے زمانہ سے آج تک اہل مکہ کا قبرستان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب، چچا ابوطالب، اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہؓ اور دوسرے تمام اعزہ یہیں دفن ہوئے ہوں گے اور بہت سے صحابہ کرامؓ اور بعد کے صلحاء و فقہا اور محدثین کی قبریں بھی یہیں ہوں گی، لیکن ان کی جگہوں کا تعین قطعی ناممکن ہے۔ نجدیوں کی حجاز میں آمد سے پہلے یہاں بہت سی پختہ قبروں پر بڑے شاندار قبے بنے ہوئے تھے جو اکابر صحابہ کی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور لوگ ان پر طرح طرح کے نذرانے پیش کرتے تھے۔ نجدیوں نے آ کر ان تمام قبوں کو گرا دیا اور پختہ قبروں کو مسمار کر دیا۔ اب
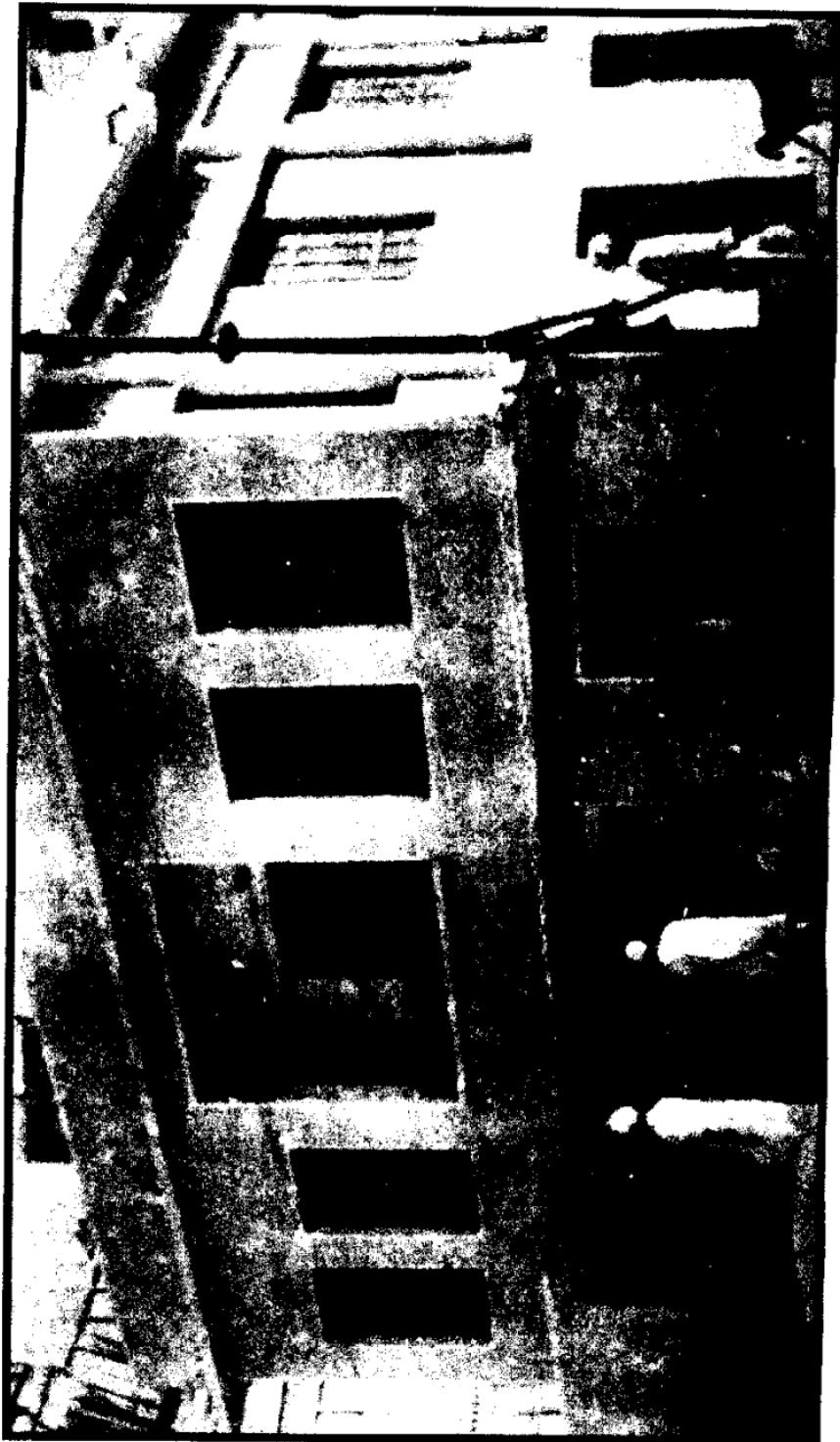
مکۃ مکرمہ — مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یہاں کوئی پختہ قبر نہیں ہے۔ اب بھی بعض قبروں کو بعض صحابہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لیکن اس نسبت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس قبرستان میں ایک جگہ پر حضرت خدیجہؓ، حضورؐ کے دادا عبدالمطلب اور چچا ابوطالب کی قبروں کی نشان دہی کی جاتی تھی لیکن سعودی حکومت نے ان قبروں کو بھی مسمار کر کے ان کے آگے پختہ دیوار بنادی ہے تا کہ کوئی شخص اس دیوار سے آگے نہ بڑھ سکے۔

طریق کدا

معلیٰ کا قبرستان شمال اور جنوب دونوں طرف سے پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ ان پہاڑیوں کے درمیان سے شمال مغرب کو ایک راستہ جاتا ہے، جسے کدا کہا جاتا ہے اور یہ وہی راستہ ہے جس سے فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے۔

جبلِ نور

آگے بڑھ کر منیٰ جانے کے لیے یہ سڑک دائیں طرف ـــ جنوب مشرق کو ـــ مڑ جاتی ہے۔ موڑ سے تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں جبلِ نُور دکھائی دیا۔ ہم کچھ دیر سڑک پر چلتے رہے۔ پھر نیچے اتر گئے۔ ایک آدھ منٹ اور چلے ہوں گے کہ پہاڑ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ جبلِ نور اس پہاڑ کا نیا نام ہے، ورنہ اس کا قدیم نام جبلِ حرا ہی مشہور ہے۔ اسی کے اندر وہ غار واقع ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ حرم سے اس کا فاصلہ ڈھائی یا تین میل ہوگا۔ مولانا کا اندازہ ہے کہ یہ دو ہزار فٹ کے قریب اونچا ہے۔ غارِ حرا تک پہنچنے کے لیے دو مرتبہ پہاڑ پر چڑھنا اور اترنا پڑتا ہے اور اس میں ـــ لوگوں کے بتانے کے مطابق ـــ کم از کم دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ ہم اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے مگر وقت بہت تنگ تھا، اسی لیے اسے کسی اور دن کے لیے ملتوی کر دیا، مگر افسوس کہ بعد میں بھی اس کا موقع نہ مل سکا اور دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

جبلِ نور کے دامن میں سعودی حکومت نے حال ہی میں ایک بند تعمیر کرایا ہے، جس سے پہاڑوں پر بارش کا پانی تنعیم سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے، ورنہ جب تک یہ بند

تعمیر نہ ہوا تھا۔ آئے سال پانی حرم کے اندر پہنچ جاتا تھا اور بڑی مشکل پیش آتی تھی۔

منیٰ سے عرفات تک

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو منیٰ پہنچ گئے۔ عمارتیں اپنی جگہ قائم تھیں، لیکن ان میں کوئی آبادی نظر نہ آ رہی تھی۔ یہ بھی خوب شہر ہے۔ سال بھر میں صرف تین دن آباد ہوتا ہے اور یک لخت اس کی آبادی آٹھ دس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ ان تین چار دنوں کے اندر مکانوں کے مالکان حاجیوں سے اتنا کرایہ وصول کر لیتے ہیں جو بڑے شہروں میں اتنی جگہ کے لیے سال بھر میں بھی وصول نہیں ہوتا۔

منیٰ کے وسط میں مسجد الخیف ہے اور یہ اس جگہ واقع ہے جہاں حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ جمرۂ اولیٰ و ثانیہ کے درمیان ایک چھوٹی سی مسجد ہے جسے مسجد المنحر کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی کے اونٹ یہاں ذبح فرمائے تھے، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جمرۂ عقبہ (جمرہ کبریٰ) سے کچھ پہلے ایک چھوٹی سی مسجد اور ہے جسے مسجد العشرہ کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے سال مدینہ کے جن دس آدمیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، وہ یہاں جمع ہوئے تھے۔ جمرہ کے ساتھ ہی ایک اونچی سی جگہ تھی، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں دوسرے سال مدینہ منورہ کے 72 آدمیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اور جو تاریخ کی کتابوں میں بیعتِ عقبہ کے نام سے مشہور ہے اور اسی لیے اس جمرہ کا نام بھی جمرۂ عقبہ رکھا گیا ہے۔ مگر یہ جگہ بھی اب نئی سڑک کے نیچے آ گئی ہے، حالانکہ بیعت عقبہ جیسے اہم واقعہ کی تاریخی یادگار کو ذرا سی توجہ سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔

منیٰ کے بعد وادیٔ محسّر ہوتے ہوئے ہم مزدلفہ آئے۔ وادی محسّر وہ وادی ہے، جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے پرندوں نے اللہ کے حکم سے کنکریاں برسا کر ابرہہ اور اس کے لشکر (اصحاب الفیل) کو ختم کیا تھا۔ یہ [illegible] وادی ہے۔ اسی لیے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا تھا کہ اسے

جبل النور۔ غار حراء

جلد از جلد پار کر جائیں۔ اس کے دونوں طرف پہاڑیوں کا سلسلہ کچھ اس قسم کا ہے اور اس طرح مسلسل چلا جارہا ہے کہ اس سے گزرتے ہوئے واقعی خوف آتا ہے۔

مزدلفہ وہ جگہ ہے جہاں عرفات سے پلٹے ہوئے حاجی ایک رات بسر کرتے ہیں اور رمی جمار کے لیے کنکریاں جمع کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کا نام المشعر الحرام مذکور ہے۔ المشعر الحرام اب صرف اس مسجد کا نام ہے، جو اس کے اندر بنی ہوئی ہے۔ یہاں اس مسجد کے سوا کوئی دوسری عمارت نہیں ہے۔

مزدلفہ کے بعد حرم کے حدود ختم ہو جاتے ہیں اور جہاں یہ حدود ختم ہوتے ہیں وہاں نشانات لگے ہوئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حج میں اور لوگ تو عرفات تک جاتے تھے، لیکن قریش مزدلفہ سے آگے نہ بڑھتے تھے، کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہم اہلِ حرم ہیں۔ اس لیے حرم کے حدود سے باہر نہ نکلیں گے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد خداوندی ثم افیضوا من حیث افاض الناس کے تحت عام لوگوں کے ساتھ خود بھی عرفات تک گئے۔

مزدلفہ سے عرفات جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ دائیں ہاتھ کو ہے، جسے طریق الضب کہا جاتا ہے۔ اسی راستہ سے حاجی مزدلفہ سے عرفات جاتے ہیں۔ دوسرا راستہ بائیں ہاتھ کو ہے، جسے طریق المأزمین کہا جاتا ہے۔ اس راستے سے حاجی عرفات سے مزدلفہ واپس آتے ہیں۔

عرفات میں مسجد النمرہ کے علاوہ صرف ایک عمارت نظر آئی، جو حج کے موقعہ پر انتظامی عملہ کے دفتر کا کام دیتی ہے۔ یہاں عمارتوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں حاجی صرف چند گھنٹے ٹھہرتے ہیں اور اس کے لیے خیمے کافی ہوتے ہیں۔ آج سے چند سال پہلے تک عرفات میں صرف دو سڑکیں تھیں، اس لیے حاجیوں کو مغرب کے بعد مزدلفہ واپس جانے میں بڑی دقت پیش آتی تھی، لیکن اب یہاں پانچ سڑکیں بنادی گئی ہیں، جن سے بڑی آسانی ہوگئی ہے۔ 56ء تک غالباً یہاں دو ہی سڑکیں تھیں، اس لیے بس نے ہمیں مغرب کے وقت عرفات سے چل کر رات کے 12 بجے مزدلفہ پہنچایا تھا۔ اب یہاں جا بجا پانی کے نلکے بھی لگا دیے گئے ہیں تاکہ حاجیوں کو پانی کے سلسلے میں بھی

کوئی پریشانی نہ ہو۔

عرفات کے ساتھ ہی شمال کی طرف مسجد نمرہ کے عین سامنے وادی عرنہ ہے، جس میں حج کے موقعہ پر وقوف منع ہے۔

عرفات پہنچ کر ہم جبل الرحمہ پر چڑھے جس کا قدیم نام جبل الالال ہے، اور اب اسے جبل الرحمہ کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کے دامن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو وعظ فرمایا تھا۔ اس کے دامن میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وقوف اس جگہ تھا۔ اس کے اوپر بھی ایک مسجد بنی ہوئی ہے اور اس کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وقوف یہاں تھا۔ ہم نے مغرب کی نماز پہاڑی کے اوپر والی مسجد میں پڑھی۔ پھر نیچے اتر آئے۔ یہاں بہت سے قہوہ خانے بھی بنے ہوئے ہیں۔ حج کے علاوہ دوسرے دنوں میں مکہ کے بہت سے لوگ سیر و تفریح کے لیے شام کو ادھر آ جاتے ہیں، اس لیے یہ قہوہ خانے سال بھر آباد رہتے ہیں۔ ہم بھی ایک جگہ بیٹھے، چائے پی اور کچھ دیر آرام کر کے شارع المنصور کے راستے مکہ معظمہ واپس آ گئے۔ شارع المنصور ایک نئی سڑک ہے جو براہِ راست مکہ معظمہ سے عرفات کو جاتی ہے۔ اس سے وقوفِ عرفہ کے روز سامان لانے لے جانے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔

استاذ احمد محمد جمال

اگلے روز (3 دسمبر) علی الصباح استاذ احمد محمد جمال ہمارے ہاں تشریف لائے اور کافی دیر تک بیٹھے پاکستان کے حالات سنتے اور اپنے ہاں کے حالات سناتے رہے۔ استاذ احمد محمد جمال سے وہ تمام حضرات ضرور واقف ہوں گے، جنہوں نے اسلامک کلوکیم 58-57ء میں ہمارے ہاں کے بعض متجددین کے خلاف ان کی تقاریر سنی ہیں۔ یہ اور ان کے بڑے بھائی صالح محمد جمال مکہ معظمہ کے ایک روزنامہ اخبار ''اسدوہ'' کے ایڈیٹر ہیں۔ ''مکتبہ الثقافہ'' کے نام سے ان کا ایک مکتبہ بھی ہے جو مکہ معظمہ کا سب سے بڑا مکتبہ ہے۔ یہ دونوں بھائی حسن البناء شہید کی دعوت سے متاثر ہیں اس لیے بڑے سلجھے ہوئے خیالات

رکھتے ہیں۔صالح محمد جمال کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ صحافیوں کے ایک وفد میں ظہران گئے ہوئے ہیں، اس لیے ہماری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

اسی روز عصر کے بعد نسیم حجازی صاحب اور ان کے ساتھ راولپنڈی کے وکیل قاضی نذیر احمد صاحب عمرہ کے لیے مکہ معظمہ پہنچے اور ان سے مختصر ملاقات رہی۔

پھر عشاء کے بعد ہم بازدید کے لیے شیخ عبدالمہیمن کے ہاں گئے۔

اسی روز ہم عبداللہ بن کلیب کے ہاں صبح کے ناشتہ پر گئے۔انکی رہائش حرم سے کافی دور محلّہ جرول میں ہے۔ وہاں ہماری ملاقات ان کے ایک دوست ذکریا صابر سے بھی ہوئی۔ یہ انڈونیشیا کے رہنے والے ہیں۔تعلیم کی غرض سے کئی سال تک مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں بھی رہ چکے ہیں، اس لیے اردو اچھی جانتے ہیں۔ہم سے اردو ہی میں بات چیت کرتے رہے۔مولانا کی اکثر کتابوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان میں سے بعض کا انڈونیشی زبان میں ترجمہ بھی کر چکے تھے۔

مزید آثار کی زیارت

ساڑھے دس بجے کے قریب ہم پھر آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔اب کی مرتبہ ہمارے ساتھ مکہ معظمہ کے ایک تاجر عطر محمد عالم صاحب اور عبداللہ بن کلیب تھے۔محمد عالم صاحب کی پیدائش ہندوستان ہی میں کسی جگہ کی ہے، لیکن یہ بچپن ہی میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ اب وہاں ان کا عطر کا کاروبار ہے اور ماشاء اللہ وہ اس میں بڑے کامیاب ہیں۔ان سے ہماری ملاقات گزشتہ سفر (56ء) کے دوران عمان میں ہوئی، جب ہم عمان سے دمشق جانے کے لیے موٹر میں سوار ہو رہے تھے، تو یہ بھی بیت المقدس کی زیارت کے بعد دمشق آرہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی موٹر میں سوار ہوئے۔اس لیے پہلے مولانا سے واقف تھے، لیکن ملاقات نہ ہوئی تھی۔ پھر حج کے موقع پر بھی ملاقات رہی۔اب کی مرتبہ انہوں نے آثار دکھانے کی خود ہی پیش کش کی جسے ہم نے قبول کر لیا۔

مسجد محصب و مسجد الکبش

ہم پہلے منیٰ گئے۔ وہاں مسجد محصب، مسجد الکبش اور بعض دوسری مساجد باہر ہی سے

دیکھیں۔ مسجد محصب منیٰ کے راستے میں ہے اور لوگوں کے کہنے کے مطابق اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں حجۃ الوداع سے واپس ہوتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ مسجد الکبش منیٰ کے اندر ہے اور یہ اس جگہ بنی ہوئی ہے جہاں کے متعلق لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ مینڈھا ذبح کیا تھا۔ یہ سب مسجدیں ترکی عہد کی بنی ہوئی ہیں۔ نجدی حضرات کے برعکس ترک اور اشرافِ مکہ بہت خوش عقیدہ واقع ہوئے تھے، اس لیے ہر جگہ کوئی نہ کوئی مسجد بنا ڈالتے تھے، جس کے متعلق انہیں یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ یہاں فلاں واقعہ پیش آیا ہو گا۔ اس لیے جن علماء نے مکہ معظمہ کے آثار کی تحقیق کی ہے، وہ گھروں اور مسجدوں میں دارالارقم کی نسبت کو تو بڑی حد تک صحیح مانتے ہیں، لیکن دوسرے آثار کی نسبت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ محمد عالم صاحب بہت سی چٹانوں کے درمیان سے گزارتے ہوئے ہمیں ایک اور جگہ بھی لے گئے، جس کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مینڈھا یہاں ذبح کیا تھا۔

جبلِ ثور

اس کے بعد ہم جبلِ ثور۔۔۔ وہ پہاڑ جس میں غارِ ثور واقع ہے۔۔۔ دیکھنے کے لیے شارع المنصور کی طرف روانہ ہوئے۔ جب سڑک کے نشانات کے مطابق مکہ معظمہ 9 میل رہ گیا تو جبلِ ثور ہمارے بالکل سامنے تھا۔ اگرچہ اس کا فاصلہ سڑک سے آدھ میل ہو گا۔ جبل نور کی بہ نسبت اس کی اونچائی زیادہ ہے۔ اور اس پر چڑھنے کا راستہ بھی بہت خطرناک ہے۔ غارِ ثور اس کے عین اوپر ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس پر چڑھنے کی ہمت کرتے ہیں، اور جو لوگ چڑھتے ہیں وہ پانی اور کھانا ساتھ لے کر علی الصبح چڑھنا شروع کرتے ہیں اور دوپہر تک غار تک پہنچتے ہیں۔ شاید ہم اس پر چڑھنے کی ہمت کر جاتے، لیکن وقت بہت زیادہ ہو گیا تھا اور دھوپ تیز ہو گئی تھی اور پھر ہمارے پاس کھانے پینے کا بھی کوئی سامان نہ تھا۔ ہم نے موٹر کو سڑک سے نیچے اتار کر اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کی، مگر ایک جگہ ریت میں ہماری موٹر پھنس گئی، بڑی مشکل سے اسے باہر نکالا اور سڑک پر واپس پہنچے۔

جبل نور

غار ثور وہ جگہ ہے جہاں ہجرت کے موقع پر کفارِ مکہ سے چھپنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پناہ لی تھا، اور جس کا قرآنِ کریم کی اس آیت میں ذکر ہوا ہے۔

اذ اخرجه الذين كفروا ثاني اثنين اذهما في الغار اذ يقول لصاحبه لاتحزن ان الله معنا.

''جب کافروں نے اس کو (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو) نکال دیا، وہ دو میں سے دوسرا تھا، (ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیقؓ) جب کہ وہ دونوں ''غار'' میں تھے، اور وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

یہ غار مکہ معظّمہ کے جنوب میں واقع ہے۔ قدیم زمانہ میں مکہ سے یمن کو جو راستہ جاتا تھا وہ اس کے قریب سے گزرتا تھا۔ اس لیے تعجب ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ تو مدینہ منورہ جانا چاہتے تھے اور مدینہ منورہ مکہ کے شمال میں ہے، اس لیے وہ جنوب کی طرف کیسے آئے اور پھر خاص طور پر اس غار کا انتخاب انہوں نے کیونکر کیا، جب کہ پہاڑ کی اس قدر بلندی پر اس کا پتہ لگانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا اور پھر اردگرد کے بہت سے پہاڑ ایسے ہیں جو اپنی شکل وصورت اور اونچائی میں اس پہاڑ سے مشابہ ہیں۔ ممکن ہے یہ انتخاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ کیا ہو یا یہ کہ آپؐ کو یا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مکہ معظّمہ کے اردگرد پہاڑوں سے اتنی واقفیت ہو کہ آپ اس غار کو پہلے سے جانتے ہوں۔ بہر حال چھپنے کے لیے اس غار کے انتخاب میں مصلحت یہ تھی کہ کفارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے راستہ میں تلاش کرتے رہے، حالانکہ حضورؐ اس کے برعکس سمت میں یمن کے راستہ پر ایک ایسے غار میں چھپے ہوئے تھے جس کی طرف ان کا گمان بھی نہ جا سکتا تھا۔

شیخ عقیل عطاس کی دعوت

اسی روز ظہر کے بعد شیخ عقیل عطاس کے ہاں کھانے کی دعوت تھی اور اس کے لیے انہوں نے خاص اہتمام کیا تھا۔ ہمارے علاوہ اس میں شیخ محمد نصیف، استاذ سعید العامودی (ایڈیٹر ماہنامہ الحج) استاذ احمد السباعی (ایڈیٹر ہفتہ وار قریش) شیخ عبدالرحمان مظہر (صدر موطفین برائے ہندو پاکستان) اور استاذ احمد الغزاوی (شاہ سعود کے خاص شاعر اور مجلس شوریٰ کے نائب صدر) بھی شامل تھے، اچھا ہوا اس بہانے ان تمام حضرات سے ملاقات ہوگئی۔

مکہ معظّمہ کے اخوانی نوجوان

اسی روز عشاء کے بعد ہم لوگ مقبول عبدالکافی کے ہاں جرول گئے وہاں بہت نوجوان جمع تھے، جن میں بعض مکہ ہی کے رہنے والے تھے اور بعض خاص طور پر جدہ سے آئے تھے۔ استاذ احمد علی (مدیر کلیۃ الشریعہ) اور شیخ عبدالرزاق حمزہ (خطیب حرم مکی جوان دنوں علاج کے سلسلے میں مصر گئے ہوئے تھے) کے صاحبزادے بھی موجود تھے۔ یہ تمام نوجوان مولانا کی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے مولانا سے مختلف موضوعوں پر سوالات کرنا شروع کیے۔ ان کے سوالات اسی قسم کے تھے جس قسم کے اس سے پہلے ریاض اور ظہران کے نوجوان پیش کر چکے تھے۔ عرب قومیت کے خلاف ان کے جذبات خاص طور پر سخت تھے۔ مولانا نے ان کے تمام سوالات کا اطمینان کے ساتھ جواب دیا، جس کا ان سب پر بہت ہی اچھا اثر پڑا۔

شیخ عبدالمالک بن ابراہیم

اگلے روز (4 دسمبر) ہم شیخ عبدالمہیمن کے ساتھ شیخ عبدالمالک بن ابراہیم کی ملاقات کے لیے گئے۔ یہ مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ 49ء میں جب ہم ریاض گئے تھے تو یہ شاہی مسجد کے خطیب تھے۔ اب حجاز میں ہیئۃ امر بالمعروف ونہی عن

المنکر کے صدر ہیں۔ ان سے کسی خاص موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی۔ ریاض کے علماء وامراء کی خیریت یا پاکستان کے حالات دریافت کرتے رہے۔ چلتے وقت انہوں نے کتابوں کی ایک اچھی مقدار ہمیں بطور ہدیہ پیش فرمائی۔

شیخ عبدالوہاب دہلویؒ

واپسی میں ہم شیخ عبدالوہاب دہلوی اور ان کے چچا شیخ محمد اسماعیل کے ہاں حاضر ہوئے۔ ان کا خاندان دہلی والوں کا مشہور خاندان ہے جو گزشتہ ساٹھ سال سے مکہ ہی میں آباد ہے، لیکن اپنے لباس، طرزِ رہائش ہر چیز میں ابھی تک سخت دہلوی ہے۔ شیخ عبدالوہاب صاحب بڑے عالم اور محقق آدمی ہیں، ان کا کتب خانہ بھی وسیع ہے، اگرچہ لکھتے بہت کم ہیں۔ کبھی کبھار ہی ان کے مضامین الحج اور بعض دوسرے پرچوں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ان کی صحت خراب چلی آرہی ہے[1]۔ دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ وہ مولانا سے تفہیم القرآن کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں مولانا ابوالکلام مرحوم کے متعلق انہوں نے ایک عجیب بات بتائی کہ جب ان کی تفسیر سورۂ فاتحہ ام الکتاب شائع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اس میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفسیر سرے سے نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں کلکتہ گیا اور ان سے ملا، تو میں نے تفسیر میں اس کمی کی طرف انہیں توجہ دلائی، انہوں نے جواب دیا کہ کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لیے میں نے اس آیت کی تفسیر چھوڑ دی۔

حرم کی تعمیر

مکہ معظمہ میں پانچ روز کے اس قیام کے دوران ہمیں حرم کی توسیع اور نئی عمارت کو دیکھنے کا خوب موقع ملا، توسیع وتعمیر کا یہ کام بڑے زوروں پر جاری ہے۔ اس وقت صرف ڈیڑھ طرف سے عمارت مکمل ہوئی ہے۔ ساری عمارت دو منزلہ بنائی جا رہی ہے۔ صفا

1- گزشتہ سال 1962ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون (م۔ع۔جون 63ء)

اورمروہ کے درمیان مسعیٰ کو بھی دوراہا اور دوہرا بنایا جا رہا ہے، بلکہ اسے تو مکمل کر لیا گیا ہے۔ جس وسیع پیمانے پر یہ تعمیر ہو رہی ہے، اسے دیکھ کر لوگوں کو اندازہ ہے کہ اس کی تکمیل میں کم از کم بارہ تیرہ سال اور لگیں گے، لیکن مکمل ہو جانے کے بعد حرم کی وسعت پہلے کی وسعت سے ڈھائی گنا ہو جائے گی، اور اس میں بیک وقت پانچ لاکھ آدمی نماز پڑھ سکیں گے اور اس کا شمار دنیا کی چند بڑی عمارتوں میں ہوگا۔ اندازہ یہ ہے کہ پوری عمارت پر دو ارب روپے کے قریب سرمایہ صرف ہو جائے گا۔ یہ ساری تعمیر شاہ سعود اپنے ذاتی مصارف پر کرا رہے ہیں۔ شاہ سعود کے کارناموں میں اس کا شمار یقیناً سرفہرست ہے۔

مکہ معظّمہ کا موسم

مکہ معظّمہ میں ہمیں جدہ سے بھی زیادہ گرمی محسوس ہوئی۔ نومبر کے آخر اور دسمبر کے شروع کا موسم تھا، لیکن گرمی کا یہ عالم تھا کہ ہم رات کو نہ صرف دروازے کھول کر بلکہ بجلی کا پنکھا لگا کر سویا کرتے تھے۔ گرمی کے علاوہ مچھروں کی بھی بڑی کثرت تھی۔ بجلی کا پنکھا اس لیے لگانا پڑتا تھا کہ مچھروں سے بچنے کے لیے چادر کا اوڑھنا ضروری تھا، لیکن چادر اوڑھتے تھے تو سخت گرمی محسوس ہوتی تھی۔ جب تک ہم مکہ معظّمہ میں ٹھہرے رہے، ہر رات سونے کے سلسلے میں ہمارا یہی معمول رہا۔ صبح کے وقت ہم بہت سے لوگوں کو کھلی چھتوں پر مچھر دانیاں لگا کر سوئے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ ان دنوں میں بھی برف کا استعمال وہاں عام تھا۔

4 دسمبر کو جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد ہم لوگ طائف روانہ ہوئے۔

مکّہ سے طائف

مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان غالباً کوئی باقاعدہ بس سروس نہیں ہے۔ صرف چھوٹی گاڑیاں (ٹیکسیاں) آتی جاتی ہیں۔ فاصلہ 120 کلومیٹر (75 میل کے قریب) ہے، لیکن ٹیکسیوں والے راستے کے خراب ہونے کی وجہ سے کرایہ بہت وصول کرتے ہیں۔ ٹیکسی والے نے ہم سے 75 ریال (100 روپے) وصول کیے۔

ہم نے مکہ معظّمہ پہنچنے کے بعد ہی جمعہ کے روز طائف جانا طے کر لیا تھا۔ اتفاق سے ایک روز حرم میں ہمارے ایک پاکستانی بھائی فیض عالم صاحب سے ملاقات ہوگئی، جو چند سال سے طائف ہی میں مقیم ہیں۔ اور اسی روز مکہ سے طائف واپس جا رہے تھے۔ ان کے ذریعے ہم کو طائف میں قیام اور مشاہدۂ مقامات کا انتظام کرنے میں بڑی سہولت ہو گئی، ورنہ ہمارے لیے طائف بالکل اجنبی مقام تھا اور وہاں ہم کسی کو نہ جانتے تھے۔

جس راستے سے ہم گئے وہ مکہ اور منٰی کی سڑک پر کچھ دور چل کر بائیں ہاتھ مڑ جاتا ہے۔ پھر جبلِ نور کے دامن سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ کر ہم جعرانہ کی طرف مڑ گئے۔ یہ جعرانہ وہی جگہ ہے جہاں غزوۂ حنین و طائف کے بعد طائف سے واپسی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن و بنی ثقیف کا مالِ غنیمت صحابہ کرام میں تقسیم فرمایا تھا، یہ راستہ اگرچہ بہت چلتا ہوا اور باقاعدہ بنا ہوا ہے، لیکن بالکل کچا ہے۔ کہیں سخت ریت آتی ہے اور کہیں پتھریلی زمین۔ دس پندرہ منٹ چلنے کے بعد یہ راستہ بھی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے، بائیں طرف کا راستہ جعرانہ کو جاتا ہے اور دائیں طرف کا شرائع کو۔ ہم شرائع کے راستہ پر چلتے رہے اور کوئی پندرہ بیس منٹ اور چلنے کے بعد شرائع پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے اور پانی کے ایک چشمہ کی وجہ سے آباد ہے۔ جعرانہ یہاں سے ٹھیک شمال کو واقع ہے۔ کہتے ہیں

کہ جعرانہ اور شرائع کے درمیان وہ وادی ہے جہاں جاہلیت کے زمانے کے تین مشہور بازاروں (عکاظ، مجنہ اور ذی المجاز) میں سے مجنہ کا بازار لگا کرتا تھا۔

شرائع سے تقریباً نصف گھنٹہ چلنے کے بعد ہم زیمہ پہنچے، جو ایک نہایت سرسبز و شاداب جگہ ہے اور یہاں بہت سے باغ اور چشمے پائے جاتے ہیں۔ دوسرے درختوں کے علاوہ ہمیں وہاں کیلے کے درخت بھی نظر آئے۔ یہاں اتر کر ہم نے عصر کی نماز پڑھی اور پھر آگے روانہ ہوئے۔ زیمہ کے بعد جو راستہ لوادی الیمانیہ۔۔۔۔شروع ہوا، وہ انتہائی تکلیف دہ (عربوں کی عامی زبان میں بطال) تھا۔ اس پر پتھر کے ٹکڑے اس طرح بکھرے ہوئے تھے جس طرح کسی جگہ نئی سڑک بنانے کے لیے پتھر کے ٹکڑے ڈال دیئے جاتے ہیں اور بعض جگہ ان کے اس طرح ڈھیر بنے ہوئے تھے کہ موٹر کے لیے ان کے درمیان سے راستہ نکالنا مشکل ہو رہا تھا۔ پتھر کے ان ٹکڑوں کو بارش کے زمانہ میں پہاڑی نالے بہا لاتے ہیں۔ حکومت آئے دن راستہ کو ان سے صاف کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر بارش کا پانی ہمیشہ ان کوششوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ اس راستہ میں ہماری موٹر کا ٹائر پھٹ گیا اور اس کی وجہ سے ہمارا بہت سا وقت ضائع ہوا۔ تقریباً پندرہ سولہ میل تک راستے کا یہی حال رہا۔ اس کے بعد قدرے اچھا راستہ آ گیا، لیکن پہاڑوں کے درمیان گھر گیا اور نمایاں طور پر چڑھائی محسوس ہونے لگی۔ ڈرائیور کافی زور لگا کر موٹر چلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوا اور ہم السیل الکبیر پہنچ گئے۔

السیل الکبیر ایک کھلی وادی میں واقع ہے اور اس میں جا بجا چائے کی دکانیں ہیں، جو حج کے دنوں میں تو بہت آباد رہتی ہیں، لیکن اس وقت بھی ہمیں ان پر اچھی خاصی رونق نظر آ رہی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہی السیل الکبیر وہ قرن المنازل ہے جس کو حدیث میں اہل نجد کے لیے میقات قرار دیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قرن المنازل اس کے دائیں طرف (یعنی جنوب میں) ایک پہاڑ کا نام ہے اور یہ اس کے قریب اور اس کی سیدھ میں واقع ہے، اس لیے طائف اور نجد کی طرف سے آنے والے تمام حاجی یہیں سے احرام باندھتے ہیں۔ یہاں بہت سے غسل خانے پائے جاتے ہیں، جن میں پیسے دے کر غسل کیا جا سکتا ہے۔ ایک شاندار نئی مسجد بھی یہاں بنی ہوئی ہے۔ ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں

پڑھی۔ایک نجدی امام صاحب نے جماعت کرائی اور اتنی تیز نماز پڑھائی کہ ہمارے لیے ان کی متابعت کرنا مشکل ہورہی تھی۔

السیل الکبیر کے بعد تھوڑی دور تک راستہ پہاڑ کو کاٹ کر بنایا گیا ہے جس پہاڑ کو کاٹ کر یہ راستہ بنایا گیا ہے۔مشہور مصری صحافی محمد حسین ہیکل نے اس کا نام ذاتِ عرق لکھا ہے۔ ذاتِ عرق کا ذکر حدیث میں اہلِ عراق کے لیے میقات کے طور پر آتا ہے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ ذات عرق یہاں سے شمال کی طرف نجد میں عشیرہ کے قریب کسی جگہ کا نام ہے۔ یہ پہاڑ تو بہرحال اسی زمانہ میں کاٹا گیا ہے۔ پہلے زمانہ میں جو لوگ اس راستے سے سفر کرتے تھے، وہ اس پہاڑ کے گرد چکر لگا کر آتے ہوں گے۔غزوۂ حنین کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ طائف کا محاصرہ کرنے کے لیے اسی راستہ سے تشریف لائے تھے، انہیں بھی یقیناً اس پورے پہاڑ کے گرد چکر لگانا پڑا ہوگا۔

اندھیرے میں اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوسکا، لیکن کہتے ہیں کہ اس پہاڑ کے بعد راستہ دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ دائیں طرف کا راستہ طائف کو جاتا ہے (اور ہم اس پر چلتے رہے ہوں گے) اور بائیں طرف کا راستہ عشیرہ سے ہوتا ہوا ریاض کو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک اور جگہ آئی، جسے السیل الصغیر کہا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں ٹھہرے بغیر اپنا سفر جاری رکھا۔ راستہ کا وہی حال تھا۔کہیں سخت پتھر آجاتے، جن میں موٹر انتہائی آہستہ رفتار سے چلتی اور کہیں قدرے ہموار راستہ آجاتا، جس میں موٹر خوب تیز چلتی۔ یہاں بھی ایک جگہ ہماری موٹر کا ٹائر پھٹ گیا۔ڈرائیور نے اندھیرے میں بڑی مشکل سے اس کی جگہ دوسرا ٹائر لگایا اور ہم آگے روانہ ہوسکے۔شکر ہے ڈرائیور نے عقل مندی کی اور السیل الکبیر میں ٹائر کی مرمت کرالی تھی، ورنہ معلوم نہیں ہم پر کیا گزرتی۔ جب ہم طائف سے صرف 27 کلومیٹر (19 میل کے قریب) رہ گئے تو حوایا کا مقام آیا جہاں طائف کا ہوائی اڈہ ہے۔اور یہاں سے طائف تک نہایت عمدہ پختہ سڑک جاتی ہے۔اس سڑک پر پہنچ جانے کے بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

طائف: 4 تا 6 دسمبر 1959ء

رات کو دس بجے کے قریب ہم طائف پہنچے۔ اندیشہ تھا کہ کہیں فیض عالم صاحب اور دوسرے احباب نے مایوس ہوکر ہمارا انتظار نہ چھوڑ دیا ہو، کیونکہ اصل میں تو ہم نے انہیں مغرب کے بعد پہنچ جانے کا وقت دیا تھا، لیکن الحمد للہ جونہی ہم شہر میں داخل ہوئے فیض عالم صاحب اور ان کے ساتھ مرحوم توختہ اخوند ایک موڑ پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ توختہ اخوند ایک ترکستانی مہاجر تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے کئی سال تک مولانا مودودی کے پاس دارالاسلام میں رہے۔ پھر مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ ہمیں طائف میں ان کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ یکا یک چودہ برس کے بعد ان کی مولانا سے یہ پہلی ملاقات تھی، اس لیے بہت ہی محبت اور عقیدت کے عالم میں بغلگیر ہوئے[1]۔

ترک مہاجرین

ہمارے قیام کا انتظام ان لوگوں نے محلّہ بخاریین میں کیا تھا، جس کی زیادہ تر آبادی روسی ترکستان کے مہاجرین پر مشتمل ہے اور اس لیے اسے محلّہ بخاریین کہا جاتا ہے۔ ہم جس گھر میں ٹھہرے، اس کے ساتھ محلّہ کی مسجد تھی اور اس کے امام وخطیب بھی ایک ترکستانی عالم قاری عبدالسلام صاحب تھے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی بہت سے ترکستانی حضرات تشریف لے آئے اور کافی دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ وہ تھے جو روسی انقلاب کے بعد اپنے وطن سے ہجرت کر کے پہلے ہندوستان آئے تھے اور وہاں کافی عرصہ رہ کر عرب منتقل ہو گئے تھے۔ اس لیے اردو نہ صرف یہ کہ اچھی خاصی جانتے تھے بلکہ ہم سے اردو ہی میں بات چیت کرتے رہے۔ ہمارے توختہ اخوند مرحوم کی زبان خوب تھی۔ گویا ترکی، فارسی، اردو اور عربی کا مرکب اور مرکب بھی نہایت دلچسپ، مثلاً اگر انہیں یہ کہنا ہوتا

1- تقریباً دو سال ہوئے ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ گویا طائف میں ان سے جو ملاقات ہوئی وہ ان سے اس دنیا میں آخری ملاقات تھی (م۔ ع، جون 1963ء)

کہ پانی نہیں آیا، تو وہ کہتے تھے۔ ''آب ما آیا'' اسی طرح کے اور بھی بہت سے دلچسپ فقرے وہ بولا کرتے تھے، جنہیں میں بھول گیا۔ طائف میں ان ترکستانی مہاجرین کے سوا کسی اور سے ہماری واقفیت نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی واقفیت کی ضرورت بھی نہ تھی۔ جس محبت، اخلاص اور عقیدت سے ان حضرات نے ہمارا استقبال کیا اور دو دن تک ہماری مہمانی کی، اس کا کسی دوسرے میزبان میں پایا جانا مشکل تھا۔ محبت، سنجیدگی اور خلوص کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں طور پر ظاہر ہو رہے تھے۔ ان کے متعلق ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور قدرے خوشی بھی کہ ان لوگوں نے عرب میں بھی اتنا عرصہ رہ کر اپنا لباس تبدیل نہیں کیا۔ نہ صرف عرب بلکہ جہاں بھی یہ لوگ رہتے ہیں ہمیشہ اپنا قومی لباس پہنتے ہیں۔ بہروپیوں کی طرح جگہ جگہ لباس تبدیل کرتے نہیں پھرتے، یہ اس بات کی نمایاں دلیل ہے کہ ان حضرات کے اندر مضبوط قومی کیرکٹر ہے۔ ان کے دلوں میں اپنے وطن کو آزاد کرانے اور اس میں پھر سے اسلام کا بول بالا کرنے کا جذبہ پوری طرح موجزن ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزائم میں برکت دے اور دنیا کو ان کا مسئلہ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ افسوس کہ آج دنیا بھر کے مسلمان ان کے مسئلہ کو فراموش کر چکے ہیں۔

طائف کا موسم

طائف میں اگرچہ مکہ معظمہ کی نسبت کافی سردی تھی، لیکن اتنی سردی نہیں تھی جس کا تصور ہم اپنے ذہن میں لیے ہوئے تھے۔ لوگ بھی ہمیں طائف کی سردی سے خوب ڈرا رہے تھے۔ حالانکہ وہاں دسمبر میں بس اتنی سردی تھی، جتنی ہمارے یہاں لاہور میں نومبر کے نصف میں ہوتی ہے۔

طائف کے آثار

ہمارا اگلا سارا دن (5 دسمبر) طائف کے آثار دیکھنے میں صرف ہوا۔ صبح 9 بجے کے قریب ایک ترکستانی دوست احمد جان صاحب اپنی جیپ لے کر ہماری قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ اس میں ہم سب سے پہلے وہ راستہ دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے جس کے متعلق کہا جاتا ہے

کہ ہجرت مدینہ سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنوثقیف پر اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے اسی راستہ سے طائف تشریف لائے تھے۔ یہ راستہ طائف سے وادیٔ ہدا، کراء، شداد اور عرفات سے ہوتا ہوا مکہ معظمہ جاتا ہے۔ کئی سال سے اس پر پختہ سڑک بنانے کا کام ہو رہا تھا۔ کراء طائف اور مکہ معظمہ کے تقریباً وسط میں ایک نہایت بلند پہاڑ ہے اس وقت اس پہاڑ پر دونوں طرف سے سڑک بن چکی تھی، صرف اس پہاڑ کو کاٹ کر راستہ بنانے کا کام باقی تھا اور یہ کام بڑے زور وشور سے ہو رہا تھا۔ ہم اس جگہ تک گئے، جہاں پہاڑ کو کاٹا جا رہا تھا۔ طائف سے کراء تک کافی بلند پہاڑی علاقہ ہے لیکن کراء کے بعد یک لخت گویا میدان آ جاتا ہے اور مکہ معظمہ تک زمین کی بلندی یکساں رہتی ہے۔ پہاڑ پر کھڑے ہو کر وہ سڑک کافی نیچی نظر آ رہی تھی جو شداد اور عرفات سے ہوتی ہوئی مکہ معظمہ کو جاتی ہے۔ اس وقت لوگوں کا اندازہ تھا کہ یہ کام آئندہ چھ ماہ تک مکمل ہو جائے گا، لیکن اس کے مکمل ہو جانے کی خبر ابھی ایک سال پیشتر آئی ہے[1]۔ اب اس راستہ کے مکمل ہو جانے کے بعد طائف اور مکہ معظمہ کے درمیان صرف 65 کلومیٹر (40 میل کے قریب) کی مسافت رہ گئی ہے۔ جبکہ پہلے یہ مسافت 120 کلومیٹر (75 میل کے قریب) تھی اور اتنی مسافت طے کرنے کے بعد ہی لوگ طائف پہنچتے تھے۔ اس راستہ کے مکمل ہو جانے کے بعد طائف کی وسعت اور اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ایک طرف جدہ اور مکہ معظمہ سے اس کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا ہے اور دوسری طرف نجد اور عمان، مسقط وغیرہ کی طرف سے مکہ معظمہ آنے والوں کے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ سعودی حکومت کا ارادہ طائف اور ریاض کے درمیان سڑک کو بھی پختہ کر دینے کا ہے۔

طائف سے کراء اور کراء سے مکہ معظمہ، جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں، وہ راستہ ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لائے تھے۔ اب بھی پیدل اور اونٹ کے چڑھنے اور اترنے کا راستہ بنا ہوا ہے اور غالباً عباسی دور ہی کا بنا ہوا ہے۔

کراء کے راستہ میں ایک وادی آتی ہے جسے وادیٔ محرم کہتے ہیں۔ اسے وادیٔ محرم

1۔ (م۔ ح۔ جون 1963ء)

اس لیے کہتے ہیں کہ فتح طائف کے بعد مکہ معظمہ جاتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ ہیکل نے اپنی کتاب ''فی منزل الوحی'' میں اسی کو قرن المنازل لکھا ہے، معلوم نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے؟ اب یہاں ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے اور یہاں چھوٹا سا قصبہ بھی ہے۔

وادیٔ محرم کے بعد ایک دوسری وادی آتی ہے، جسے وادیٔ ہدا کہتے ہیں۔ یہ نہایت سرسبز وادی ہے۔ یہاں بھی بستی اور کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ واپسی میں ہم تھوڑی دیر کے لیے یہاں ٹھہرے اور ایک مدرسہ میں پانی پیا۔ کہتے ہیں کہ یہاں سے بھی ایک راستہ وادی ثنیہ اور شرائع سے ہوتا ہوا مکہ معظمہ جاتا ہے اور یہ وہ راستہ ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی مرتبہ (جب کہ آپؐ بنو ثقیف پر دعوت حق پیش کرنے کے لیے طائف تشریف لائے تھے اور طائف کے سرداروں نے نہ صرف آپ کی دعوت قبول نہیں کی تھی بلکہ آپؐ کو سخت زخمی کیا تھا۔) طائف سے مکہ معظمہ واپس ہوئے تھے۔ پیدل یا اونٹ کے ذریعے سفر کرنے والے لوگ اس راستہ سے بھی سفر کرتے ہیں۔

دوپہر کے قریب ہم کراء سے طائف واپس آتے ہوئے مثناۃ گئے جو موجودہ طائف سے ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر جنوب مغرب کی طرف ایک چھوٹی سی بستی ہے اور طائف ہی کا ایک حصہ شمار ہوتی ہے۔ یہ بستی اس جگہ واقع ہے جس کے قریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اصل طائف آباد تھا، اس لیے ہماری دلچسپی کے آثار بھی یہیں تھے۔ ایک خاص چیز جو ہم نے یہاں محسوس کی، وہ یہ کہ یہاں اگرچہ خاصی آبادی تھی اور باغ، مکان اور گلیاں نہایت شاندار بنی ہوئی تھیں، لیکن یہاں کوئی آدمی ہمیں نظر نہ آیا۔ گویا پوری بستی شہر خموشاں تھی۔ یہ چیز ہم ہی نے محسوس نہیں کی، بلکہ بعد میں جب میں نے ہیکل کی کتاب ''فی منزل الوحی'' دیکھی تو انہوں نے بھی اس میں اس بستی کی بے رونقی اور سنسان پن کا ذکر کیا ہے۔ کیا یہ ایک نبی اور وہ بھی خاتم النبیین اور سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ٹھکرانے اور انہیں اذیت پہنچانے کی پھٹکار تو نہیں ہے؟

یہاں دو باغوں میں دو چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنی ہوئی ہیں، جن میں سے ایک کو مسجد علی کہتے ہیں اور دوسری کو مسجد حبشی۔ یہ دونوں بالکل غیر آباد ہیں۔ ان میں سے مسجد
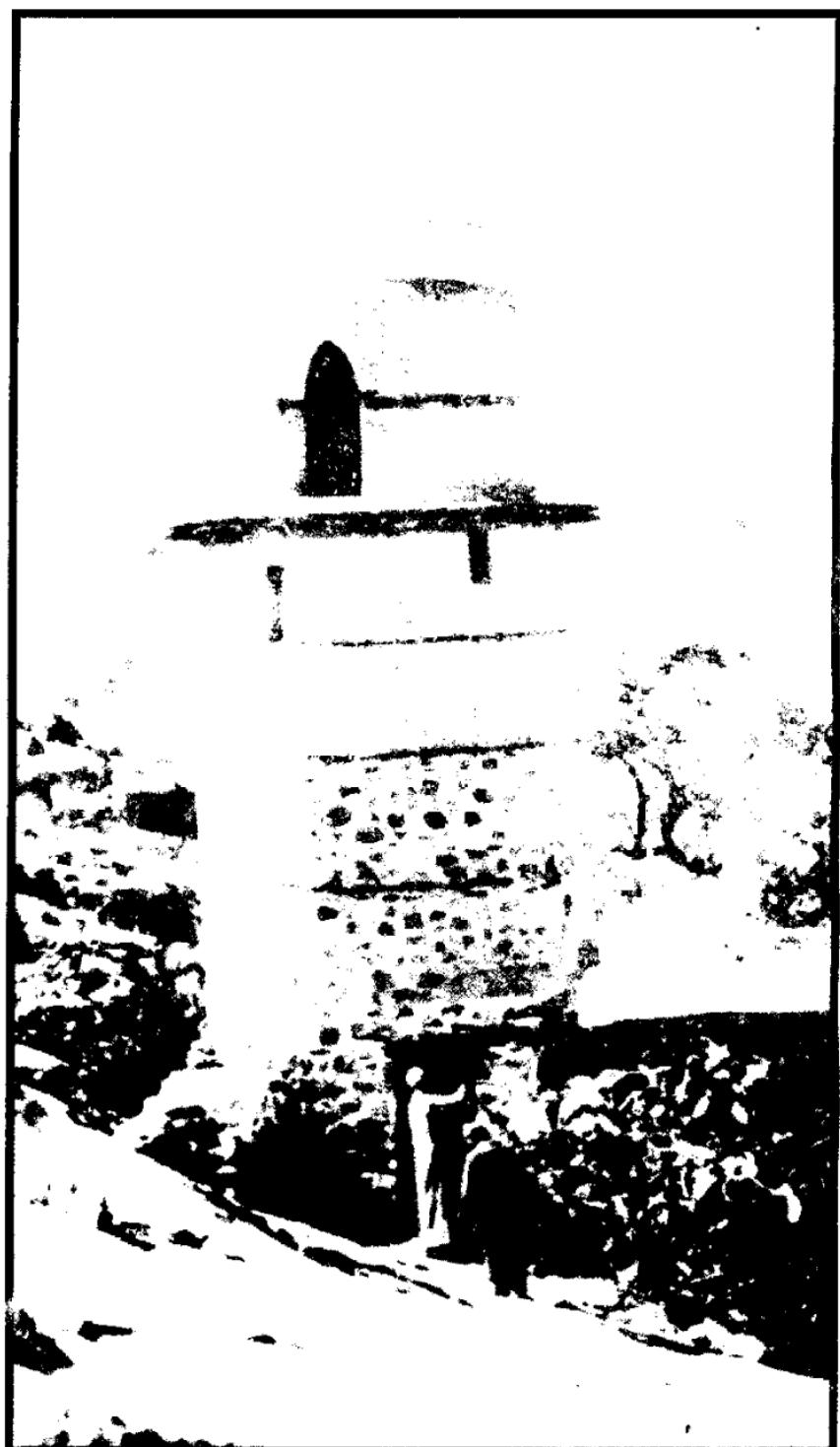
طائف ۔ مسجد علی ۔ اس مقام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زخمی ہونے کے بعد رسول ﷺ نے یہاں آرام فرمایا اور حبشی غلام نے انگور پیش کیے ۔

علی کو (جو ایک باغ کے دروازے کے ساتھ ہے) ہم نے کھولا تو محسوس ہوا کہ گویا مدت دراز سے نہ کسی نے اس مسجد کو کھولا ہے اور نہ یہاں جھاڑو دی ہے۔ اذان اور نماز با جماعت کا تو سوال ہی کیا؟ دوسری مسجد یعنی مسجد الحبشی ایک باغ کے اندر ہے۔ اس تک تو پہنچنا بھی آسان نہیں تھا۔ ہم نے باغ کی دیوار پر چڑھ کر باہر ہی سے اس کا مشاہدہ کیا۔

ان دونوں مسجدوں میں سے ایک مسجد بہرحال اس جگہ بنی ہوئی ہے جہاں زخمی ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) نے آرام فرمایا اور جہاں عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے نصرانی غلام سیدنا عداس ؓ نے آپ ؐ کی خدمت میں انگور لا کر پیش کیے تھے، لیکن یہ مسجد کون سی ہے؟ اس کے متعلق ہمارے ساتھ جو لوگ تھے، قطعی بات نہیں کہہ سکے، اور نہ خود بستی میں تلاش کے باوجود ہمیں کوئی ایسا آدمی مل سکا، جو اس بارے میں کوئی قطعی بات کہہ سکتا، ہیکل نے اپنی کتاب میں جس مسجد عداس کا ذکر کیا ہے، وہ مسجد علی ہے۔

دونوں مسجدوں کے درمیان ایک کچا راستہ مشرق سے مغرب کو جاتا ہے، جسے وادی وج کہتے ہیں۔ یہ کافی لمبی وادی ہے اور حدیث میں اس وادی میں شکار سے منع کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ طائف کے محاصرہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صحابہ کرام ؓ کو جمع کر کے ان کی صف بندی فرمائی تھی۔

اس کے بعد ہمارے ساتھی مثناہ ہی میں ہمیں ایک اور جگہ لے گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جسے مسجد کوع کہتے ہیں اور اس کے پہاڑ پر ایک بڑا پتھر اس طرح رکھا ہوا ہے گویا لٹک رہا ہے اور زمین پر پہنچنے سے صرف نصف گز کے فاصلہ پر رک گیا ہے۔ طائف کے لوگوں میں مشہور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس پہاڑ کے دامن میں آرام فرما رہے تھے کہ اوپر سے کفار نے یہ پتھر آپ ؐ پر لڑھکا دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے اس کو رک جانے کا حکم دیا، تو وہ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ ہمیں تو یہ بات سراسر افسانہ معلوم ہوئی۔ اس کا ذکر سیرت کی معتبر کتابوں میں بھی نہیں ملتا۔

عصر کے بعد ہم طائف کی ایک اور مسجد دیکھنے کے لیے گئے، جسے مسجد ابن عباس ؓ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت وسیع اور پرانی بنی ہوئی مسجد ہے۔ اس کی دائیں طرف ایک حجرے میں حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی قبر ہے، جس پر تالا لگا ہوا ہے اور کوئی شخص اسے جھانک

کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت اس مسجد کے ساتھ سامنے کی طرف ایک دوسری شاندار مسجد نئے طرز پر بن رہی تھی اور غالباً اب مکمل ہو چکی ہو گی۔

مسجد ابن عباسؓ کے محلِ وقوع کو دیکھتے ہوئے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں محاصرہ طائف کے موقع پر مسلمانوں کا لشکر ٹھہرا تھا اور جنگ ہوئی تھی۔ اس کے بالکل سامنے جنوب مغرب میں ان صحابہ کرامؓ کی قبریں ہیں جو غزوۂ طائف میں شہید ہوئے۔ لوگوں نے ہمیں بتایا کہ پہلے ان قبروں پر کتبے بھی لگے ہوئے تھے، لیکن اب یہ کتبے مٹا دیے گئے ہیں۔

مسجد ابن عباسؓ کے سامنے مغرب کی جانب تھوڑے فاصلہ پر ایک قلعہ کے آثار ہیں، جو غالباً پرانے قلعہ طائف ہی کے مقام پر بنا ہوا تھا۔ اگرچہ موجودہ آثار بنوثقیف کے پرانے قلعہ کے نہیں ہیں، لیکن غالباً جگہ وہی ہے، خصوصاً جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ لگانے اور لشکرِ السلام کے ٹھہرنے کی جگہ اور قبورِ شہداء اس کے قریب واقع ہیں۔

مسجد ابن عباسؓ کے پاس سڑک پر پتھر کا ایک بڑا ٹکڑا رکھا ہوا ہے، جس کے متعلق طائف کے لوگوں میں مشہور ہے کہ یہ لات (وہ بت جس کی بنوثقیف پوجا کرتے تھے اور بعد میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسے توڑ ڈالا تھا) کا ٹکڑا ہے۔ مگر اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

مسجد ابن عباسؓ، قبور شہداء اور قلعہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ ایک اور مسجد میں آئے جو طائف کے کئی بازاروں کے درمیان واقع ہے اور کافی وسیع اور پرانی بنی ہوئی ہے۔ اسے مسجد الہادی کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جگہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو وعظ فرمایا تھا اور اسی لیے اس جگہ پر جو مسجد بعد میں بنائی گئی اسے مسجد الہادی نام دیا گیا۔ ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کی۔

ترک حضرات کی دعوت

رات کو عشاء کے بعد ترک حضرات نے ایک جگہ ہماری دعوت کا اہتمام کیا، جس میں ان کے اکثر بزرگ اور علماء موجود تھے۔ اس بہانے ہمیں ان کے ساتھ اطمینان سے مل بیٹھنے اور ان کے حالات سننے کا موقع ملا۔ بے چارے بڑی تکلیف اور کسمپرسی کی حالت میں

ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ اگرچہ انہیں سعودی عرب میں رہتے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے۔ مگر ابھی تک انہیں تابعیہ (مستقل شہریت) نہیں دیا گیا، جس کی وجہ سے انہیں آئے دن دفتروں اور تھانوں کا چکر لگانا پڑتا ہے، اور ہر سال اپنی مدتِ اقامت بڑھوانے کے لیے 42,40 ریال فی کس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ جب تک تابعیہ نہ ہو وہ عرب میں کسی جگہ شادی نہیں کر سکتے، بلکہ اگر ان کا کوئی آدمی مر جائے تو عام قبرستان میں دفنانے میں بھی بڑی رکاوٹیں اور دقتیں پیش آتی ہیں۔ چینی ترکستان کے مہاجرین کو اس بات پر بھی مجبور کیا گیا کہ وہ چینی سفیر سے پاسپورٹ لیں اور پھر یہاں ویزا لے کر جب تک ویزا کی توسیع ہوتی رہے مقیم رہیں۔ مسلمان حکومتوں کے لیے مغربی تصور قومیت کی یہ تقلید اسلامی تصورات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اگر یہ لوگ کفار کے ظلم وستم سے تنگ آ کر مسلمان ملکوں میں پناہ نہ ڈھونڈیں تو اور کہاں ڈھونڈیں اور مسلمان ملک بھی انہیں پناہ نہ دیں تو پھر ایمان کا رشتۂ اخوت کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ ترکستانی مہاجر درحقیقت اس زمانے کے تمام مہاجرین سے زیادہ ہمدردی اور ہر قسم کی امداد کے مستحق ہیں۔ اور لوگوں کی ہجرت میں تو کوئی دوسرا جذبہ بھی کارفرما ہوسکتا ہے، لیکن ان کی ہجرت کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں اسلام ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا اور کمیونسٹوں کے غلبہ کے بعد وہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے چونکہ وہ اپنے دین کو محفوظ نہ رکھ سکتے تھے۔ اس لیے انہیں وہاں سے ہجرت کرنا پڑی۔ ایسے حالات میں انہیں سب سے بڑھ کر مسلمان ملکوں میں امان ملنا چاہیے تھی، لیکن افسوس ہے کہ افغانستان، ایران، ترکی اور عرب کہیں بھی ان سے وہ معاملہ نہیں کیا گیا جو اسلامی برادری کے شانِ شایان ہوتا۔

ترک حضرات کے کھانے عربوں سے مختلف اور ہمارے ہاں سے کافی مشابہ ہیں۔ ان کے متعلق خاص طور پر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ لوگ دن رات میں کسی وقت پینے کے لیے پانی استعمال نہیں کرتے، نہ سردیوں میں اور نہ گرمیوں میں، پینے کے لیے ہمیشہ چائے استعمال کرتے ہیں اور وہ بھی بغیر دودھ اور بغیر شکر کے۔ ہم لوگوں کے لیے شکر اور دودھ کا انہوں نے خاص طور پر اہتمام کیا تھا۔

طائف سے واپسی

اگلے روز (6دسمبر) صبح دس بجے کے قریب ہم طائف سے مکہ معظّمہ روانہ ہوئے۔ بہت سے ترک حضرات شہر سے باہر بہت دور تک ہمیں الوداع کہنے کے لیے ساتھ آئے۔ یقیناً ان لوگوں کی محبت، اخلاص اور مہمان نوازی ہم کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔

موقع عُکاظ

حوایا (طائف کا ہوائی اڈہ) کے قریب طائف سے آتے ہوئے دائیں طرف ایک کھلی وادی نظر آئی، جس کے متعلق اکثر محققین کا خیال ہے کہ سُوق عُکاظ اس وادی میں لگا کرتا تھا۔ بعض محققین اس کا موقع سیل کبیر میں اور بعض دوسری جگہوں پر بتاتے ہیں۔

حنین

سیل کبیر پہنچ کر ہم نے عمرہ کا احرام باندھا اور کچھ دیر وہاں رک کر آگے روانہ ہوئے۔ طائف جاتے ہوئے ہمارا ڈرائیور بالکل جاہل تھا، اس لیے وہ راستہ کی کوئی چیز ہمیں نہ بتا سکا۔ آتے ہوئے جو ڈرائیور ملا، وہ قدرے پڑھا لکھا تھا۔ زیمہ اور شرائع کے درمیان سڑک کی دائیں طرف ایک کھلے میدان کے متعلق اس نے بتایا کہ غزوۂ حنین یہاں واقع ہوا تھا۔ ہم نے موٹر سے اتر کر اس کی متعدد تصویریں لیں۔ افسوس یہاں بھی کوئی علامت موجود نہیں ہے۔

پھر مکہ معظّمہ: 6 تا 8 دسمبر 1959ء

ظہر کے وقت ہم مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔ اپنی جائے قیام پر سامان رکھ کر عمرہ کے لیے نکلے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس سے فارغ ہو کر واپس قیام گاہ پر آئے۔

حُدَیبیہ

7دسمبر کو عصر کے بعد ہم شیخ سلیمان الصنیع عقیل عطاس کے ساتھ مسجد حدیبیہ دیکھنے

مقام بیعت رضوان ۔ مکہ اور جدہ کے درمیان

وادی حنین۔ طائف اور مکہ کے درمیان

کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ مسجد، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، مکہ معظمہ اور جدہ کے درمیان سڑک کے عین کنارے واقع ہے۔ مکہ معظمہ سے اس کا فاصلہ 22 کلومیٹر (تقریباً ساڑھے تیرہ میل) ہے۔ یہ مسجد اس مقام پر واقع ہے جہاں صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرامؓ کا لشکر ٹھیرا تھا۔ اس کی جو عمارت ہم نے دیکھی، وہ 1255ء کی بنی ہوئی تھی۔ 1360ھ میں اس کی مرمت ہوئی۔ اس کے اندر محراب کے پاس ایک کتبہ لگا ہوا تھا، جس پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی[1]۔

سفید تختہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلما دخل علیها زکریا

سیاہ تختہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هذا مسجد الرضوان

مأثرة من مآثر حبیب المنان

عمره المنتقل الی رحمته الرحمان

المغفور له السلطان محمد۔۔۔۔خان(1255ھ)

سفید تختہ

لقد رضی اللہ عن المومنین

ازبیا یعرنك۔۔۔۔ رمم هذا

المسجد سنة(1361ھ)

اس مسجد کی بائیں طرف وہ راستہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ معظمہ تشریف لائے تھے۔ یہ راستہ وادی فاطمہ کو جاتا ہے، جو ایک نہایت سرسبز

1- 61ء میں سعودی حکومت نے اس عمارت کو گرا کر اس کی جگہ نئی شاندار عمارت تعمیر کرائی ہے۔ (م۔ع، جون 1963ء)

وشاداب وادی ہے۔ جدہ شہر کو سارا پانی اسی وادی سے مہیا کیا جاتا ہے۔ اس کا قدیم اور اصل نام مرّ الظہران ہے۔

اس مسجد کے قریب بائیں طرف ایک چار دیواری کے اندر شمیسی گاؤں کے لوگوں کا قبرستان ہے۔ شمیسی اس گاؤں کا جدید نام ہے۔ اس کا اصل اور قدیم نام حدیبیہ ہے، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔

ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کی اور پھر مکہ معظمہ واپس آ گئے۔

استاذ احمد علی واستاذ سعید العامودی

رات کو عشاء کے بعد استاذ احمد علی اور استاذ العامودی مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ استاذ احمد علی مکہ معظمہ کے کلیۃ الشریعہ کے مدیر (پرنسپل) ہیں۔ ادب اور تاریخ سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔ مکہ معظمہ کے ''المنہل'' (ماہنامہ) اور الحج (ماہنامہ) میں ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے والد ہندوستان ہی کے رہنے والے تھے اور بعد میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے۔ استاذ احمد علی کی پیدائش مکہ معظمہ ہی میں ہوئی۔ لیکن گھر کے ماحول کی وجہ سے اردو اچھی خاصی جانتے ہیں۔ مولانا سے عربی اور اردو، دونوں زبانوں میں گفتگو کرتے رہے۔ ان دنوں ''آلِ سعود'' نامی ان کی ایک کتاب تازہ تازہ شائع ہوئی تھی، اس لیے انہوں نے اس کا ایک ایک نسخہ مولانا، چودھری صاحب اور مجھے ہدیۃً پیش فرمایا۔ استاذ سعید العامودی ''الحج'' کے ایڈیٹر ہیں اور بہت ہی سنجیدہ اور باوقار آدمی ہیں۔ ان کی ادارت سے پہلے ''الحج'' ایک معمولی پرچہ تھا، جس میں زیادہ تر مضامین حج ہی سے متعلق ہوا کرتے تھے یا پھر حکومت کے اعلانات شائع ہوتے تھے، لیکن اب یہ ایک اعلیٰ درجہ کا علمی پرچہ بن گیا ہے۔ ان دونوں حضرات سے ''دنیا میں دعوتِ اسلامی کی کامیابی کے امکانات'' پر گفتگو رہی۔ ہمارے پاس مولانا کی عربی کتابوں میں سے چند کتابیں تھیں، وہ ہم نے انہیں پیش کیں اور باقی بعد میں دمشق سے بھجوا دیں۔

جدہ روانگی

ظہر کی نماز کے بعد ہم نے طواف وداع کیا اور پھر جدہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

پھر جدہ: 8 تا 13 دسمبر 1959ء

عصر کے بعد ہم جدہ پہنچ گئے۔ رات گئے تک مختلف پاکستانی اور عرب دوست ملاقات کے لیے آتے رہے۔ آنے والوں میں ایک صاحب شیخ احمد سلیمان العمشاوی بھی تھے، جو شیخ مصطفیٰ عالم کی طرح دراصل مصری ہیں۔ ان کا تعلق بھی اخوان سے تھا، اس لیے جیل میں بھی رہے، لیکن جیل سے رہا ہوتے ہی حج کے لیے مکہ معظمہ چلے آئے اور اب انہوں نے جدہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔

مصری سفارت خانہ

9 دسمبر کو چودھری غلام محمد صاحب مصری سفارت خانہ گئے۔ میری طبیعت جدہ پہنچتے ہی خراب ہو گئی تھی، اس لیے میں ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ ہماری پہلی ملاقات کے بعد مصری سفیر نے ہمارے متعلق اپنی حکومت کو تار دیا تھا۔ وہاں سے ان کے نام وزارتِ مواصلات اور وزارتِ خارجہ کا مشترک تار آیا کہ وہ ہمارا ''بخوشی'' استقبال کریں گے اور جزیرہ نما سینا کے سفر میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں گے اور یہ بھی لکھا کہ سفیر انہیں ہمارے پہنچنے کی اطلاع دیں۔

شیخ محمد نصیف کی دعوت

10 دسمبر کو دوپہر کے وقت شیخ محمد نصیف کے ہاں مولانا کے اعزاز میں دعوت تھی۔ مولانا اور چودھری صاحب وہاں گئے۔ میں اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ دعوت میں جن حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں مستشار السفیر المغربی (سفیر مراکش کے ایڈوائزر) بھی تھے۔ مغرب عربی (مراکش) کے ماہنامہ ''دعوۃ الحق'' میں مولانا کے مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں، اس لیے وہاں کے لوگ مولانا سے اچھی طرح

واقف ہیں، چنانچہ دعوۃ الحق کا ایک تازہ پرچہ جس میں مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، مستشار صاحب نے مولانا کو دیا۔

جدہ ریڈیو کو انٹرویو

عصر کے قریب عبداللہ عباس ندوی (جو سعودی ریڈیو جدہ میں اردو پروگرام کے ذمہ دار ہیں) ہماری جائے قیام پر آئے۔ انہوں نے مولانا سے اردو میں چند سوالات کیے اور مولانا نے ان کے جوابات دیے۔ ان سوالات و جوابات کو مندرجہ ذیل شکل میں ٹیپ ریکارڈ کر لیا گیا، اور انہیں اگلے دن اردو میں اور اس سے اگلے دن عربی میں ریڈیو سے نشر کیا گیا۔

سوال: جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے جناب دوسری مرتبہ حجاز تشریف لائے ہیں۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے مسرت محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ مناسب سمجھیں گے کہ اس سفر میں عمرہ کے علاوہ اپنے مقاصدِ سفر سے مطلع فرمائیں؟

جواب: میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس مبارک سرزمین میں دوبارہ حاضر ہونے کا موقع عطا فرمایا اور دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس خطہء پاک کی زیارت کا بار بار موقع بخشے۔ میرے اس سفر کی غایت عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ یہ ہے کہ ان مقامات اور علاقوں کا بچشم خود مشاہدہ کروں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یا جن سے قرآن مجید کے نزول یا سیرت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا خاص تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں مکہ معظمہ اور طائف کے بعد اب میں بدر، مدینہ منورہ، خیبر، مدائن صالح، تبوک اور مدین کا قصد رکھتا ہوں۔ پھر اردن میں خاص تاریخی مقامات کو دیکھتا ہوا دمشق جاؤں گا اور وہاں سے مصر اور جزیرہ نما سینا کا رخ کروں گا۔

سوال: جماعت اسلامی نے دین کی جو خدمت کی اور کر رہی ہے اس سے تقریباً اردو خواں حلقہ بہت حد تک واقف ہے، اس لیے معلوم یہ کرنا ہے کہ جن حالات سے اس وقت آپ گزر رہے ہیں ان میں جماعت نے اپنی دینی خدمات کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے ہیں؟

جواب: جماعت اسلامی اس وقت پاکستان میں موجود نہیں ہے[1]۔ اب میں اپنی ذاتی حیثیت میں دین کی اشاعت و تبلیغ کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں، اسی طرح جو لوگ جماعت اسلامی سے وابستہ تھے وہ سب مجھے امید ہے کہ اپنی انفرادی حیثیت میں دعوت الی اللہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی سعی میں مشغول ہوں گے کیونکہ جماعت چاہے موجود نہ ہو مگر ایک مومن و مسلم ہونے کی حیثیت سے ہم پر خدا کے دین کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں وہ کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتے۔

سوال: عرب ممالک یا دوسرے ممالک میں برصغیر کے رہنے والے جو لوگ عارضی طور پر مقیم ہیں ان کو آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ یعنی یہ کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے کیا کریں؟

جواب: ہندوستان و پاکستان کے جو لوگ عرب ممالک میں مقیم ہیں ان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ اوّلاً وہ اس نادر موقع سے فائدہ اٹھائیں جو ممالک عربیہ میں قیام سے انہیں حاصل ہوا ہے اور عربی زبان سے اچھی واقفیت پیدا کریں۔ ثانیاً وہ اپنے اوقات کا ایک حصہ قرآن و سنت اور تاریخ اسلام کے مطالعے کے لیے مخصوص کر لیں۔ ثالثاً وہ تہذیب مغربی کے اس سیلاب سے بچنے کی پوری کوشش کریں جو ہمارے برصغیر کی بہ نسبت عرب ممالک میں بہت تیزی کے ساتھ امڈا چلا آ رہا ہے۔ اور رابعاً وہ احکام اسلامی کی شدت کے ساتھ پابندی کریں اور اپنے لیے آج کے اصل عرب کو نہیں بلکہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب ہی کی زندگیوں کو نمونہ سمجھتے رہیں۔

سوال: عرب قومیت اس لحاظ سے کہ وہ ایک مرحلہ ہے، دوسرے مرحلہ میں جامعہ اسلامیہ کا تصور عرب قومیت کے لیڈروں کے ذہن میں موجود ہے اور صرف سامراجیت سے نجات پانے کے لیے ایک وقتی ذریعہ کے طور پر اس تحریک کو بڑھایا جا رہا ہے۔ نیز موجودہ حالات میں جن سے عرب دو چار ہیں اتحاد اسلامی کی تحریک ان کے لیے مضر ہو گی، ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا آپ ہمیں اپنی رائے سے مطلع

1- واضح رہے کہ یہ انٹرویو 59ء کے آخر کا ہے جبکہ پاکستان میں مارشل لاء نافذ تھا (م۔ع)

فرمائیں گے۔

جواب: میں ابھی تک یہ سمجھنے سے معذور ہوں کہ عرب قومیت اور اسی طرح دوسری جغرافیائی قومیتیں واقعی جامعہ اسلامیہ کے تصور کی راہ میں ابتدائی مرحلہ بن سکیں گی۔ اس کے برعکس مجھے سخت اندیشہ ہے کہ اگر ہم عرب اور غیر عرب، ترک اور غیر ترک، پاکستانی اور غیر پاکستانی کی تفریق کو نشوونما دیتے چلے گئے تو ایک وقت وہ آ جائے گا جب عالمگیر امت مسلمہ کی وحدت کا خواب بھی ہم مشکل ہی سے دیکھ سکیں گے۔ اسی طرح میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ مغربی یا مشرقی استعمار سے نجات پانے کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی جغرافیائی قومیتیں ہمارے لیے کیسے مددگار بن سکتی ہیں۔ دنیا میں مسلمان بحیثیت مجموعی 50 کروڑ سے کم نہیں اور زمین کا بہت بڑا رقبہ بے شمار وسائل کے ساتھ ان کے قبضے میں ہے۔ نیز روئے زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں جو کلمۂ توحید کے ماننے والوں سے خالی ہو۔ اگر ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے متحد ہوں تو دنیا کی کوئی سامراجی طاقت ایسی نہیں ہے جو ہمارا وزن محسوس کیے بغیر رہ سکے۔ ہماری دوستی بھی ہر طاقت کے لیے اہم ہوگی اور دشمنی بھی اہم۔ اور ہم مل کر ہر استعمار کا مقابلہ زیادہ قوت کے ساتھ کر سکیں گے۔ لیکن اگر ہم زبان یا وطن یا نسلی بنیاد پر الگ الگ کیمپ بنا ڈالیں تو ہمارا ہر کیمپ بجائے خود کمزور ہوگا۔ اور ہم میں سے کسی کی بھی اتنی طاقت نہ ہوگی کہ کوئی استعماری طاقت ہم سے ڈرے یا کوئی دوسری طاقت ہماری دوستی یا دشمنی کی اہمیت محسوس کرے۔

سامعین کے نام پیغام

سوال: کیا جناب عام سننے والوں کے نام کوئی پیغام دینا پسند فرمائیں گے؟

جواب: میرے سامعین اس وقت غالباً سب کے سب مسلمان ہی ہیں۔ ان کو میرا پیغام یہ ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ادا کریں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ آپ صرف اتنا کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم نے خدا کو اور اس کے دین کو مان لیا۔ بلکہ جب آپ نے خدا کو اپنا خدا اور دین کو اپنا

دین مانا ہے تو اس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جن کا شعور آپ کو ہونا چاہیے، اور جن کو ادا کرنے کی آپ کو فکر ہونی چاہیے۔ اگر آپ انہیں ادا نہ کریں گے تو اس کے وبال سے نہ دنیا میں چھوٹ سکیں گے نہ آخرت میں۔ وہ ذمہ داریاں کیا ہیں؟ وہ صرف یہی نہیں ہیں کہ آپ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، حج کریں اور زکوٰۃ دیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ معاملات میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے ضابطہ پر عمل کریں۔ بلکہ ان سب کے علاوہ ایک بڑی اور بہت بھاری ذمہ داری آپ پر یہ بھی عاید ہوتی ہے کہ آپ تمام دنیا کے سامنے اس حق کے گواہ بن کر کھڑے ہوں جس پر آپ ایمان لائے ہیں۔ مسلمان کے نام سے آپ کو ایک مستقل امت بنانے کی واحد غرض جو قرآن میں بیان کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ آپ بندگانِ خدا پر شہادت حق کی حجت پوری کر دیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

اور اس طرح ہم نے بنایا تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دو۔ اور رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے۔

یہ آپ کی امت کا عین مقصد وجود ہے جسے آپ لوگوں نے پورا نہ کیا تو گویا اپنی زندگی ہی اکارت گنوا دی، یہ آپ پر خدا کا عائد کیا ہوا فرض ہے کیونکہ خدا کا حکم یہ ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا کی خاطر اٹھنے والے اور ٹھیک ٹھیک راستی کی گواہی دینے والے بنو۔

اور یہ نرا حکم ہی نہیں تاکیدی حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ

اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس فرض کو انجام نہ دینے کا نتیجہ کیا ہے۔ آپ سے پہلے اس گمراہی کے کٹہرے میں یہودی کھڑے کئے گئے تھے۔ مگر انہوں نے کچھ تو حق کو چھپایا اور کچھ حق کے خلاف گواہی دی اور فی الجملہ حق کے نہیں باطل کے گواہ بن کر رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے انہیں دھتکار دیا اور ان پر وہ پھٹکار پڑی کہ:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

ذلت (و رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔

یہ شہادت جس کی ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جو حق آپ کے پاس آیا ہے، جو صداقت آپ پر منکشف کی گئی ہے، انسان کے لیے فلاح و نجات کی جو راہ آپ کو دکھائی گئی ہے، آپ دنیا کے سامنے اس کے حق و صداقت ہونے پر اور اس کے براہِ راست ہونے پر گواہی دیں۔۔۔ ایسی گواہی جو اس کے حق و راست ہونے کو مبرہن کر دے اور دنیا کے لوگوں پر دین کی حجت پوری کر دے۔ یہ شہادت دو طرح ہی کی ہو سکتی ہے۔ ایک قولی شہادت، دوسرے عملی شہادت۔

قولی شہادت کی صورت یہ ہے کہ ہم زبان اور قلم سے دنیا پر اس حق کو واضح کریں جو انبیاء کے ذریعہ سے ہمیں پہنچا ہے۔ سمجھانے اور دل نشین کرنے کے جتنے طریقے ممکن ہیں ان سب کو استعمال کر کے، تبلیغ دعوت اور نشر و اشاعت کے جتنے طریقے ممکن ہیں ان سب سے کام لے کر، علوم و فنون نے جس قدر مواد فراہم کیا ہے وہ سب اپنے ہاتھ میں لے کر ہم دنیا کو اس دین کی تعلیم سے روشناس کریں جو خدا نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے۔ فکر و اعتقاد میں، اخلاق و سیرت میں، تمدن و معاشرت میں، کسب معاش اور لین دین میں، قانون اور نظم عدالت میں، سیاست اور تدبیر مملکت میں اور بین الانسانی

معاملات کے تمام دوسرے پہلوؤں میں، اس دین نے انسان کی رہنمائی کے لیے جو کچھ پیش کیا ہے اسے ہم خوب کھول کھول کر بیان کریں، دلائل اور شواہد سے اس کا حق ہونا ثابت کریں، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے اس پر معقول تنقید کر کے بتائیں کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ اس قولی شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ امت مجموعی طور پر ہدایت خلق کے لیے اسی طرح فکر مند نہ ہو جس طرح انبیاء علیہم السلام، انفرادی طور پر اس کے لیے فکر مند رہا کرتے تھے۔ یہ حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام ہماری تمام اجتماعی کوششوں اور قومی سعی و جہد کا مرکزی نقطہ ہو۔ ہم اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں اور اپنے وسائل و ذرائع اس پر لگا دیں۔ ہمارے تمام کاموں میں یہ مقصد لازماً ملحوظ رہے، اور ہم اپنے درمیان سے کسی ایسی آواز کو اٹھنے کو تو کسی حال میں برداشت ہی نہ کریں جو حق کے خلاف شہادت دینے والی ہو۔

رہی عملی شہادت، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان اصولوں کا عملاً مظاہرہ کریں جن کو ہم حق کہتے ہیں۔ دنیا صرف ہماری زبان ہی سے ان کی صداقت کا ذکر نہ سنے بلکہ خود اپنی آنکھوں سے ہماری زندگی میں ان کی خوبیوں اور برکتوں کا مشاہدہ کر لے۔ وہ ہمارے برتاؤ میں اس شیرینی کا ذائقہ چکھ لے جو ایمان کی حلاوت سے انسان کے اخلاق و معاملات میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ خود دیکھ لے کہ اس دین کی رہنمائی میں کیسے اچھے انسان بنتے ہیں، کیسی عادل سوسائٹی تیار ہوتی ہے، کیسی صالح معاشرت وجود میں آتی ہے، کس قدر ستھرا اور پاکیزہ تمدن پیدا ہوتا ہے، کیسے صحیح خطوط پر علوم و ادب اور فنون کا نشو و نما ہوتا ہے۔ کیسا منصفانہ، ہمدردانہ اور بے نزاع معاشی تعاون رونما ہوتا ہے اور اجتماعی و انفرادی زندگی کا ہر پہلو کس طرح سدھر جاتا ہے، سنور جاتا ہے اور بھلائیوں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس شہادت کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ ہم فرداً فرداً بھی اور قومی حیثیت سے بھی اپنے دین کی حقانیت پر مجسم شہادت بن جائیں ہمارے افراد کا کردار اس کی صداقت کا ثبوت دے۔ ہمارے گھر اس کی خوشبو سے مہکیں اور ہماری دکانیں اور ہمارے کارخانے اس کی روشنی سے جگمگائیں، ہمارے ادارے اور ہمارے مدرسے اس کے نور سے منور ہوں، ہمارا لٹریچر اور ہماری صحافت اس کی خوبیوں کی سند پیش کرے۔ ہماری

قومی پالیسی اور اجتماعی سعی و جہد اس کے برحق ہونے کی روشن دلیل ہو، غرض ہم سے جہاں اور جس حیثیت میں بھی کسی شخص یا قوم کو سابقہ پیش آئے وہ ہمارے شخصی اور قومی کردار میں اس بات کا ثبوت پالے کہ جن اصولوں کو ہم حق کہتے ہیں وہ واقعی حق ہیں اور ان سے فی الواقع انسانی زندگی اصلح اور اعلیٰ وارفع ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی عرض کر دوں کہ اس شہادت کی تکمیل اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس وقت جب کہ ایک اسٹیٹ انہی اصولوں پر قائم ہو جائے اور وہ پورے دین کو عمل میں لا کر اپنے عدل و انصاف سے، اپنے اصلاحی پروگرام سے، اپنے حُسنِ انتظام سے، اپنے امن سے، اپنے باشندوں کی فلاح و بہبود سے، اپنے حکمرانوں کی نیک سیرت سے، اپنی صالح داخلی سیاست سے، اپنی راست بازانہ خارجی پالیسی سے، اپنی شریفانہ جنگ سے اور اپنی وفادارانہ صلح سے ساری دنیا کے سامنے اس بات کی شہادت دے کہ جس دین نے اس اسٹیٹ کو جنم دیا ہے وہ درحقیقت انسانی فلاح کا ضامن ہے اور اسی کی پیروی میں نوعِ انسانی کی بھلائی ہے۔ یہ شہادت جب قولی شہادت کے ساتھ مل جائے تب وہ ذمہ داری پوری طرح ادا ہو جاتی ہے جو امت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے، تب نوع انسانی پر بالکل اتمام حجت ہو جاتا ہے اور تب ہی ساری امت اس قابل ہو سکتی ہے کہ آخرت کی عدالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کھڑی ہو کر شہادت دے سکے کہ جو کچھ حضورؐ نے ہم کو پہنچایا تھا وہ ہم نے لوگوں تک پہنچا دیا۔ اور اس پر بھی جو لوگ راہِ راست پر نہ آئے وہ اپنی کج روی کے خود ذمہ دار ہیں۔

بس عام سامعین کو میرا پیغام وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دلوایا تھا۔

> تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
>
> آؤ اس امر کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے اور وہ بات یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔

جدہ کے اسلام پسند نوجوانوں کا اجتماع

جدہ میں ایسے نوجوانوں کا اچھا خاصا حلقہ ہے جو حسن البناؒ شہید اور مولانا مودودی کی کتابیں پڑھے ہوئے اور ان سے متاثر ہیں۔ ان لوگوں نے مولانا کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رکھی تھی، چنانچہ عشاء کے بعد مولانا ان کے ہاں گئے۔ میری طبیعت ابھی تک خراب تھی۔ اتفاق سے چودھری صاحب کو بھی اس روز زکام ہوگیا، اس لیے ہم دونوں مولانا کے ساتھ نہ جا سکے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد مولانا واپس تشریف لائے۔ وہاں کے متعلق دوسری باتوں کے علاوہ جو خاص بات مولانا نے بیان فرمائی وہ یہ کہ اس اجتماع میں محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ملک میں عرب قومیت کے تعصب، مغربی تہذیب اور اخلاقی انحطاط کے دن بدن بڑھنے اور پھیلنے کی سخت شکایت کی۔ مصر سے ایک ہفتہ وار پرچہ ''المصور'' شائع ہوتا ہے جس کے صرف دو مقصد ہیں۔ ایک عرب ملکوں میں اپنی حکومت کا پروپیگنڈہ کرنا اور دوسرا نوجوانوں میں فحش مضامین و برہنہ تصاویر کے ذریعے بے دینی اور بد اخلاقی پھیلانا۔ ان صاحب کے بیان کے مطابق صرف سعودی عرب کے اندر اس کے پچاس ہزار نسخے ہر ماہ درآمد ہوتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ جب یہ کسی شہر میں پہنچتا ہے، تو ہاکر کی دکان پر نوجوان خریداروں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ بعض نوجوان تو اس کے لیے اس قدر بے تاب رہتے ہیں کہ انہوں نے اس کی قیمت پیشگی ادا کی ہوتی ہے بلکہ ان کے نام سے ہاکر کی دکان پر پوسٹ بکس قسم کے بکس بنے ہوتے ہیں کہ جونہی یہ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے گندے پرچے اس کے ہاں پہنچیں ان کے لیے فوراً مخصوص کر دیے جائیں۔ ان ہی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ عرب قومیت کی ستائش میں شاعر ''القروی'' کا

جدہ کے اسلام پسند نوجوانوں کا اجتماع

جدہ میں ایسے نوجوانوں کا اچھا خاصا حلقہ ہے جو حسن البنا شہیدؒ اور مولانا مودودی کی کتابیں پڑھے ہوئے اور ان سے متاثر ہیں۔ ان لوگوں نے مولانا کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رکھی تھی، چنانچہ عشاء کے بعد مولانا ان کے ہاں گئے۔ میری طبیعت ابھی تک خراب تھی۔ اتفاق سے چودھری صاحب کو بھی اس روز زکام ہو گیا، اس لیے ہم دونوں مولانا کے ساتھ نہ جا سکے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد مولانا واپس تشریف لائے۔ وہاں کے متعلق دوسری باتوں کے علاوہ جو خاص بات مولانا نے بیان فرمائی وہ یہ کہ اس اجتماع میں محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ملک میں عرب قومیت کے تعصب، مغربی تہذیب اور اخلاقی انحطاط کے دن بدن بڑھنے اور پھیلنے کی سخت شکایت کی۔ مصر سے ایک ہفتہ وار پرچہ ''المصور'' شائع ہوتا ہے جس کے صرف دو مقصد ہیں۔ ایک عرب ملکوں میں اپنی حکومت کا پروپیگنڈہ کرنا اور دوسرا نوجوانوں میں فحش مضامین و برہنہ تصاویر کے ذریعے بے دینی اور بد اخلاقی پھیلانا۔ ان صاحب کے بیان کے مطابق صرف سعودی عرب کے اندر اس کے پچاس ہزار نسخے ہر ماہ درآمد ہوتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ جب یہ کسی شہر میں پہنچتا ہے، تو ہاکر کی دکان پر نوجوان خریداروں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ بعض نوجوان تو اس کے لیے اس قدر بے تاب رہتے ہیں کہ انہوں نے اس کی قیمت پیشگی ادا کی ہوتی ہے بلکہ ان کے نام سے ہاکر کی دکان پر پوسٹ بکس قسم کے بکس بنے ہوتے ہیں کہ جونہی یہ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے گندے پرچے اس کے ہاں پہنچیں ان کے لیے فوراً مخصوص کر دیے جائیں۔ ان ہی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ عرب قومیت کی ستائش میں شاعر ''القروی'' کا

مشہور قصیدہ پہلی بار اسی ''المصور'' میں شائع ہوا تھا۔ جس وقت یہ پرچہ سعودی عرب میں پہنچا تو مفتیٔ اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کی طرف سے مراقبۃ (سنسر) والوں کے نام حکم جاری ہوا کہ آئندہ سے سعودی عرب کے اندر اس پرچے کا داخلہ بند کردیا جائے، مگر مراقبہ والوں نے یہ کہہ کر تعمیل حکم سے انکار کردیا کہ جب تک مجلس الوزراء (کیبنٹ) کی طرف سے حکم نامہ نہیں آئے گا اس کا داخلہ بند نہیں کیا جا سکتا، مگر آج تک نہ حکم نامہ آیا اور نہ اس پرچے کا داخلہ بند ہوا۔[1] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سعودی عرب میں قدیم اور جدید یا دوسرے الفاظ میں دینی و غیر دینی رجحانات رکھنے والوں کے درمیان کشمکش اندر ہی اندر کس زور سے چل رہی ہے۔

جدہ کی جامع مسجد میں مولانا کی عربی میں تقریر

11 دسمبر کو جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے جدہ کی سب سے بڑی مسجد بامحفوظ میں پڑھی، جس کے خطیب ایک سوڈانی عالم شیخ محجوب ہیں۔ شیخ احمد سلیمان العشماوی بھی موجود تھے۔ خطبہ کے بعد انہوں نے لوگوں کو مولانا کی تقریر سننے کے لیے بٹھا لیا اور مولانا کا تعارف کرایا۔ مولانا نے معذرت کرنا چاہی، مگر چند منٹ تک عربی میں برجستہ بولنا ہی پڑا۔ عرب حضرات بولنے کے بڑے دھنی ہیں، آپ جب چاہیں، جس عرب کو پکڑ کر کھڑا کردیں، وہ تقریر کر ڈالے گا۔ مولانا کے بعد شیخ احمد سلیمان العشماوی اور شیخ مصطفیٰ عالم وغیرہ نے تقریریں کیں۔ مسجد سے ہم شیخ احمد سلیمان العشماوی کے ہاں گئے اور وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے پر عدن کے ایک دوست عمر طرموم سے ملاقات ہوئی، جو دو روز پہلے اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں جدہ آئے تھے۔ عدن میں جو لوگ وہاں کے مشہور عالم شیخ سالم البیحانی کی نگرانی اور تربیت میں دعوت اسلامی کا کام کرتے تھے۔ عمر طرموم ان میں سے ایک ہیں۔ ان سے مل کر عدن کے حالات معلوم ہوئے۔

1- یہ 60ء کی بات ہے۔ اب مصر اور سعودی عرب کی کشمکش کے بعد اس پرچے کا سعودی عرب میں داخلہ بند ہوگیا ہے۔ (م،ع 63ء)

سعودی عرب کے حالات پر مولانا کی مفصّل تقریر

جدہ میں ''انجمن خدامِ حجاج'' کے نام سے ایک انجمن قائم ہے جس کے تمام کارکن ہندوستان یا پاکستان کے باشندے ہیں۔ ان لوگوں نے مولانا سے تقریر کی درخواست کی، جسے مولانا نے منظور کرلیا۔ چنانچہ اسی روز مغرب کے بعد یہ تقریر ہوئی، جس میں ڈیڑھ دوسو کے قریب حاضری تھی۔ پہلے انجمن کے صدر جناب اے۔ جی خاں صاحب (عبدالغفار خاں صاحب) نے استقبالیہ تقریر کی۔ پھر تقریباً ایک گھنٹہ تک مولانا نے تقریر کی۔ تقریر کا موضوع حالات کی مناسبت سے ''سعودی عرب میں اسلام کے لیے کام کرنے والوں کی ذمہ داریاں'' تھا۔ اپنی اس ایک گھنٹہ کی تقریر میں مولانا نے پہلے اس موقع پر انتہائی دلی مسرت کا اظہار فرمایا جو انہیں سرزمین عرب بلکہ مکہ معظمہ کے جوار میں اپنے ہم وطنوں سے ملاقات کا میسر آیا اور انہیں اس خوش قسمتی پر مبارک باد دی کہ انہیں اس زمین میں رہنے کا موقع حاصل ہے، جو اسلام کا منبع اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز ہے۔

اسی سلسلہ میں فرمایا کہ ''دراصل یہ سرزمین وہ ہے جس میں اسلام کی حقانیت اور صداقت کی روشن نشانیاں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے ہر دیکھنے والے کو یہاں واضح طور پر نظر آ سکتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ یہ ملک دنیا بھر کے 60,50 کروڑ مسلمانوں کا مرکز کیوں بنا ہوا ہے اور لاکھوں مسلمان ہر سال دنیا کے تمام گوشوں سے کھنچ کھنچ کر یہاں کیوں جمع ہوتے ہیں؟ یہ کعبہ کیسے بنا اور کن حالات میں بنا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنا وطن چھوڑ کر نکلتے ہیں اور شام و فلسطین کی سرزمین میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھر اپنے خاندان کے ایک حصہ کو فلسطین میں آباد کرتے ہیں اور ایک حصہ کو مکہ کی وادی غیر ذی زرع میں لاکر آباد کرتے ہیں۔ اس وقت مکہ کی سرزمین میں نہ آبادی تھی، نہ بارش کا کوئی نشان تھا اور نہ کسی قسم کی غذائی پیداوار کا علاقہ تھا۔ اور نہ آج ہے۔ اس سرزمین میں اللہ کا وہ صابر بندہ اپنی بیوی اور بچے کو لاکر چھوڑ دیتا ہے اور واپس فلسطین روانہ ہو جاتا ہے۔۔۔ اس کے بعد زمزم کا کنواں اللہ کی قدرت سے نکلتا ہے۔ اس کنویں کے چاروں طرف پرندوں کو اڑتا دیکھ کر ایک قافلہ وہاں پہنچتا اور ڈیرا ڈال دیتا ہے۔ اس طرح اس شہر

کی آبادی ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی مدد سے خانہ کعبہ کی تعمیر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے حج کا اعلان کرتے ہیں اور اس سرزمین کو مرکز قرار دیتے ہوئے دنیا بھر کے انسانوں کو اس کی طرف آنے کی دعوت دیتے ہیں، آخر سوچیے کہ اس تن تنہا اور بے سروسامان انسان کی پکار میں وہ کیا تاثیر تھی اور اس کے پیچھے وہ کون سی عظیم الشان طاقت تھی جو اس وقت سے لے کر آج چار ہزار سال گزر جانے تک ہر سال ہزاروں اور لاکھوں انسان اس کے بنائے ہوئے گھر کی طرف لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے کھنچے چلے آرہے ہیں۔۔۔۔ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی یہ پکار دراصل خدائی پکار تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی زبان سے تمام دنیا تک پہنچانے کا اہتمام فرمایا اور خانہ کعبہ کو وہ مرکزی حیثیت عطا فرمائی جو آج تک کسی مقام کو کسی زمانے میں حاصل نہیں ہوئی۔۔۔۔ پھر اس زمین کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کے حکم سے بلداً حراماً اور بلداً آمناً قرار دیا، جس کا یہ اثر ہوا اور آج تک پایا جاتا ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ اس میں داخل ہو گیا وہ ہر طرح کے امن و امان کے ماحول میں آ گیا۔ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جاہلیت کے دور میں بھی اگر کوئی شخص باپ کے قاتل تک کو یہاں دیکھ لیتا، تو اسے ہرگز یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس سے کسی قسم کا تعرض کر سکے۔

پھر اسی سرزمین سے وہ مبارک ہستی اٹھی جس نے 23 سال کی قلیل مدت میں پورے عرب کی سرزمین کو امن اور ایمان پر متحد کر دیا۔ یہ زمین آپ کے سامنے ہے اس میں جس طرح کے پہاڑ اور صحرا پائے جاتے ہیں آپ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ دنیا کی کسی سرزمین پر دو بستیوں کے درمیان وہ دوری اور کٹنے کے اسباب نہیں پائے جاتے جو عرب کی سرزمین میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک تن تنہا شخصﷺ نے 23 سال کی قلیل مدت میں اس کے تمام باشندوں کو اس طرح جوڑ کر رکھ دیا کہ ان میں فکری، سیاسی اور دینی کسی اعتبار سے کوئی فرق نہ رہا اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے وہ نہ صرف یہ کہ خود ایمان، اخلاق اور تہذیب کی دولت سے مالا مال ہوئے بلکہ دنیا بھر کے محسن اور معلم بن گئے اور چند سال کے اندر سندھ سے مراکش و اندلس تک پھیل گئے۔ سوچیے اگر یہ صرف ایک شخص کی اپنی آواز ہوتی اور یہ سب کچھ اس نے اپنی طاقت کے سہارے کرنے کی

کوشش کی ہوتی، تو اس کی پکار اور دعوت کو یہ عظیم الشان کامیابی کیونکر حاصل ہو سکتی تھی؟ خالص عقلی نقطہ نظر سے بھی دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ایک خدائی پکار تھی اور خدا ہی کی طاقت اس کے پیچھے کام کر رہی تھی۔ 23 سال کی مدت میں اتنا بڑا کارنامہ ایک نبی کے سوا کون انجام دے سکتا تھا؟ کسی بڑی سے بڑی طاقت رکھنے والے جھوٹے آدمی کی یہ طاقت نہ تھی کہ وہ ایک لاکھ مربع میل علاقہ کے باشندوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکتا اور ان کی زندگی کی ایک ایک چیز کو بدل کر رکھ دیتا اور ان کے اندر وہ طاقت پیدا کر دیتا کہ جو قومیں ان کو اس قدر کمزور سمجھتی تھیں کہ ان کو کسی خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ انہیں چند سال کے اندر ان کے سامنے پسپا ہونا پڑا اور ان کی حکمرانی اور سیادت قبول کرنی پڑی۔

الغرض اس سرزمین میں جہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں، اسلام کی صداقت کی ایسی ایسی کھلی نشانیاں موجود ہیں کہ جو شخص تھوڑی سی بصیرت بھی رکھتا ہو۔ اس کو پورا اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ جس دین پر وہ ایمان رکھتا ہے، وہ اس کا محض آبائی دین نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت اور عقل کے اعتبار سے بھی وہ اس کو سچا دین ماننے اور اس کی حفاظت کرنے پر مجبور ہے۔"

اس تمہید کے بعد مولانا نے فرمایا:

"اللہ کی قدرت اور اسلام کی صداقت کی ان نشانیوں پر غور کرنے کی دعوت میں آپ کو اس لیے بار بار دے رہا ہوں کہ آپ اس سرزمین میں جو بلا شبہ اسلام کا مرکز ہے، ایک ایسے زمانے میں بیٹھے ہوئے ہیں جب کہ یہ مرکز ایک انتہائی بڑے اور خطرناک انقلاب کے دھانے پر کھڑا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہاں اگر کوئی غلط قسم کا انقلاب آیا تو وہ اسی طرح کا ایک معمولی انقلاب ہوگا جو پاکستان، ترکی، عراق، مصر یا مراکش وغیرہ میں برپا ہو سکتا ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں کوئی انقلاب آئے، وہ بہر حال ایک مقامی انقلاب ہوگا اور اس کی اچھائی یا برائی اس کے حدود تک محدود رہے گی، لیکن یہاں جو بھی انقلاب آئے گا اس کا اثر پوری دنیا کے مسلمانوں پر پڑے گا، کیونکہ یہ سرزمین ان سب مسلمانوں کا مرکز ہے اور اسی سے ان کے دین و ایمان کا تعلق ہے۔ اس لیے کوئی شخص چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں بس رہا ہو، اسے اپنے ملک سے بڑھ کر اس ملک کی فکر ہونی چاہیے اور اسے اس بات کے لیے بے چین رہنا چاہیے کہ یہاں کوئی غلط اور خطرناک قسم کا انقلاب نہ آنے پائے۔ یہ

ذمہ داری آپ حضرات پر جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس سرزمین میں اللہ تعالیٰ نے یکا یک دولت کے چشمے بہا دیے ہیں۔ ہم اردو زبان میں کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو چھپّر پھاڑ کر دولت دی یا اللہ تعالیٰ نے زمین پھاڑ کر دولت دی۔ ہماری اردو زبان کا یہ محاورہ یہاں حقیقت کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ یہ عظیم الشان دولت جہاں عربوں کے لیے ایک بڑی نعمت ہے، وہاں ان کے لیے ایک خطرناک فتنے کا باعث بھی بن سکتی ہے بلکہ افسوس کہ اس فتنے کے آثار آج واضح طور پر نظر آنے لگے ہیں۔ میں سفر کے دوران میں اپنے عرب بھائیوں کو جگہ جگہ یہ توجہ دلاتا رہا ہوں کہ پٹرول کی یہ بے پناہ دولت آپ کے لیے باعثِ رحمت بھی ہے اور باعثِ زحمت بھی، مہلک فتنہ بھی بن سکتی ہے اور آپ اس سے عظیم الشان فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ یہاں ایسی حکومت قائم ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو اپنے فرائض میں شمار کرتی ہے۔ آپ کے اس علاقے کے سوا دنیا میں کوئی مسلمان حکومت بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے فرائض میں اس چیز کو شمار کرتی ہو یا اس کا تصور بھی کرتی ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شعبہ بنائے اور اس کی پولیس کو باقاعدہ قانونی اختیارات دے۔ ہمارا پاکستان بھی اسلام کے نام پر بنا تھا لیکن ابھی تک اس کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی ہے کہ اس قسم کے کاموں کی فکر کر سکے۔ یہ بھی آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ آپ کے ہاں معتد بہ قوانین شریعت ہی کے نافذ ہیں۔ یہ بات بھی دنیا کے کسی دوسرے ملک کو حاصل نہیں ہے۔ یہاں کی ان خوبیوں کو دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی ہے۔

میں جب سے اس زمین پر آیا ہوں برابر یہاں کے حالات کو دیکھ رہا ہوں اور اس کے مستقبل پر غور کر رہا ہوں۔ بہت سی چیزیں ایسی بھی دیکھنے سننے میں آئیں جن سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں اسلامی طاقت روز بروز کمزور ہو رہی ہے اور مغربی تہذیب اپنے پورے زور سے یہاں پھیلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ چیز ہو سکتا ہے کہ کسی وقت خطرے کا باعث بن جائے اور کچھ بعید نہیں کہ اس کے خطرناک پہلو اندر ہی اندر پرورش پا رہے ہوں۔ اس سرزمین میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ان مسائل کو جن سے اس وقت سابقہ

ہے سمجھتے ہیں اور حل کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کا فرض ہے کہ یہاں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں کہ یہ ملک کوئی خطرناک موڑ نہ مڑنے پائے۔

بہرحال آپ لوگوں کا فرض ہے کہ ایک طرف اسلام کو سمجھیں اور دوسری طرف یہاں کے حالات پر غور کریں اور پھر اپنی پوری قوت اس کے لیے صرف کریں کہ اس ملک کے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اکثریت ایسے نوجوانوں کی ہو جو اسلام کے لیے مخلص ہوں، اس پر دل سے ایمان و یقین رکھتے ہوں اور اپنے تمام پیش آمدہ مسائل کا حل اسلام ہی کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہوں۔ اسلام کی یہ عظیم الشان خدمت آپ ہی لوگ انجام دے سکتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو ایک طرف نئے علوم سے واقف ہیں اور دوسری طرف اسلام ہی کو غالب اور برسرکار دیکھنا چاہتے ہیں علماء کے بھروسے پر آپ لوگ اس کام کو مؤخر نہیں کر سکتے۔ وہ بیچارے آج سے تین چار صدی پرانے ماحول میں بس رہے ہیں اور ان کے لیے بہت مشکل ہے کہ موجودہ حالات میں نوجوانوں کی قیادت کرسکیں اور اسلام کی روشنی میں ملک کے نئے پیش آمدہ مسائل کا اطمینان بخش حل پیش کرسکیں۔ البتہ اگر لوگ منظم طریقہ پر کام کریں گے تو انشاء اللہ ان علماء کی پوری تائید آپ کو یقیناً حاصل ہوگی۔

عرب قومیت اور پاکستان

(12 دسمبر) کو ہمارا کوئی خاص پروگرام نہیں رہا۔ صرف مختلف احباب سے ملاقاتیں رہیں۔ ملاقات کے لیے آنے والوں میں پاکستانی بھی تھے اور عرب بھی۔ عرب نوجوانوں سے دوسرے مسائل کے علاوہ عرب قومیت کے موضوع پر خاص طور پر گفتگو رہتی تھی۔

استاذ محمد احمد باشمیل مکہ معظمہ کے ایک خالص اسلامی طرزِ فکر رکھنے والے ادیب ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب ''القومیۃ فی الاسلام'' شائع ہوئی ہے، جس میں انہوں نے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے عرب قومیت کی خوب خوب خبر لی ہے۔ اور اس کے نقصانات اور خطرناک نتائج سے عرب نوجوانوں کو خبردار کیا ہے۔ سنا ہے کہ اس کتاب نے شائع ہوتے ہی پورے سعودی عرب میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بہت سے نوجوان عرب قومیت سے تائب ہو رہے ہیں۔ اس وقت تک اس کے پانچ ہزار نسخے نکل

چکے ہیں اور اب مصنف نے دس ہزار اور چھپوائی ہے۔ اس کتاب میں محمد احمد باشمیل نے مولانا کا نام لیے بغیر وہ بحث نقل کی ہے، جو ان کے اور عرب قومیت سے متاثر ایک نوجوان کے درمیان اس روز ہوئی۔ اس نوجوان نے مولانا سے سوال کیا کہ ''آپ پاکستانی حضرات نے عربوں کے قومی مسائل میں کیا کیا ہے؟'' مولانا نے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ ہم نے اپنے عرب بھائیوں کے مسائل میں ہمیشہ ان کی تائید کی ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے، لیکن اس تائید کی بنیاد آپ لوگوں کا یہ نعرہ نہیں ہے جسے آپ عرب قومیت کے نام سے لگا رہے ہیں، بلکہ اس کی بنیاد وہ دینی رابطہ ہے جو ہمارے اور آپ کے درمیان اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ آپ حضرات اس دینی رابطہ کو ختم کرنے کے درپے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم اب تک اس کی پاسداری کر رہے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے، اس نے نہ صرف فلسطین اور الجزائر بلکہ عربوں کے تمام دوسرے مسائل میں ان کی پوری تائید کی ہے۔ لیکن آپ حضرات کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر قوم جو ایک خاص ملک میں رہتی ہو، اس کے کچھ اپنے مسائل بھی ہوتے ہیں، جن سے اسے بہرحال نپٹنا ہوگا۔ اگر آپ لوگوں کو فلسطین اور الجزائر یا دوسرے مسائل درپیش ہیں تو ہم پاکستانیوں کو بھی کشمیر کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر یہودیوں نے آپ کے دس لاکھ افراد کو قتل اور جلا وطن کیا ہے تو ہندوؤں نے ہمارے ایک کروڑ کے قریب افراد کو قتل اور جلاوطن کیا ہے اور اب تک ہندوستان اور کشمیر میں ان کے ظلم وستم کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ لوگ اپنی یادداشت پر زور ڈال کر ذرا مجھے بتایئے کہ اس پورے المیہ میں آپ لوگوں نے ہماری کہاں تک تائید کی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ اس کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔ لہٰذا میں خود ہی اس کا جواب دیتا ہوں آپ لوگوں نے ہماری مدد یوں کی ہے کہ جب ہندوستان وکشمیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی تو آپ لوگوں نے اپنی زبانوں پر قفل چڑھا لیے۔ آپ کے اخبارات نے اس کی مذمت میں چند سطریں لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کے تمام اخبارات نے آپ لوگوں پر کسی طرف سے جو بھی زیادتی ہوئی، اس کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور اب تک کر رہے ہیں۔ کاش آپ لوگوں کی کرم فرمائی یہیں تک محدود رہ جاتی۔ مگر

آپ نے اثباتی غیر جانب داری اور امن وسلامتی کے علم بردار (ابطال الحیاد الایجابی ورسل السلام) کا لقب دیتے ہوئے ان لوگوں کی طرف دوستی ومحبت کا ہاتھ بڑھایا جن کے ہاتھ اب تک مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ کاش ہندوستان کو آپ لوگوں کی دوستی کا واقعی پاس ہوتا، مگر اس نے آپ کو کوئی وقعت نہ دیتے ہوئے اسرائیل کو تسلیم کیا اور اب تک اسے تسلیم کیے ہوئے ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان نے اب تک نہ اسرائیل کو تسلیم کیا ہے اور نہ کبھی اسرائیل کے کسی باشندے کو اپنی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت دی ہے۔ سوچیے! اگر خدانخواستہ آپ لوگوں کی ضد میں ہم لوگ بھی اسرائیل کو تسلیم کر لیں اور اس کے ساتھ دوستی ومحبت کے روابط پیدا کرنے لگیں، اور بن گوریوں کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دیں اور اس کے لیے رسول السلام کے نعرے لگا کر اس کا استقبال کریں، تو کیا اس صورت میں آپ لوگ ہمیں کچھ بھی ملامت کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ لیکن نہیں، ہرگز نہیں، میں تو اسے آپ لوگوں کے سامنے ایک مفروضہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ورنہ ہم پاکستانی مسلمان اس کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتے، اس لیے کہ ہمارا دین ہمیں اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، لہٰذا مجھے امید ہے کہ اس مفروضہ کے ذکر سے میں نے آپ لوگوں کی دِل آزاری نہیں کی ہوگی۔''

باشمیل صاحب نے اس ساری گفتگو کو نقل کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں کشمیر کے مسئلے اور ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب کا ذکر کیا ہے اور عرب سیاست دانوں کو شرم دلائی ہے کہ انہوں نے آج تک کبھی ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔

جدہ سے مدینہ منورہ

12 دسمبر کی صبح سوا آٹھ بجے ہم جدہ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اگرچہ ہم تین آدمی تھے، لیکن سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمیں سات سیٹوں والی ٹیکسی لینا پڑی، جس کا ہم نے 125 ریال کرایہ ادا کیا۔

جدہ سے مدینہ منورہ تک 425 کلو میٹر (265 میل) کا فاصلہ ہے۔ سڑک نئی بنی ہوئی ہے اور نہایت عمدہ ہے اور اس کی حفاظت اور مرمت کا بھی پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی بستی جو ہمارے راستے میں آئی، وہ دھبان تھی۔ اس کے بعد تول اور قضیمہ کی بستیاں آئیں۔ موٹروں سے پہلے جب لوگ پیدل یا اونٹوں کے ذریعے سفر کیا کرتے تھے تو مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ جانے والے مسافر جدہ نہیں آیا کرتے تھے، بلکہ قضیمہ پہنچ کر مشرق کی طرف مڑ جاتے تھے اور پھر عسفان اور شمیسی (حدیبیہ) یا عسفان اور وادی فاطمہ (مرالظہران) کے راستے سے مکہ معظّمہ پہنچ جاتے تھے۔ ممکن ہے اونٹوں کے ذریعے سفر کرنے والے مسافر اب بھی اسی راستہ سے آتے جاتے ہوں، لیکن موٹریں اس راستہ پر نہیں چلتیں۔

اس کے بعد جحفہ سے گزرتے ہوئے ہم رابغ پہنچے، جو بحرِ قلزم پر ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے اور مصر و شام کی طرف سے آنے والے حاجی یہیں سے حج یا عمرہ کا احرام باندھتے ہیں۔ 160 کلومیٹر اور چلنے کے بعد ہم مستورہ پہنچے۔ مستورہ تک جو جدہ سے 171 کلومیٹر ہے۔ گویا ہم بحرِ قلزم کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے، لیکن اس کے بعد سڑک دائیں طرف یعنی مشرق کو مڑ گئی۔ تقریباً 80 کلو میٹر اور چلنے کے بعد ہم مفرق پہنچے۔ یہاں سے ایک سڑک مدینہ منورہ کو جاتی ہے اور دوسری ینبع کو، جو بحرِ قلزم پر ایک اور بندرگاہ ہے اور یہیں

مصر و شام کے وہ حاجی آ کر اترتے ہیں جو حج سے پہلے مدینہ منورہ آنا چاہتے ہیں۔ مفرق کا فاصلہ مدینہ سے 155 کلومیٹر اور جدہ سے 269 کلومیٹر ہے۔ جدہ سے آتے ہوئے یہاں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ 7 کلومیٹر اور چلنے کے بعد ہم ساڑھے گیارہ بجے کے قریب بدر پہنچ گئے۔

بدر

ہم نے بدر میں تین گھنٹے قیام کیا۔ اس اثنا میں ایک مقامی آدمی کو ساتھ لے کر ہم وہ مقام بھی دیکھنے گئے، جہاں معرکۂ بدر پیش آیا تھا۔ یہ مقام بدر کی بستی سے دو کلومیٹر (سوا میل) پر مغرب کی طرف واقع ہے، وہاں ایک چھوٹے سے احاطہ میں 13 شہدائے بدر مدفون ہیں، اور قریب ہی اہل بدر کا موجودہ قبرستان بھی ہے۔ اس جگہ پہنچنے کے لیے مدینہ منورہ کی طرف سے آنے والے کو دائیں جانب اور جدہ سے آنے والے کو بائیں طرف مڑنا ہوتا ہے۔

یہ مقام یعنی بدر مفرق سے 7 کلومیٹر ہے، جہاں سے ینبع سے آنے والی سڑک مدینہ سے آنے والی سڑک سے مل جاتی ہے۔ کفار کا قافلہ جو شام سے آ رہا تھا، وہ اسی کے راستہ سے مکہ کی طرف چلا گیا اور کفار کا لشکر آگے بڑھ کر بدر کے مقام پر اس لیے ٹھہر گیا کہ مسلمانوں کا راستہ روک سکے۔ شہداء کی قبریں جس جگہ واقع ہیں، وہاں اب کوئی نشان نہیں ہے، صرف ایک حوض ہے جس کے چاروں طرف منڈیر بنی ہوئی ہے۔ جو مقامی آدمی ہمارے ساتھ تھا اس کی مدد سے ہم نے العدوۃ القصوی، العدوۃ الدنیا اور کفار اور صحابہ کرام کے آنے کی سمتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ظہر کی نماز پڑھ کر ڈھائی بجے کے قریب ہم بدر سے روانہ ہوئے اور الواسطہ، الحمراء، مسیجید اور بئر علی ہوتے ہوئے عصر اور مغرب کے درمیان مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ بئر علی (جو مدینہ منورہ سے صرف پانچ میل ہے) کا قدیم نام ذوالحلیفہ ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے حج کا احرام باندھا تھا۔ اہل مدینہ کا اب بھی یہی میقات ہے۔ راستے میں ہمیں بہت سی ایسی بستیاں بھی نظر

آئیں جن میں کچے مکان اور کھجور کے اجڑے ہوئے باغ تو موجود تھے لیکن آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ عرب کی آبادی کس تیز رفتاری سے گاؤں چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہو رہی ہے اور کس طرح پٹرول کی وجہ سے ملک کی زراعت دن بدن تباہ ہوتی جا رہی ہے۔

مدینہ منورہ: 13 تا 19 دسمبر 1959ء

مدینہ منورہ میں ہم نے فندق قصر المدینہ (پیلس ہوٹل) میں قیام کیا جو مسجد نبوی سے متصل صاف ستھرا ہوٹل ہے۔ مغرب کی نماز ہم نے حرم میں ادا کی اور پھر سلام کے لیے حاضری دی۔ عشاء کی نماز کے بعد مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی دعوت پر ان کے ہاں گئے۔ مولانا بدر عالم صاحب کو چند ماہ پہلے موٹر کا ایک سخت حادثہ پیش آ گیا تھا، جس کی وجہ سے ان کی ایک انگلی بھی کٹ گئی تھی اور ایک بازو بھی پوری طرح کام نہ کر رہا تھا۔ اللہ کرے اب وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکے ہوں[1]۔

مسجد نبویؐ

اب کی مرتبہ مدینہ منورہ ہمیں نہایت کھلا اور صاف ستھرا شہر نظر آیا۔ 56ء میں حج کے بعد جب ہم یہاں آئے تھے تو مسجد نبویؐ کی توسیع و تعمیر اور اس کے اردگرد مکانات کو گرا کر نئی سڑکیں اور راستے بنانے کا سلسلہ جاری تھا۔ اب یہ سارا کام مکمل ہو چکا تھا۔ نئی توسیع و تعمیر کے بعد مسجد نبویؐ نہایت خوبصورت و شاندار بھی ہو چکی ہے اور اس کا رقبہ بھی پہلے کی بہ نسبت ڈیوڑھا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو چکا ہے۔ اس کے اردگرد ہر طرف کافی کھلا اور پختہ راستہ چھوڑا گیا ہے تاکہ مسجد میں آنے اور اس سے نکلنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ موٹروں کے آنے اور ٹھہرنے کے لیے پیچھے۔ یعنی شمال کی جانب کھلا میدان رکھا گیا ہے، اس طرح موٹروں کے شور کا بھی مسجد میں نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے والوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

1- 65ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ تغمده الله برحمته۔

مدینہ منورہ میں تین چار ہوٹل ہیں، جو سب کے سب نئے اور مسجد کے قریب ہی بنے ہوئے ہیں۔ مکہ معظّمہ کے ہوٹل حرم سے کافی فاصلہ پر ہیں۔

مدینہ منورہ کا موسم

مدینہ منورہ میں جدہ اور مکہ معظّمہ کی نسبت کافی سردی تھی لیکن ہمارے ہاں لاہور کے برابر نہ تھی۔ تاہم رات کو وضو کے لیے ہمیں گرم پانی استعمال کرنا اور کمرے کے دروازے بند کر کے سونا پڑا تھا۔

امیر مدینہ سے ملاقات

اگلے دن (14 دسمبر) صبح کے وقت میں اور چودھری صاحب مدینہ منورہ کے گورنر (امیر المدینہ) کے دفتر گئے۔ مدینہ کے گورنر ضابطہ کے لحاظ سے شاہی خاندان کے ایک شہزادے ہیں۔ لیکن وہ عملاً سارا سال نجد میں رہتے ہیں۔ ان کے وکیل (سیکرٹری) عبداللہ السدیری ان کی جگہ تمام فرائض انجام دیتے ہیں، اس لیے عموماً ان ہی کو امیر المدینہ کہا جاتا ہے۔ سدیری نجد کا ایک بارسوخ خاندان ہے۔ سعودی خاندان کی اس سے رشتہ داریاں بھی ہیں، اس لیے اس کے بہت سے افراد کئی جگہوں مثلاً تبوک، الوجہ اور حائل کے امیر یا وکیل الامیر ہیں۔ مدینہ میں جس عمارت میں امیر کا دفتر ہے وہ نہایت خستہ اور پرانے طرز کی عمارت ہے۔ اس کی اب تک قسمت نہ جاگنے پر ہمیں سخت تعجب ہوا۔ امیر عبداللہ السدیری سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کے وکیل جو ان کے بڑے صاحبزادے ہیں، سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مغرب کے بعد مولانا کو اپنے والد کے ہاں آنے کی دعوت دی۔ مغرب کے بعد ہم ان کے ہاں گئے۔ نہایت سادہ لیکن باخبر قسم کے آدمی معلوم ہوئے۔ اسلامی آثار کی حفاظت سے غفلت پر افسوس ظاہر کرتے رہے اور اس کے مقابلے میں یورپ اور امریکہ والے جس طرح اپنے آثار کی حفاظت کرتے ہیں اس پر رشک کرتے رہے۔ انہوں نے ہمیں آئندہ سفر کے سلسلے میں ہر قسم کی سہولت پہنچانے کا یقین دلایا۔ ہمیں اور کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہ تھی، البتہ ہمارا آئندہ سفر چونکہ ایسے علاقے میں ہونا تھا،

جس سے ہم ناواقف تھے اور جس میں ذرائع آمدورفت کا انتظام بطورِ خود کرنا ناممکن تھا اس لیے ہم نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کسی موٹر والے سے ہمارا معاملہ طے کرا دیں جو ہم سے بحساب فی یوم اپنی موٹر کا کرایہ وصول کر لے اور ہمارے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک ہم سعودی مملکت سے نکل کر اردن میں داخل نہ ہو جائیں۔ امیر نے نہ صرف پولیس انسپکٹر کے ذریعے ایسا ڈرائیور تلاش کرنے کا وعدہ کیا بلکہ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ اپنا ایک آدمی بھی دوں گا جو اس وقت تک آپ کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے ساتھ رہے گا جب تک آپ اردن میں داخل نہیں ہو جائیں گے۔ اس پر ہم نے امیر کا شکریہ ادا کیا۔

ملاقاتیں

عصر کے بعد زین الشنقیطی اور ان کے دوست حبیب الرحمان الباکستانی سے ملاقات ہوئی۔ محمد زین صاحب ایک ذی علم اور گہرا اسلامی جذبہ رکھنے والے نوجوان ہیں۔ یہ اصل میں شنقیط[1] کے رہنے والے ہیں، لیکن تعلیم کی غرض سے گزشتہ پندرہ سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور اب سعودی ہو چکے ہیں۔ اس وقت مدینہ منورہ کے سرکاری یتیم خانہ۔۔۔ دارالایتام و الصنائع۔۔۔ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان سے ہمارا تعارف پہلی مرتبہ 49ء میں ہوا جب کہ انہوں نے مولانا مودودی کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے لیے پیش کیا تھا، لیکن پاکستان سے باہر کسی کو رکن بنانا چونکہ جماعت اسلامی کی پالیسی نہیں تھی اس لیے یہ جماعت کے رکن تو نہ ہو سکے لیکن ان سے تعلقات اور مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ مدینہ منورہ میں جن لوگوں نے مولانا کی کتابیں پڑھی ہیں انہیں ان کتابوں سے روشناس کرانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے ساتھی حبیب الرحمان صاحب دراصل بلوچستان کے رہنے والے ہیں، لیکن کئی سال

1۔ شنقیط مراکش کی اس ریاست کا نام ہے جسے حال میں فرانس نے موریتانا کے نام سے مراکش سے الگ ایک مستقل ریاست بنا دیا ہے۔

سے مدینہ منورہ ہی میں مقیم ہیں اور اب سعودی ہو چکے ہیں۔ یہ بھی محمد زین صاحب کے ساتھ دارالایتام میں مدرس ہیں۔

اس روز جن دوسرے حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک ترکستانی عالم شیخ قاسم اندجانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ترکستانی مہاجر ہیں۔ ہجرت کر کے پہلے ہندوستان آئے لیکن بعد میں مستقل طور پر مدینہ منورہ چلے گئے اور اب دارالایتام ہی میں مدرس ہیں۔ ترکستان کے حالات پر انہوں نے عربی اور ترکستانی زبان میں بعض کتابیں بھی لکھی ہیں، لیکن وہ حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہو سکیں۔

اسی روز حرم میں عراق کے مشہور عالم شیخ امجد الزہادی سے بھی ملاقات ہوئی۔ عراق کی حالت اور اس میں کمیونسٹوں کے ظلم و تشدد اور خرمستیوں کا ذکر کرتے رہے۔ ان کے اندازِ گفتگو سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ عراق کے حالات کا ان کے ذہن پر سخت بُرا اثر پڑا ہے۔ عراق سے حج کے ارادے سے حجاز تو آ گئے تھے، لیکن واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے جہاں تک ہو سکا انہیں صبر و تحمل کے ساتھ حالات کا انتظار کرنے کی تلقین کی[1]۔

مدینہ منورہ کے آثار

مدینہ منورہ کے آثار میں اصل اور سب سے بڑا اثر خود مسجد نبویؑ ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑ، گھر، مساجد اور کنوئیں بہت سی چیزیں آثار میں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض تو مدینہ منورہ کے اندر واقع ہیں کہ ان کے دیکھنے کے لیے کسی سواری کا اہتمام کرنا ضروری نہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو مدینہ منورہ سے باہر چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ اس لیے انہیں دیکھنے کے لیے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ ہم نے حبیب الرحمان صاحب وغیرہ سے مل کر یہ پروگرام طے کیا کہ پہلے ہم باہر کے آثار سے فارغ ہو لیں۔ جو آثار خود مدینہ منورہ کے اندر ہیں، انہیں خود مدینہ کے قیام کے دوران بعد میں دیکھ لیں گے۔

1۔ بعد میں شیخ امجد زہادی پاکستان بھی آئے، لیکن آخر کار انہیں عراق واپس جانے ہی کا فیصلہ کرنا پڑا۔

جبل احد۔ وہ غار جہاں رسول اللہؐ نے زخمی ہونے کے بعد پناہ لی تھی۔

ھ ا جبل ۱۳۲۲ جبل ۱۹۰۵ء — مدینہ منورہ

اُحُد

اس پروگرام کے تحت ہم 15 دسمبر کی صبح دس بجے کے قریب سب سے پہلے احد گئے۔ یہ وہ پہاڑ ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:۔ ھذا جبل یحبنا ونحبہ (یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں) اسی پہاڑ کے دامن میں 3ھ میں مشہور غزوۂ احد پیش آیا تھا، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے اور بہت سے دوسرے صحابہ کرامؓ کے علاوہ حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی شہادت واقع ہوئی۔ مدینہ سے اس کا فاصلہ شمال کی جانب تین چار میل ہے۔ اور یہ مشرق سے مغرب کو 4 میل کے قریب لمبا ہے۔ جب تک انسان اس کے قریب نہیں پہنچ جاتا، دور سے دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ متعدد پہاڑی سلسلوں کا مجموعہ ہے۔ اس تک پہنچنے سے پہلے دائیں طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی آتی ہے، جس کا قدیم نام جبل عینین ہے۔ لیکن اب یہ جبل الرماۃ (تیر اندازوں کا پہاڑ) کے نام سے مشہور ہے۔ اسی پہاڑی پر غزوہ احد کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس تیر اندازوں کو متعین فرمایا تھا اور انہیں حکم دیا تھا کہ وہ ہرگز اپنی جگہ سے نہ ہٹیں، خواہ جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہو یا شکست۔ جبل الرماۃ اور جبل احد کے درمیان وہ وادی ہے جسے وادی قناۃ کہا جاتا ہے اور جس میں غزوۂ احد واقع ہوا۔ مسلمانوں کا لشکر ان دونوں پہاڑوں کے درمیان مشرق کی طرف تھا اور کفار مکہ کا لشکر جبل احد کے گرد چکر کاٹ کر مغرب کی طرف سے آیا تھا۔ اس وادی میں جبل الرماۃ سے کچھ مغرب کو ایک چار دیواری کے اندر وہ صحابہ کرامؓ مدفون ہیں جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے۔ حضرت حمزہؓ اب ان ہی صحابہ کرام کے ساتھ مدفون ہیں۔ پہلے ان کی قبر الگ واقع تھی اور اس پر قبہ بھی بنا ہوا تھا، لیکن چونکہ یہ قبر وادی کے عین وسط میں تھی اور آئے دن کے سیلاب سے اس کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس لیے ترک امراء نے حضرت حمزہؓ کی لاش کو یہاں سے نکال کر دوسری جگہ دفن کر دیا۔ اب بھی حضرت حمزہؓ کی پہلی قبر پر قبہ موجود ہے۔ مگر اس کا نصف حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ ترکی عہد میں حضرت حمزہؓ اور غزوۂ احد کے دوسرے شہداء کی قبروں پر خوب نذرانے چڑھائے جاتے تھے اور اہل مدینہ سال میں تین دن یہاں میلہ لگایا کرتے تھے۔ مگر سعودی حکومت نے ان تمام بدعات کو ختم

کر دیا ہے۔ اب ان قبروں پر سعودی حکومت کی طرف سے باقاعدہ پہرہ بھی رہتا ہے۔ تاکہ یہاں غیر شرعی حرکتیں نہ کی جا سکیں۔ جو لوگ احد کی زیارت کے لیے آتے ہیں، انہیں وادی قناۃ سے آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا، ہمارے پاس کیمرہ تھا اور ہم اس سے قبروں کا فوٹو لینا چاہتے تھے، مگر پولیس کے جو آدمی وہاں پہرہ پر متعین تھے، ان میں سے ایک نے ہمیں آ کر روک دیا کہ ہم نہ قبروں کا فوٹو لیں اور نہ جبلِ احد کی طرف جائیں۔ ہمارے کہنے پر وہ ہمیں اپنے سے اوپر کے ایک ذمہ دار آدمی کے پاس لے گیا، جسے ہم نے بتایا کہ ہم لوگ بھی صحیح عقیدہ رکھتے ہیں، اس لیے ہم سے کسی غیر شرعی حرکت کا اندیشہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس پر اس نے نہ صرف ہمیں قبروں کا فوٹو لینے اور جبلِ احد تک جانے کی جازت دی بلکہ اپنے کمرے میں بٹھا کر چائے اور نجدی قہوہ سے ہماری مہمانی بھی کی۔

وادی سے آگے بڑھ کر جبل احد کی طرف جاتے ہوئے ایک جگہ چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے تھے۔ جبلِ احد کے اندر تقریباً سو گز کی اونچائی پر ایک چھوٹا سا غار ہے، جس میں دو تین آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ اس غار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دندانِ مبارک شہید ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ آرام فرمایا تھا۔ اس غار کے دہانے پر سفیدی کی ہوئی ہے، اس لیے یہ کافی دور سے نظر آنے لگتا ہے۔ آثار مدینہ کے متعلق بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اس غار کے اندر کوفی رسم الخط میں بعض عبارتیں لکھی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ مگر ہمیں تو تلاش کے باوجود اس میں کوئی عبارت نظر نہیں آئی۔ ممکن ہے پہلے یہ عبارتیں پائی جاتی ہوں اور اب مٹ چکی ہوں۔ اس غار کے قریب پہاڑ کے دامن میں ایک اور چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں معرکہ کے بعد غار سے اتر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر و عصر کی نماز پڑھی تھی۔

قباء

ظہر کی نماز ہم نے مدینہ منورہ واپس آ کر مسجد نبویؐ میں پڑھی۔ پھر کھانا کھایا اور اس کے بعد مسجد قباء دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے، جو مدینہ منورہ سے جنوب مغرب کی طرف چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ وہ مسجد ہے جس کی بنیاد خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
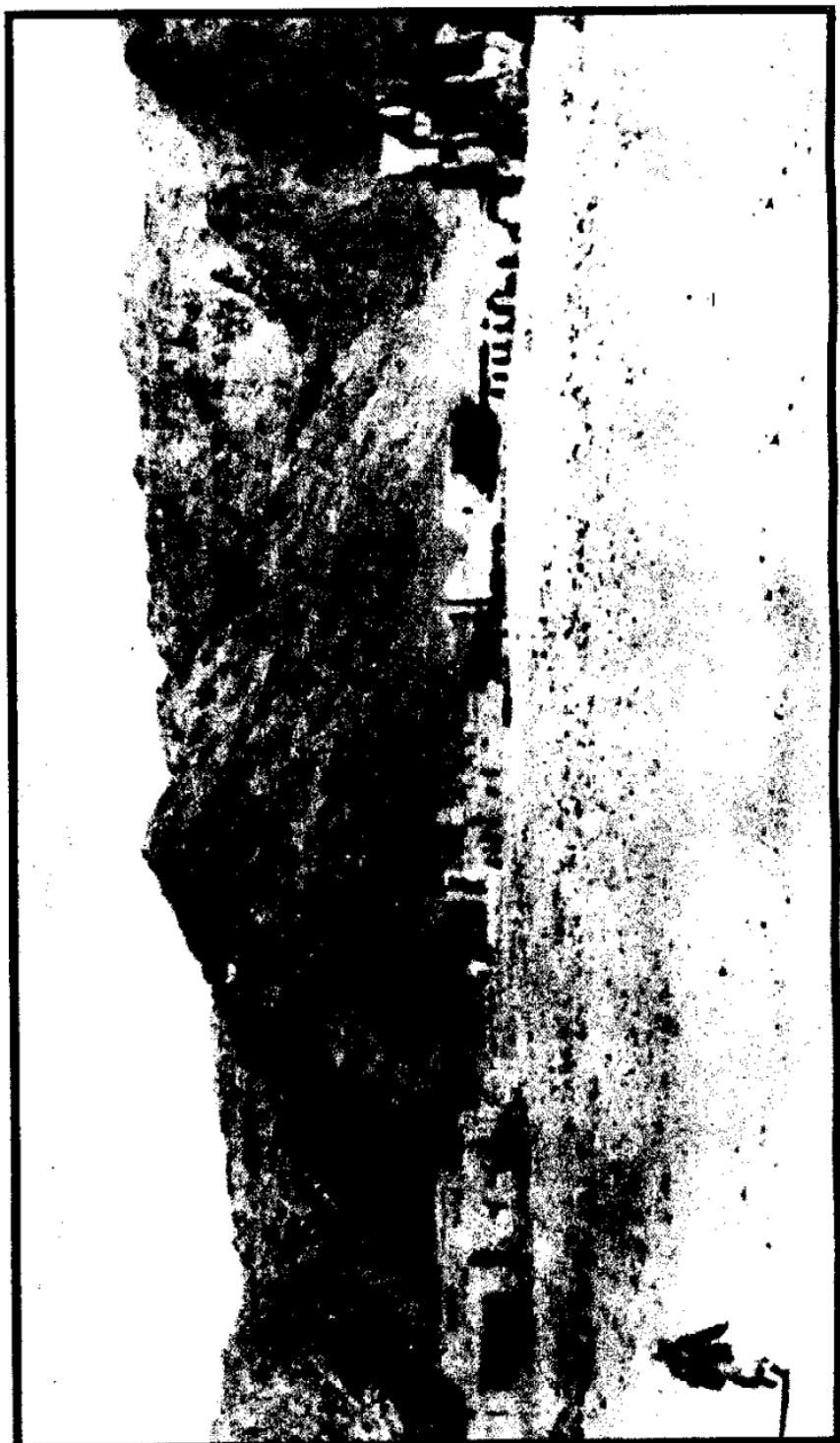
مدینہ منورہ ۔ احد ۔ مزار سیّدنا حمزہؓ

مدینہ منورہ۔ مسجد قبا۔ اور بیت فاطمہ۔ پشت کی جانب
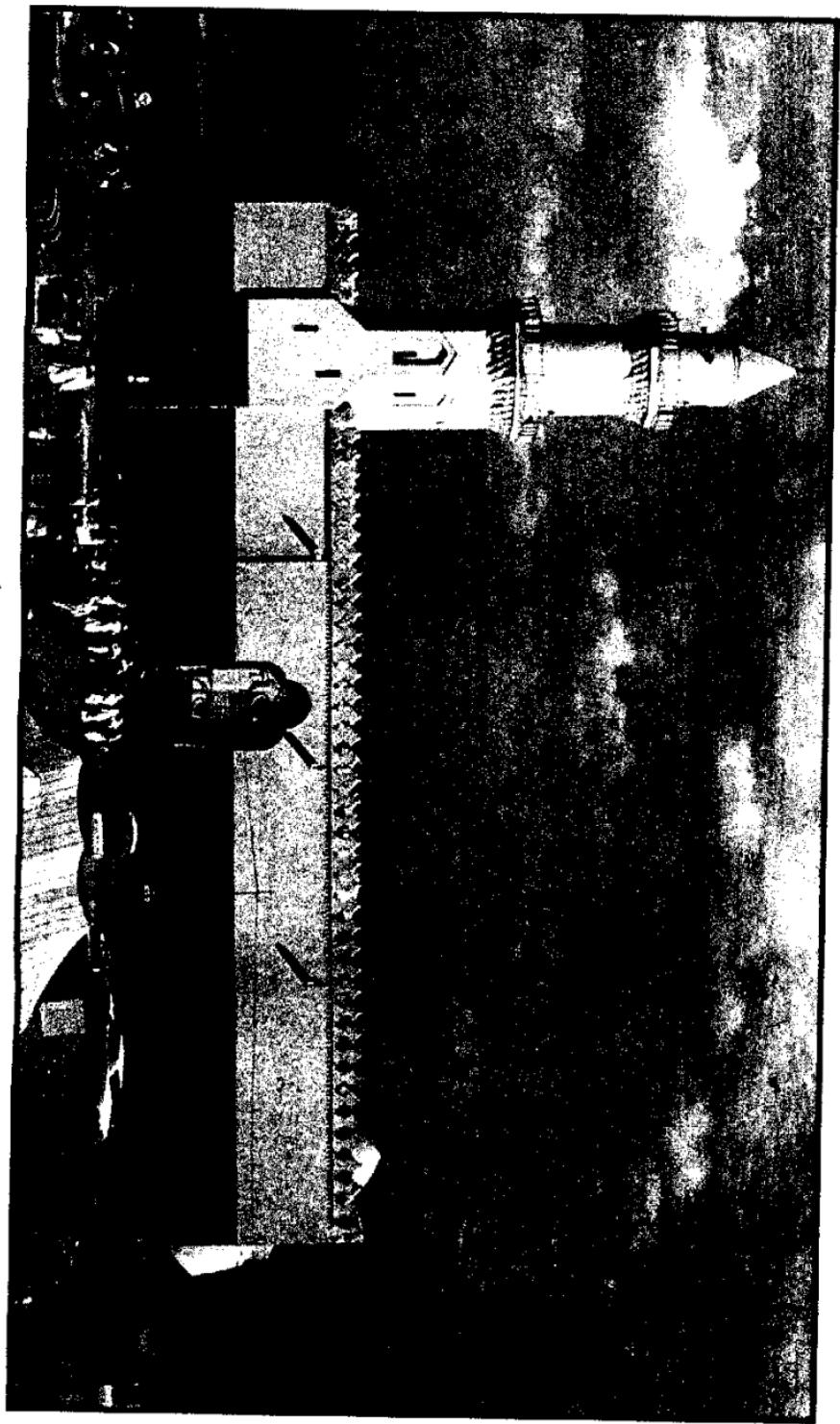
(جب کہ آپ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تھے اور قباء کی بستی میں آپ نے چار روز قیام فرمایا تھا) اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھی تھی اور اس کی تعمیر میں آپؐ بہ نفس نفیس شریک ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ سب سے پہلی مسجد ہے جو مدینہ منورہ پہنچ کر حضورؐ نے تعمیر فرمائی۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ.

یہ وہ مسجد ہے جس کی بنیاد روزِ اول سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

حضورؐ کو قباء اور اس کے رہنے والوں سے اس قدر محبت تھی کہ آپؐ ہر بدھ کے روز یہاں پیدل تشریف لاتے اور ان کی اس مسجد میں نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔

آج سے چند سال پیشتر مدینہ منورہ سے قبا جانے والی سڑک کچی اور نہایت تکلیف دہ تھی، لیکن اب اس سڑک کو بالکل سیدھا بھی کر دیا گیا ہے، یہاں تک کہ مدینہ منورہ سے نکلتے ہی یہ مسجد نظر آنے لگتی ہے ہم نے عصر کی نماز یہیں پہنچ کر ادا کی۔

مسجد الجمعہ

مسجد قباء کو جاتے ہوئے سڑک کی بائیں جانب ایک اور مسجد آتی ہے، جسے مسجد الجمعہ کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل قبیلہ بنو سالم کی مسجد تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر جمعہ کے روز قباء سے مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں جب آپؐ بنو سالم کی بستی میں پہنچے تو جمعہ کا وقت ہو گیا۔ چنانچہ آپؐ نے اسی جگہ جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ یہ جمعہ کی پہلی نماز تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ادا فرمائی۔ اسی نسبت سے اس مسجد کو مسجد الجمعہ کہا جانے لگا۔ اب یہ مسجد نہایت پختہ اور خوبصورت بنی ہوئی ہے، اگرچہ اس کے گرد اب کوئی وادی نہیں ہے۔

دار کلثوم و دار سعد

مسجد قباء سے متصل جنوب میں (یعنی قبلہ رخ) دو گھر بنے ہوئے ہیں۔ جن کی چھت گنبد کی شکل کی ہے اور اس پر سفیدی کی ہوئی ہے کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک گھر اس جگہ بنا ہوا ہے جہاں حضرت کلثوم بن ہدمؓ کا گھر تھا اور دوسرا اس جگہ جہاں حضرت سعد بن خثیمہؓ

کا گھر تھا۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے جب قباء پہنچے تھے تو آپ نے حضرت کلثوم بن ہدمؓ کے گھر کو اپنے قیام کے لیے اور حضرت سعد بن خثیمہؓ کے گھر کو اپنی مجلس کے لیے پسند فرمایا تھا اور یہ دونوں گھر مسجد سے متصل جنوب میں (یعنی قبلہ رخ) واقع تھے۔

بئر ریس یا بئر خاتم

مسجد قبا سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے، جسے بئر ریس کہا جاتا ہے۔ یہ کنواں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کا پانی کھارا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دہن اقدس کا لعاب اس میں ڈالا جس کی برکت سے اس کا کھارا پانی میٹھے پانی میں تبدیل ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس انگوٹھی کو پہنا کرتے تھے، وہ انگوٹھی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو ملی تھی۔ ایک دن حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے چھوٹ کر وہ اس کنوئیں میں گر گئی اور پھر تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ اس لیے اس کنوئیں کو بئر خاتم بھی کہتے ہیں۔

آج سے چند سال پیشتر اس کنوئیں سے پانی نکالا جاتا تھا اور اس سے اردگرد کے باغوں اور کھیتوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس کے قریب ایک بہت بڑا ٹیوب ویل لگ جانے کی وجہ سے اس کا پانی خشک ہو گیا ہے۔

مسجد ضرار

مسجد قبا اور بئر خاتم سے فارغ ہوئے تو ایک عجیب لطیفہ رہا۔ حبیب الرحمان صاحب ہمارے ساتھ نہ تھے، لیکن انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ مسجد قبا سے مشرق کی طرف تھوڑے ہی فاصلہ پر مسجد ضرار کے کھنڈر بھی پائے جاتے ہیں۔ مسجد ضرار سے مراد وہ مسجد ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین نے مسجد قباء کی اہمیت کو کم کرنے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے کے لیے ایک اڈہ کے طور پر تعمیر کی تھی، اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دعوت قبول بھی فرمائی،
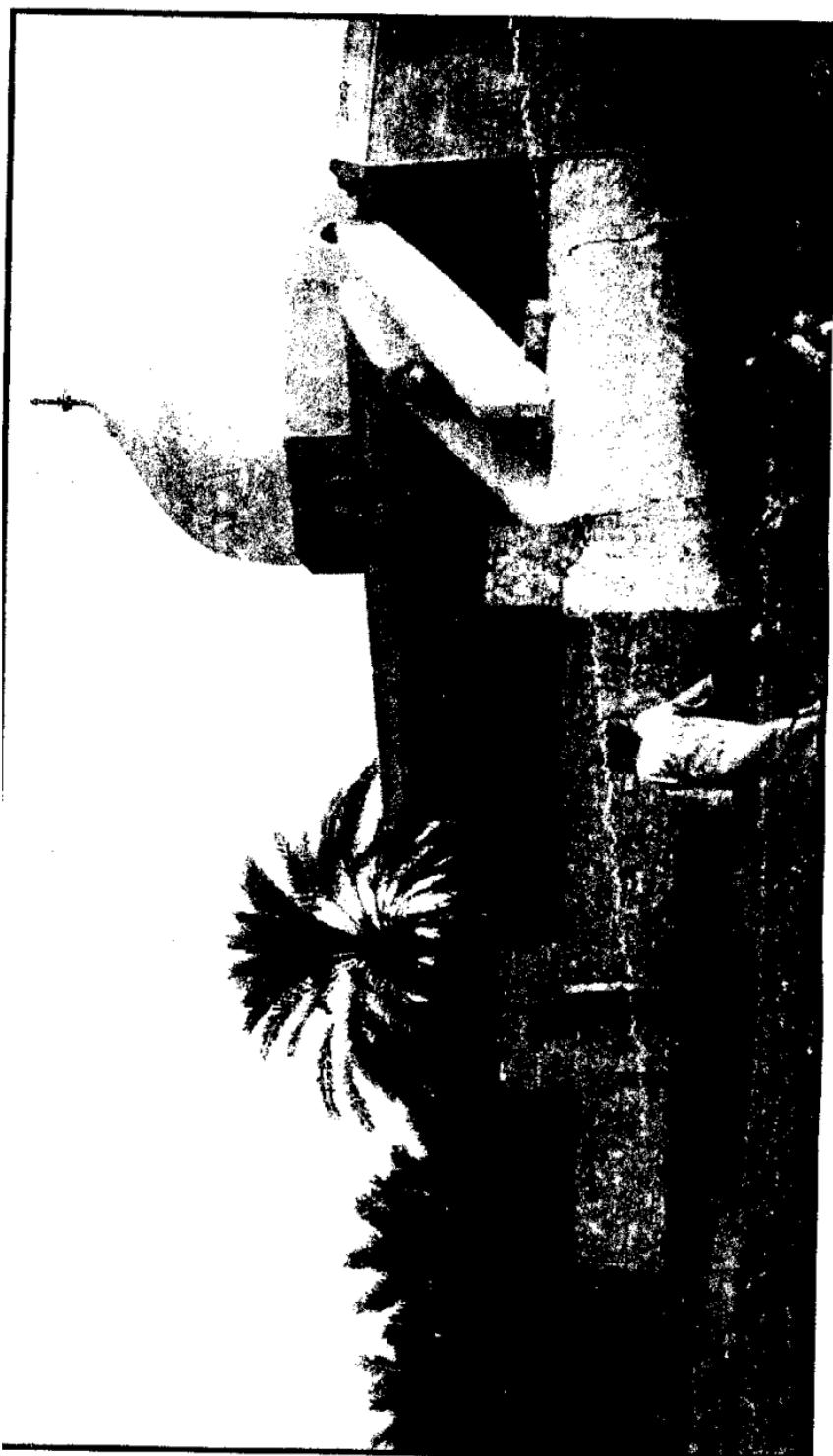
مدینہ منورہ - مسجد جمعہ

مسجد نبویؐ باب جبریل۔ مشرقی جانب۔

مگر فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی۔
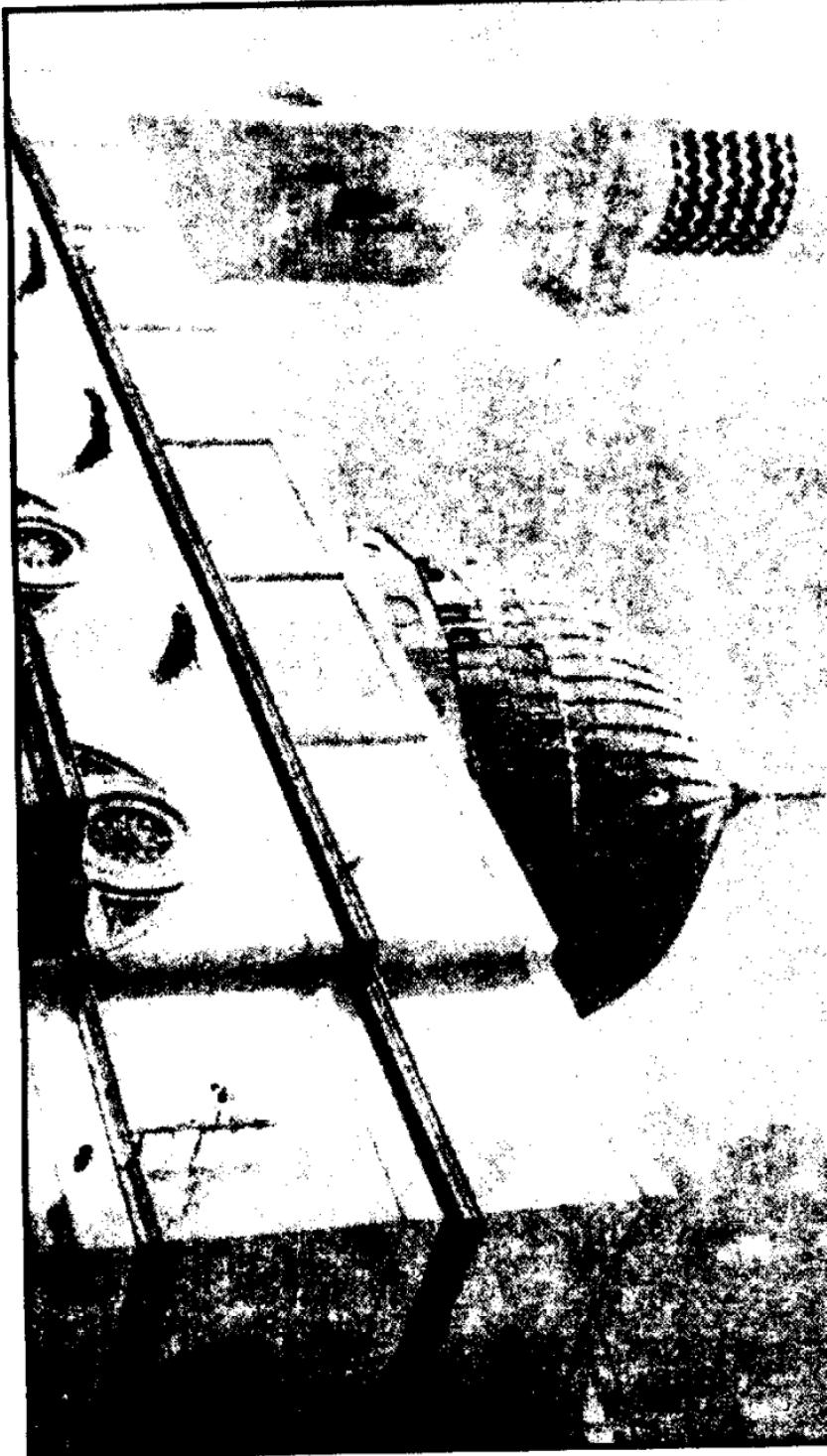
والذین اتخذوا مسجدا ضرارا و کفرا و تفریقا بین المؤمنین و ارصادا لمن حارب اللہ و رسولہ من قبل ولیحلفن ان اردنا الا الحسنی، واللہ یشھد انھم لکذبون لا تقم فیہ ابدا لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق ان تقوم فیہ، فیہ رجال یحبون ان یتطھروا واللہ یحب المطھرین (التوبہ 107-108)

''کچھ لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں، جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسر پیکار ہو چکا ہو۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں، تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد (یعنی قبا) اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی ہے۔ وہی اس کے لیے موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو، پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے لوگ پسند ہیں۔''

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس مسجد کو گرانے کا حکم دیا اور وہ گرا دی گئی۔

ہمیں خیال بھی نہ تھا کہ اس مسجد کا کوئی نام و نشان اس وقت موجود ہوگا۔ آثار مدینہ کے متعلق کسی کتاب میں اس کا ذکر بھی کہیں نہ دیکھا تھا، لیکن حبیب الرحمان صاحب کے کہنے پر ہمیں خیال ہوا کہ شاید اس مسجد کا کوئی نام و نشان موجود ہو اور کسی کتاب کے مصنف نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ ہم نے اپنے ڈرائیور سے معلوم کیا تو اس نے

بھی بڑے وثوق اور جزم سے کہا کہ ہاں مجھے اس مسجد کی جگہ کا علم ہے اور میں آپ لوگوں کو وہاں لے جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ ہمیں سیدھا مدینہ منورہ واپس لانے کے بجائے مسجد قباء سے مشرق کی طرف لے گیا اور ایک گھنٹہ تک کھجور کے مختلف باغوں کے درمیان پھراتا رہا اور ہر مرتبہ ہمارے دریافت کرنے پر یہی جواب دیتا رہا کہ چند منٹ میں ہم اس مسجد تک پہنچنے والے ہیں۔ مگر جب ایک گھنٹہ تک بھٹکتے رہنے کے باوجود اسے مسجد ضرار کا پتہ نہ چل سکا تو ہم نے اس سے کہا کہ ہمیں مدینہ واپس پہنچا دو، چنانچہ وہ آخر کار ہمیں مدینہ کے قبرستان البقیع کے پاس لے آیا۔ اس طرح اس کے کرایہ کے دس ریال زیادہ ہو گئے۔ اگرچہ ہم نے جس مقصد کے لیے اسے یہ دس ریال دیے وہ ہمیں حاصل نہ ہو سکا، البتہ ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اور وہ یہ کہ ہم جس علاقہ میں چکر لگاتے رہے وہ حرۃ واقم کا علاقہ تھا، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ سے پہلے یہودی قبائل بنو قریظہ اور بنی نضیر آباد تھے۔ اس علاقہ کی سرسبزی و شادابی اور اس میں کھجوروں کی کثرت کو دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ کس طرح یہودیوں نے مدینہ منورہ کے زرخیز و شاداب علاقہ پر قبضہ جما رکھا تھا اور اسی لیے وہ عربوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ان پر مالی اقتدار رکھتے تھے۔

بئر رومہ اور بئر عثمانؓ

اگلے دن (16 دسمبر) ہم پھر حبیب الرحمان صاحب کے ساتھ مدینہ منورہ کے آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔ صبح کے وقت ہم بئر رومہ آئے۔ یہ ایک پرانا کنواں ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک چلا آ رہا ہے۔ یہ اپنے پانی کی مٹھاس اور لذت کی وجہ سے مشہور تھا۔ لیکن اس کا مالک ایک یہودی تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ اس کنوئیں کو خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے اسی وقت یہ کنواں اس کے یہودی مالک سے بیس ہزار درہم میں خریدا اور اسے وقف کر دیا۔ اسی لیے اس کنوئیں کو بئر عثمانؓ بھی کہتے ہیں۔ اب یہ کنواں مسجد نبویؐ کے اوقاف میں شامل ہے اور حکومت نے اس کے قریب باقاعدہ ڈیری فارم اور پولٹری فارم قائم کر رکھے ہیں اس میں چار انچ موٹا پائپ لگا ہوا ہے جو

مدینہ منورہ۔ مسجد قبلتین

مدینہ منورہ۔ بیرِ عثمانؓ
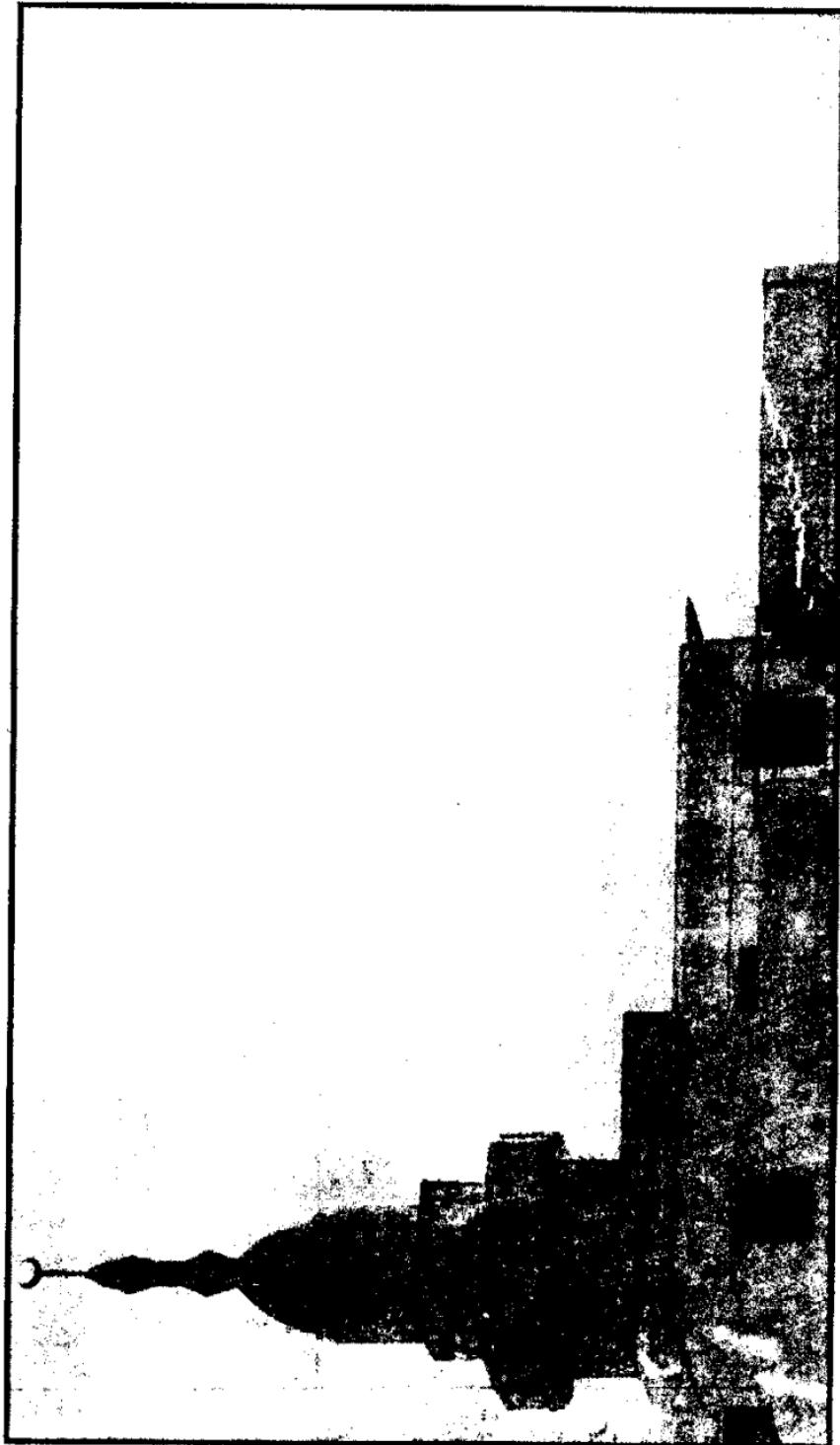
وقت مشین کے ذریعے پانی کھینچتا رہتا ہے۔ مدینہ منورہ سے اس کا فاصلہ شمال مغرب کی جانب تین چار میل ہے۔

مسجد القبلتین

اس کے بعد ہم مسجد القبلتین (دو قبلوں والی مسجد) آئے جو مدینہ سے شمال مغرب کی میں ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر العتاب نامی ایک بستی میں واقع ہے۔ یہ دراصل قبیلہ بنو سلمہ کی مسجد تھی۔ کہتے ہیں کہ لوگ اس مسجد میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے عصر کی نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویل قبلہ کی وحی نازل ہوئی ہے تو لوگوں نے نماز ہی میں بیت المقدس کی طرف منہ پھیر کر بیت اللہ کی جانب رخ کرلیا۔ اسی لیے اس مسجد کو مسجد القبلتین کہا جاتا ہے۔ گزشتہ سفر میں جب ہم نے اس مسجد کی زیارت کی تھی تو یہاں دو محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا اور دوسری کا بیت اللہ کی طرف، اب کی مرتبہ ہم نے دیکھا کہ مسجد کی نئی عمارت نئی اور نہایت پختہ و شاندار بنادی گئی ہے اور اس میں دو کے بجائے صرف ایک محراب بنادی گئی ہے۔ بیت المقدس کے رخ والی محراب ختم کر دی گئی ہے۔

وادیٔ عقیق

اس مسجد کے مغرب میں وادیٔ عقیق ہے جو مدینہ منورہ کی سب سے مشہور وادی ہے اور جو ایک زمانہ میں خلفاء، امراء اور شعراء کے محلات کی وجہ سے مشہور تھی۔ اب ان میں بعض محلات کے صرف کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ مسجد القبلتین کے عین سامنے سعید بن وقاص (حضرت معاویہ کے زمانے کا ایک اموی امیر) کا محل تھا۔ جس کی جگہ پر اب شاہ سعود کا محل بنا ہوا ہے۔

خندق اور جبل سلع

اس کے بعد ہم جبل سلع آئے جو مدینہ منورہ سے متصل شمال مغرب کی سمت میں

واقع ہے اور کافی بلند اور بڑا پہاڑ ہے۔ مدینہ سے احد جانے والے کو یہ بائیں طرف نظر آتا ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے جو خندق کھودی تھی، وہ اگرچہ کئی صدیوں سے مٹ چکی ہے، لیکن جن مورخین نے تحقیق کی ہے ان کا اندازہ ہے کہ وہ نصف دائرہ کی شکل میں اس طرح کھودی گئی تھی کہ حرۃ واقم کے قریب سے شروع ہوئی تھی اور پھر جبل سلع کے شمالی اور مغربی دامن کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی مغرب کو چلی گئی تھی۔ جبل سلع ہی کے دامن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا۔ کفار کے لشکر شمال مغرب کی طرف سے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے آئے تھے۔

مسجد ذباب یا ذوباب

سلع کے شمال میں اس سے بالکل متصل سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ پر ایک مسجد ہے، جس کا نام مسجد ذباب یا ذوباب ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مسجد اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں غزوۂ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی اور اپنا خیمہ لگایا تھا۔

مسجد فتح

سلع کے دامن میں شمال مغرب کی طرف ایک اور مسجد ہے، جس کا نام مسجد الفتح ہے۔ روایت میں ہے کہ اس جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا فرمائی تھی کہ وہ کفار کے لشکروں کو تتر بتر کر دے اور مدینہ منورہ اور اہل مدینہ کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ تیسری مرتبہ جب حضورؐ نے دعا فرمائی تو آپ کی دعا قبول ہوئی، یہاں تک کہ آپ کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آنے لگے۔ اسی لیے اس مسجد کو مسجد الفتح کہا جاتا ہے۔

مساجد خمسہ

مسجد الفتح کے قریب ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سلسلہ وار چار پانچ چھوٹی چھوٹی

مدینہ منورہ۔ خندق۔ کہف بنی حرام (جبل سلع کے مغرب میں) غزوہ خندق کے موقع پر صحابہؓ کرام نے یہ انتظام کیا تھا کہ رات کے وقت نبی ﷺ یہاں قیام فرمائیں۔

مدینہ منورہ۔ مسجد ذباب

مسجدیں بنی ہوئی ہیں جو حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، اور دوسرے صحابہؓ کے نام سے منسوب ہیں، مگر کوئی مستند روایت ایسی نہیں ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر صحابہ کرامؓ انہی مقامات پر متعین رہے ہوں۔

کہف بنی حرام

سلع کے جنوب مغرب میں ایک غار ہے، جسے کہف بنی حرام کہا جاتا ہے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔

مسجد شمس

سلع سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ مسجد شمس اور حصن کعب بن اشرف کی طرف گئے۔ مسجد شمس اس جگہ واقع ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنونضیر کے محاصرہ کے دوران چھ دن نماز ادا فرمائی تھی۔ یہ مسجد، مسجد قباء کے مشرق میں چند فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے اور یہی وہ علاقہ ہے جس میں بنونضیر آباد تھے۔ ممکن ہے پہلے کبھی اس مسجد کی کوئی باقاعدہ عمارت رہی ہو لیکن اب تو اس جگہ ایک چھوٹی چاردیواری ہے اور بس۔

حصن کعب بن اشرف

مسجد شمس سے قریب جنوب کی طرف کعب بن اشرف کا قلعہ ہے، جو اب منہدم ہے اور اس کی صرف چاردیواری موجود ہے، لیکن اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قلعہ کس قدر مضبوط ہوگا۔ یہ قلعہ 42 گز کے قریب لمبا اور 42 ہی گز کے قریب چوڑا ہے اور اس کی دیوار کی چوڑائی 4 فٹ ہے۔

ملاقاتیں

ظہر سے پہلے پہلے ہم اپنے ہوٹل واپس پہنچ گئے اور ظہر کی نماز مسجد نبویؐ میں ادا کی۔ رات گئے تک مختلف حضرات ملاقات کے لیے آتے رہے۔ مغرب کے بعد شیخ قاسم

اندجانی، شیخ محمد سلطان نمنگانی اور ان کے ساتھ بعض ترکستانی نوجوان آئے۔ محمد سلطان نمنگانی بھی ایک ترکستانی عالم ہیں اور ان کا مسجد نبویؐ کے قریب باب السلام کے سامنے ''المکتبہ العلمیہ'' کے نام سے ایک مکتبہ ہے۔ یہ حضرات اپنے حالات سناتے رہے اور خاص طور پر عرب قومیت کے تعصب کی سخت شکایت کرتے رہے۔ ایک ترکستانی نوجوان نے بتایا کہ کچھ عرصہ ہوا مصر و شام میں کمیونزم کے خلاف حکومت اور پریس کی طرف سے مہم جاری تھی۔ میں نے بھی کمیونزم کے خلاف ایک مضمون لکھ کر دمشق کے ایک پرچہ کو بھیجا۔ مگر وہاں کے سنسر والوں نے وہ مضمون جوں کا توں مجھے واپس بھیج دیا اور اس پر یہ نوٹ دیا کہ آپ کمیونزم پر تنقید دینی نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم صرف ''مصالح القومیۃ العربیۃ'' کے نقطہ نظر سے اس کی مذمت کر رہے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں ہم قومی اغراض کے لیے کبھی کمیونزم سے لڑیں گے اور کبھی اس سے دوستی کریں گے۔ تم لوگ دین کی بنیاد پر اس کی مخالفت کر کے یہ راستہ ہی بند کر دیتے ہو کہ کبھی اس سے دوستی ہو سکے!

مدینہ منورہ کے اندر کے آثار

اگلے دن (17 دسمبر) ہم اپنی قیام گاہ پر ہی رہے۔ میں نے اور چودھری غلام محمد صاحب نے بعض ان آثار کے فوٹو لیے جو مدینہ منورہ کے اندر موجود ہیں۔

مسجد المصلی یا مسجد الغمامہ

یہ مسجد باب شامی سے باب عنبریہ کو جاتے ہوئے راستے میں آتی ہے۔ یہ اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ اس وقت یہاں مسجد نہیں تھی۔ مسجد غالباً دوسری صدی ہجری میں بنی اور اس میں عید کی نماز پڑھی جاتی رہی، لیکن اب عید کی نماز مسجد نبویؐ ہی میں ہوتی ہے اور اس مسجد میں بچوں کی دینی تعلیم کا ایک مکتب قائم ہے۔
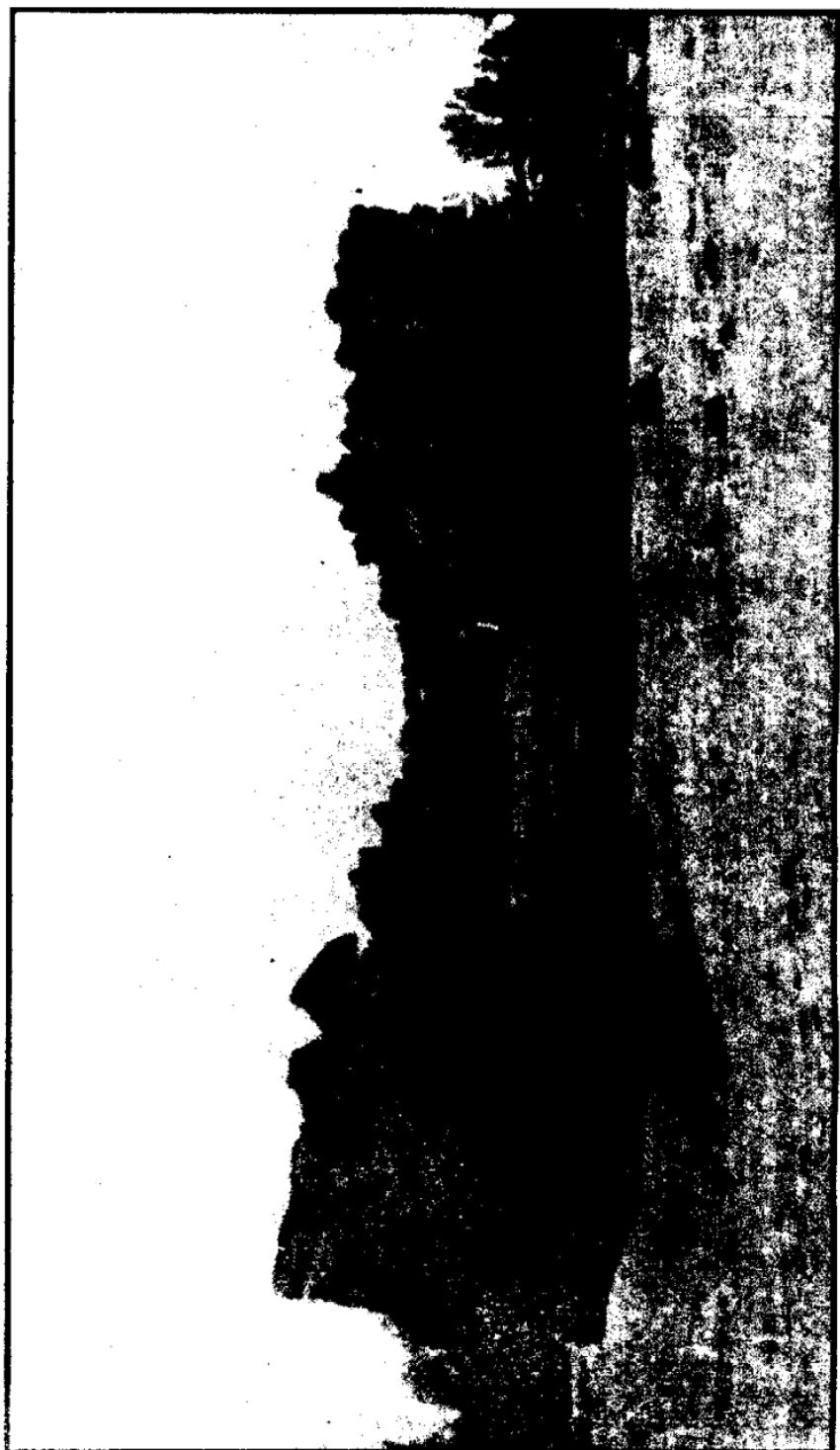
مدینہ منورہ۔ مسجد شمس

مدینہ منورہ۔ کعب بن اشرف کے قلعے کے کھنڈرات

بئر بضاعہ
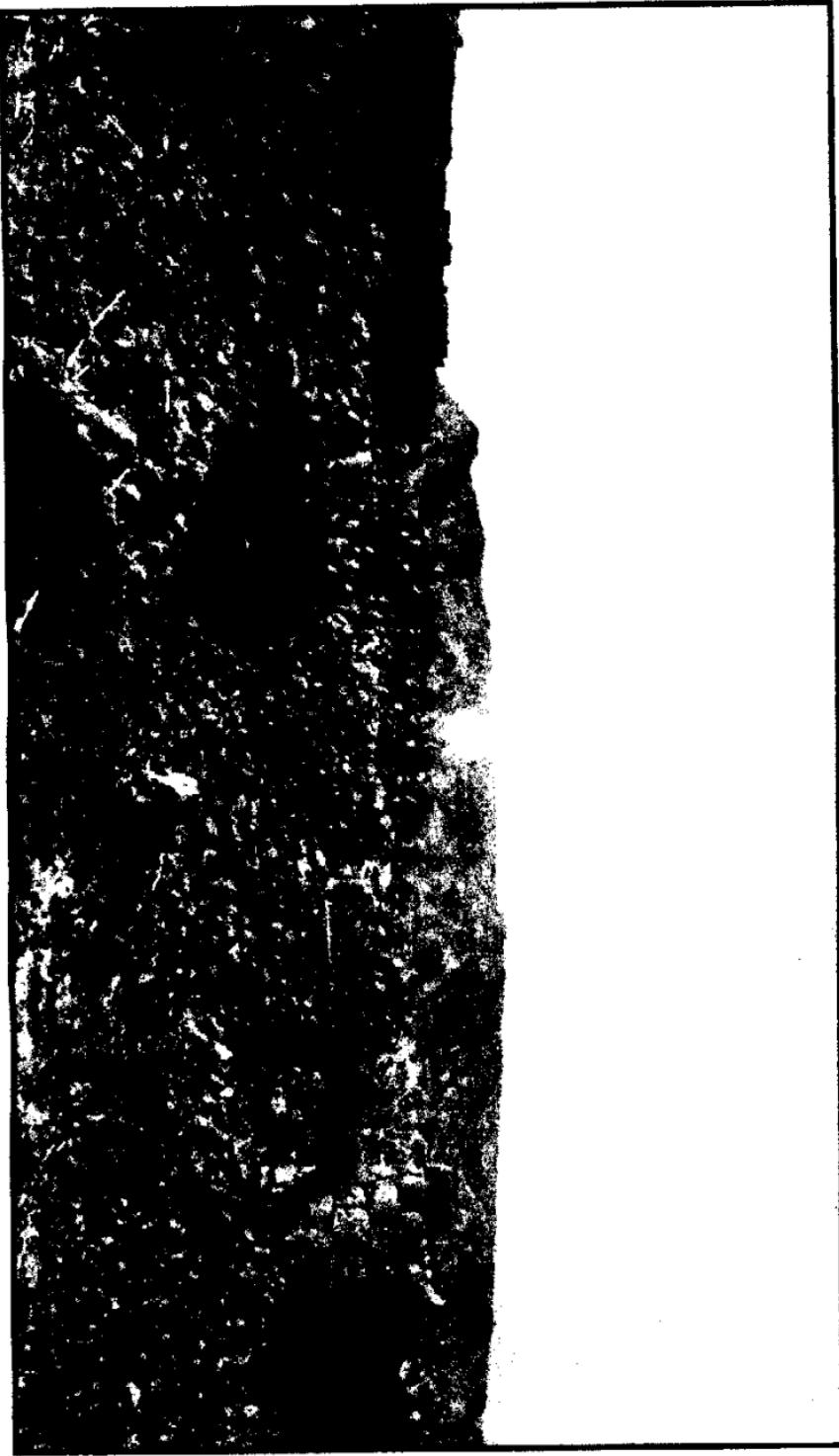
اس سڑک پر جو باب شامی سے مسجد نبوی کو آتی ہے ایک مکان میں بئر بضاعہ اب تک موجود ہے اور اب بھی اس سے مشین کے ذریعہ پانی نکال کر غالباً برف بنائی جاتی ہے۔ یہ کنواں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک چلا آ رہا ہے اور حدیث وفقہ کی کتابوں میں پانی کی طہارت ونجاست کی بحث میں اکثر اس کا ذکر آتا ہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ

بئر بضاعہ کے قریب اسی سڑک پر ایک جگہ کو سقیفہ بنی ساعدہ بتایا جاتا ہے، یعنی وہ جگہ جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مہاجرین وانصار نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی تھی۔

دار جعفر صادق وابی ایوبؓ انصاری

17 دسمبر نماز مغرب کے بعد ہم مسجد نبوی کے خطیب وامام شیخ عبدالعزیز کی ملاقات کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوئے، وہ بیمار تھے، ان کی عیادت مقصود تھی۔ شیخ عبدالعزیز کا مکان مسجد نبوی کے قریب ہی واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہی کسی زمانہ میں امام جعفر صادق کا مکان تھا۔ اس کے ساتھ شمال کی طرف جو گھر ہے، اسے حضرت ابوایوبؓ انصاری کا گھر بتایا جاتا ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد کم سے کم سات ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سال تک مقیم رہے، یہاں تک کہ مسجد کے ساتھ آپ کی رہائش کے لیے کمرے بن گئے۔

مدینہ منورہ میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے گھروں کی بھی نشان دہی کی جاتی ہے، لیکن اب ان تمام مکانات کی جگہیں حرم کی نئی تعمیر کے بعد سڑک کے نیچے آ گئی ہیں۔

ترکستانی حضرات کا حلقۂ درس

مدینہ منورہ میں بھی ترکستانی مہاجرین کی تعداد اچھی خاصی ہے، بلکہ طائف کی بہ

نسبت یہاں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے ایک عالم شیخ محمود طرازی (جو شیخ قاسم اندجانی کے داماد بھی ہیں) ہر روز صبح کی نماز کے بعد مسجد نبوی میں ایک جگہ قرآن، حدیث اور بعض فقہی کتابوں کا اپنی زبان میں درس دیتے ہیں اور اس میں تمام ترکستانی مہاجرین شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترکستانی مہاجرین مولانا مودودی کو ہم قوم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ مولانا کا ننھیالی خاندان اورنگ زیب کے زمانے میں ترکستان ہی سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا، اسی لیے دینی تعلق کے علاوہ وہ مولانا سے اپنا قومی تعلق بھی سمجھتے ہیں۔ شیخ محمود نے ایک دن مولانا کو اپنے درس میں شریک ہونے کی دعوت دی، تاکہ اس طرح تمام ترکستانی مہاجرین بیک وقت ان سے ملاقات کر سکیں۔ مولانا نے ان کی اس دعوت کو قبول کیا اور اگلے دن (18 دسمبر) کی صبح ان کے درس میں شریک ہوئے۔ سو کے قریب حاضری تھی، تمام لوگوں نے یکے بعد دیگرے مولانا سے سلام ومصافحہ کیا۔

ترکستانی حضرات کی دعوت

اسی روز دوپہر کے بعد شیخ محمود صاحب ہی کے مکان پر ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ یہاں مدینہ کی ترکستانی برادری کے تمام بزرگ موجود تھے۔ ترکستانی حضرات کے علاوہ یہاں ہماری ملاقات شیخ محمد صادق مجددی صاحب سے بھی ہوئی، جو ملا صاحب شور بازار کے بھائی ہیں اور ایک عرصہ تک مصر میں افغانستان کے سفیر رہ چکے ہیں، لیکن ہوا یہ کہ ان کے بیٹے قاہرہ میں رہتے ہوئے شیخ حسن بنّا شہید کی دعوت سے متاثر ہو گئے، چنانچہ 54ء میں جب مصری حکومت نے اخوان پر سختیاں اور ان کی گرفتاریاں شروع کیں، تو ان کے بڑے بیٹے کو گرفتار کر لیا گیا اور چھوٹے بیٹے کو مصر سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد یہ خود بھی سفارت سے الگ ہو گئے۔ چند سال سے مدینہ منورہ ہی میں مقیم ہیں اور غالباً یہیں مستقل رہائش کا ارادہ رکھتے ہیں۔

البقیع

اسی روز عصر اور مغرب کے درمیان ہم مدینہ منورہ کے قبرستان "البقیع" کی زیارت کے لیے گئے، جو مسجد نبوی سے مشرق کی سمت واقع ہے اور معمولی رفتار سے زیادہ سے زیادہ
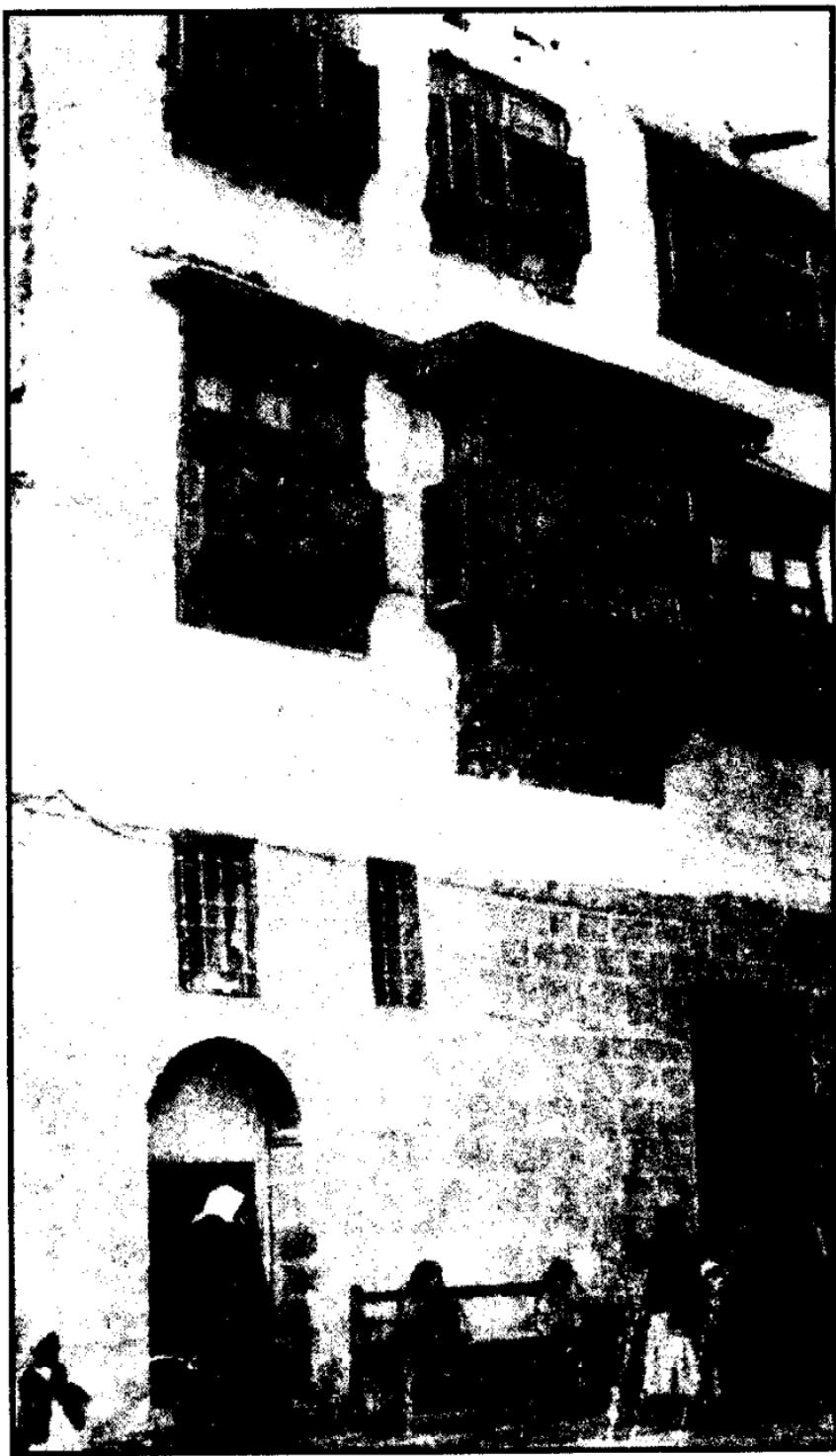
مدینہ منورہ۔ مکان حضرت ایوب انصاریؓ
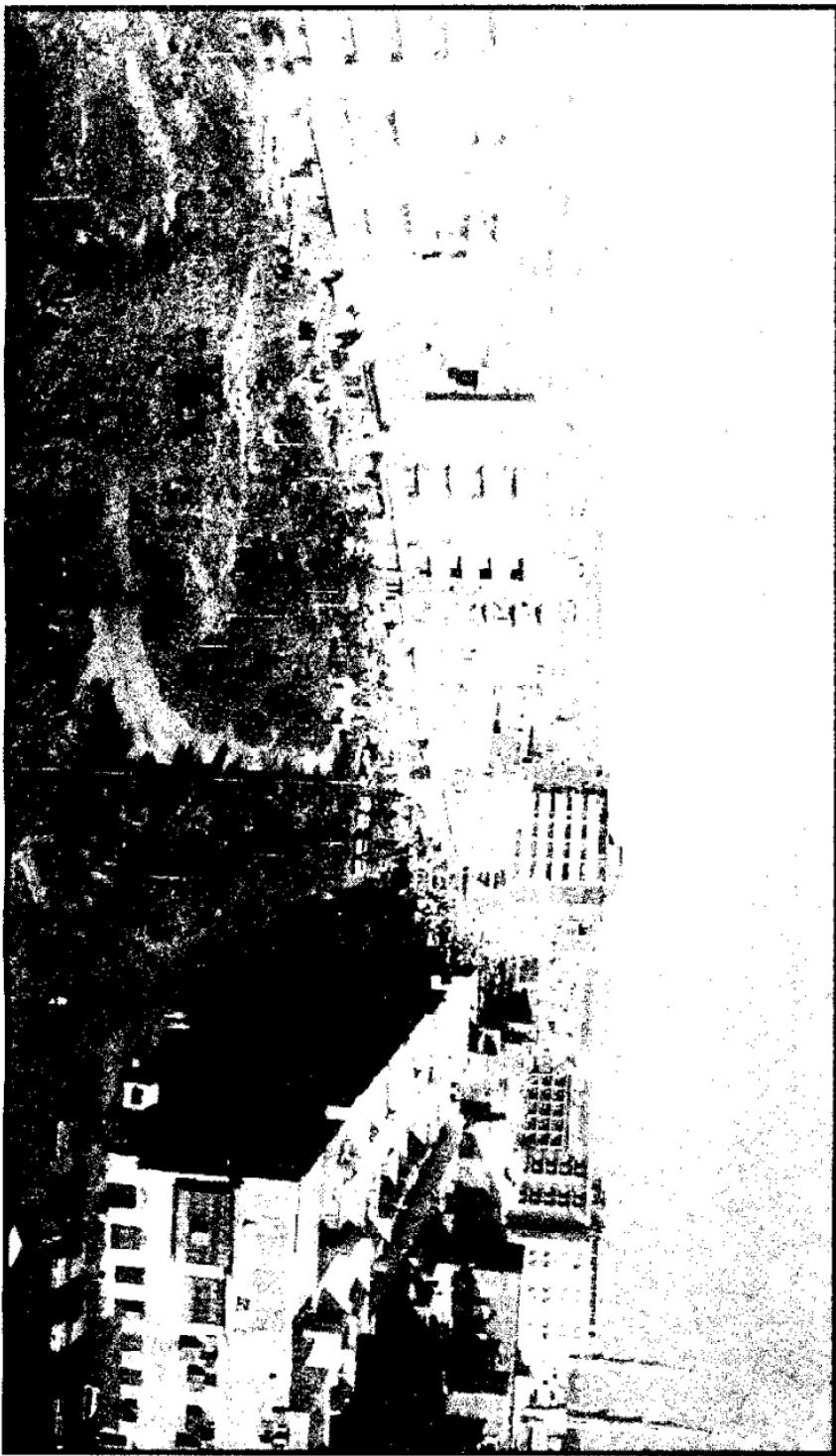
مدینہ منورہ۔ سقیفہ بنی ساعدہ

مدینہ منورہ۔ جنت البقیع۔ مزار حضرت حلیمہؓ

مدینہ منورہ۔ جنت البقیع۔ مزار سیدنا عثمانؓ
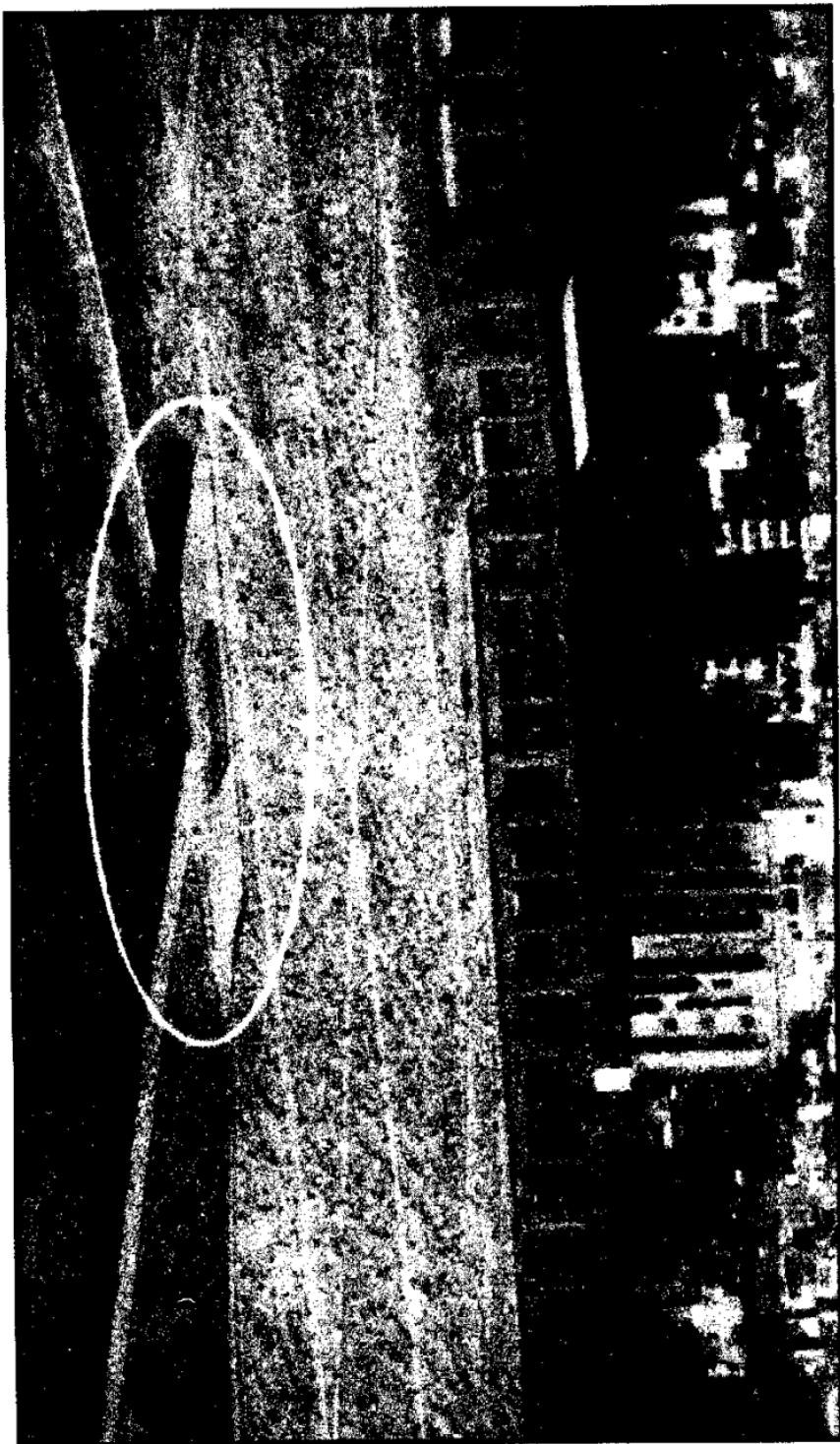
پانچ منٹ کا راستہ ہے۔ پہلے بقیع جانے والے کو بہت سی گلیوں سے گزرنا پڑتا تھا، مگر اب حکومت نے مسجد نبوی اور بقیع کے درمیان سیدھی، کھلی اور پختہ سڑک بنا دی ہے جس سے بقیع آنا جانا بہت آسان ہو گیا ہے۔ یہ قبرستان بھی جاہلیت کے زمانہ سے اہل مدینہ کا قبرستان چلا آ رہا ہے۔ ترکوں کے دور میں یہاں بھی بہت سی پختہ قبریں اور ان پر خوبصورت قبے بنے ہوئے تھے۔ مگر نجدی حضرات نے شریف حسین کو شکست دے کر جب مدینہ منورہ پر قبضہ کیا، تو یہاں کے اکثر قبے گرا دیے اور قبریں توڑ دیں، لیکن بہرحال مکہ معظمہ کے المعلاۃ کی بہ نسبت یہاں پختہ قبروں کی تعداد اب بھی زیادہ ہے اور اس میں راستوں کا عمدہ انتظام ہے۔

مدینہ منورہ سے عقبہ

(19 تا 30 دسمبر)

19 دسمبر کو ہمارا پروگرام مدینہ منورہ سے العلا روانہ ہونے کا تھا، جو مدینہ سے شمال میں اس راستہ پر واقع ہے، جو تبوک کو جاتا ہے۔ امیر مدینہ عبداللہ سدیری نے اپنی مہربانی سے ہمارے سفر کے بہترین انتظامات کر دیے تھے۔ خنجر اور بندوق سے مسلح آدمی ہماری رہنمائی کے لیے دیا، جس کا نام حمدان تھا اور وہ مدینہ منورہ ہی کا رہنے والا تھا۔ انسپکٹر جنرل پولیس جناب حسن شیبہ نے ایک ڈرائیور سے جس کا نام عیاد تھا، ہمارا یہ معاملہ طے کرا دیا اور اس سے باقاعدہ تحریر لے لی کہ وہ اپنی گاڑی ۔۔۔ فورڈ پک اپ ۔۔۔ میں ہم کو اردن کی سرحد تک پہنچائے گا اور ہم سے سو ریال (تقریباً سوا سو روپیہ) روزانہ کے حساب سے اجرت وصول کرے گا۔

مدینہ کے شمالی علاقہ میں سفر کے لیے یہ انتظامات اشد ضروری تھے، کیونکہ اس علاقہ میں ایک تو آبادی بہت کم ہے اور دوسرے اس میں مواصلات کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ ریت اور چٹانوں پر گاڑیاں چلتی ہیں اور انہی پر گاڑیوں کے چلنے سے راستے کے جو نشانات بن گئے ہیں، ان ہی پر صرف باربرداری کے ٹرک چلتے ہیں۔ خود لوگ عموماً ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں اور اسی لیے سعودی حکومت نے ہوائی جہازوں کے کرائے (خصوصاً سعودی باشندوں کے لیے) بہت کم رکھے ہیں۔ جنگ عظیم اول تک اس علاقے سے حجاز ریلوے گزرتی تھی۔ اس لیے اس زمانہ میں یہاں آبادی بھی تھی اور لوگوں کے لیے نقل و حرکت میں بھی دقت نہ تھی۔ مگر جب جنگ عظیم اول میں حجاز کے ترکی گورنر شریف حسین (اردن کے موجودہ شاہ حسین کے پردادا) نے انگریزوں سے مل کر ترکوں کے خلاف

نقشہ ارض فلسطین
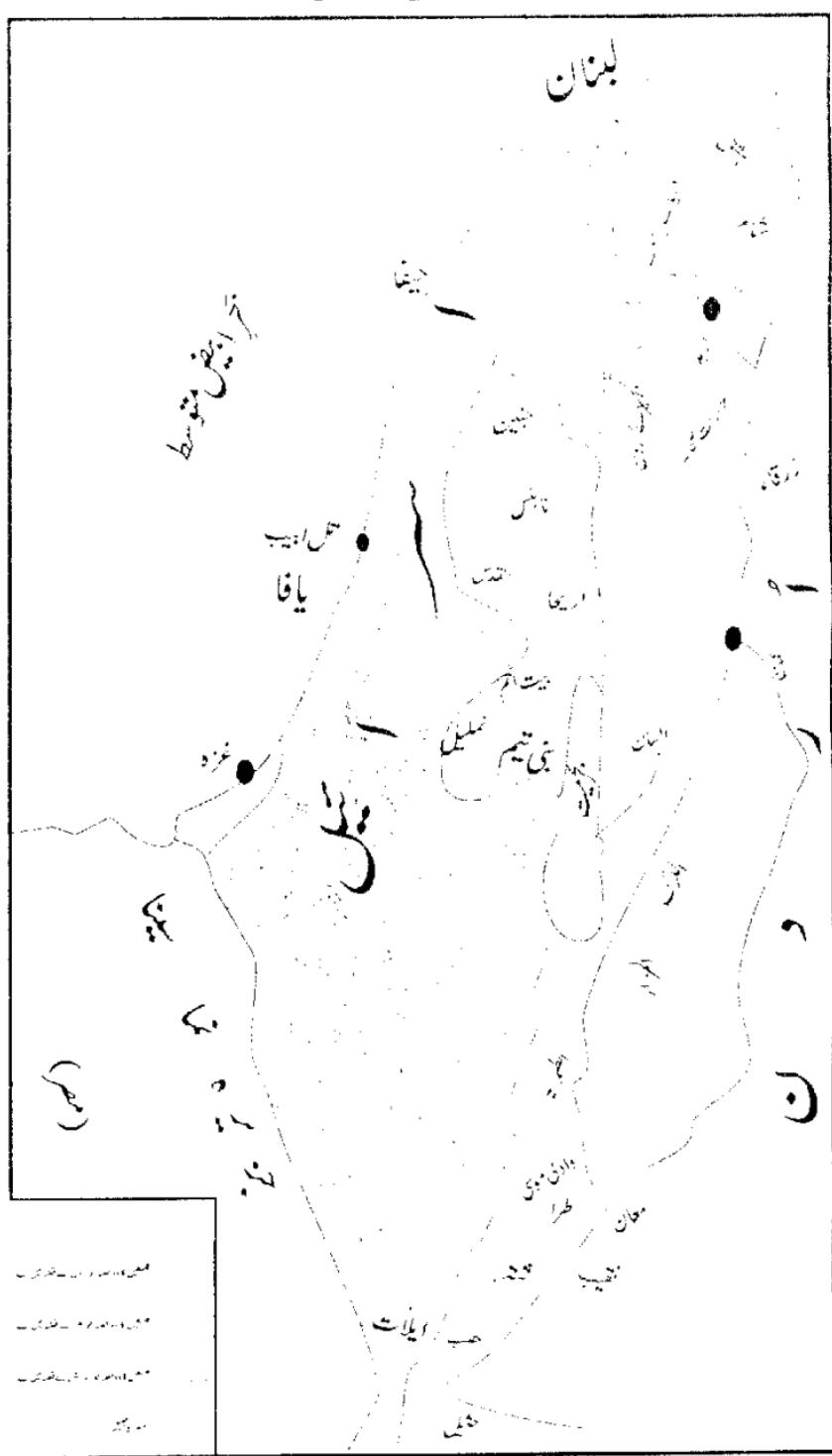
بغاوت کی تو انگریزوں نے سب سے پہلے عرب فوجیوں سے حجاز ریلوے لائن تباہ کرائی، تاکہ اس سے بیک وقت دو فائدے حاصل کئے جاسکیں۔ ایک طرف ترکوں کے راستے میں رکاوٹ پیدا کی جائے اور دوسری طرف خود عربوں کے لیے اس ریلوے کو بے کار کر دیا جائے۔ عرب ایک جذباتی قوم ہے۔ جب جوش میں آتی ہے تو ہوش سے کم ہی کام لیتی ہے۔ اس نے کرنل لارنس کے بہکانے پر خود اپنے گھر کی دولت برباد کر ڈالی۔ اس وقت سے آج تک یہ ریلوے لائن بے کار پڑی ہوئی ہے اور اسکی وجہ سے مدینہ سے شمال کا تمام علاقہ اجڑ کر رہ گیا ہے۔ اب کبھی کبھار اخبارات میں یہ خبریں آنے لگی ہیں کہ سعودی عرب اور اردن و شام کی حکومتوں کے درمیان اس لائن کی مرمت پر بات چیت ہو رہی ہے، لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ عملاً یہ کام کب شروع ہو سکے گا۔ بہر حال جب تک اس لائن پر دوبارہ گاڑی چلنا شروع نہیں ہو جاتی، عرب کے شمالی حصہ میں سفر کرنا بڑا مشکل ہے۔

صبح آٹھ بجے کے قریب حمدان اور عیاد دونوں تیار ہو کر ہمارے ہوٹل پہنچ گئے۔ ساڑھے نو بجے تک ہم نے اپنا سامان باندھا اور موٹر میں اس طرح ترتیب دیا کہ آگے ڈرائیور کے ساتھ مولانا اور حمدان بیٹھ سکیں اور پیچھے چودھری صاحب اور میں۔ پھر الوداعی سلام کے لیے روضۂ مبارک پر حاضری دی اور اللہ تعالٰی کے حضور دعا کی کہ ہمیں اپنے حبیبؐ کے دربار میں بار بار آنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا آئندہ سفر آسان کر دے۔ اس کے بعد امیرِ مدینہ کے دفتر آئے تاکہ روانگی سے پہلے ان سے الوداعی ملاقات کر لی جائے اور انکا شکریہ بھی ادا کر دیا جائے۔ انسپکٹر پولیس کا دفتر بھی قریب تھا۔ میں اور چودھری صاحب ان سے بھی الوداعی سلام کے لیے گئے۔ انہوں نے ڈرائیور کو خوب سمجھایا کہ اگر کوئی گڑبڑ کی تو لائسنس کینسل کر دوں گا، شاید ان ہی کی اس تائید کا اثر تھا کہ مجموعی طور پر ڈرائیور نے پورے سفر کے دوران میں ہم سے نہایت شریفانہ سلوک کیا اور کسی جگہ بلا وجہ تنگ کرنے کی کوشش نہیں کی، جیسا کہ عموماً عرب کے ڈرائیوروں کا طریقہ ہے۔

مدینہ سے العلاء

11 بجے کے قریب ہم مدینہ منورہ سے روانہ ہو سکے۔ چند میل پختہ سڑک پر چلنے کے

بعد بائیں ہاتھ کو مڑے اور کچے راستے پر حجاز ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سفر شروع کیا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ایک اسٹیشن کے قریب قیام کیا، وہاں ظہر وعصر کی نمازیں پڑھیں، کھانا کھایا اور پھر ڈھائی بجے کے قریب دوبارہ سفر شروع کیا۔ اس کے بعد رات کے 9 بجے تک برابر چلتے رہے۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ اس لیے خیال تھا کہ کوئی اسٹیشن مل جائے تو رات وہیں بسر کریں گے۔ لیکن جب کسی اسٹیشن سے مایوسی ہوگئی تو ایک جگہ کچھ کھلا میدان دیکھ کر اتر گئے۔ سٹوو پر کھانا پکایا، نماز پڑھی اور وہیں ریت پر بستر لگا کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ ریلوے اسٹیشن قریب تھا۔

اگلی صبح (20 دسمبر) نماز اور ناشتہ سے فارغ ہوکر پھر روانہ ہوئے اور ظہر کے قریب العلاء پہنچ گئے۔

مدینہ طیبہ سے العلاء تک سارا راستہ بالکل کچا ہے، کہیں پہاڑی راستہ ہے اور کہیں ریگستانی۔ پورے راستے میں ہر طرف پہاڑ ہیں۔ 520 میل کے پورے سفر میں کسی جگہ بھی ہم پہاڑوں کی قید سے نکل کر کھلے میدان میں نہیں آسکے۔ پورا علاقہ غیر آباد ہے۔ درمیان میں صرف ایک وادی ایسی ملی، جس میں چھوٹا سا نخلستان تھا۔ مدینہ سے چند میل چلنے کے بعد العلاء تک سارا راستہ زیادہ تر حجاز ریلوے لائن کے ساتھ چلتا ہے۔ راستہ میں جگہ جگہ اسٹیشن آتے ہیں جو بالکل غیر آباد علاقہ میں ہیں، تمام اسٹیشن نہایت پختہ اور سنگین بنے ہوئے ہیں۔ دروازے اور کھڑکیاں سب بدوؤں نے نکال کر جلا لی ہیں، لیکن عمارتیں ایسی حالت میں ہیں کہ اگر نئے سرے سے ریل جاری ہو تو یہی لائن تھوڑی سی اصلاح وترمیم کے ساتھ پھر کام دے سکتی ہے۔

ریلوے لائن بہت بڑی حد تک محفوظ ہے۔ پٹڑیاں اتنے اعلیٰ درجے کے لوہے کی بنی ہوئی ہیں کہ ان میں اب تک کوئی خرابی نہیں آئی اور یہ اب بھی قابلِ استعمال ہیں۔ بہت سے مقامات پر لائن بالکل ٹھیک حالت میں ہے بلکہ پل تک قائم ہیں۔ بعض مقامات پر پل ٹوٹ گئے ہیں اور نیچے سے زمین نکل گئی ہے، لیکن اپنے لوہے کے سلیپروں کے ساتھ برابر جڑی ہوئی ہے اور لٹک رہی ہے۔ راستے میں بعض مقامات پر گاڑیاں الٹی ہوئی ہیں۔ ایک جگہ ایک انجن بھی ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ ایک جگہ ایک انجن چند ڈبوں سمیت کھڑا تھا، العلاء کے

اسٹیشن پر اب بھی ایک گاڑی کھڑی ہوئی ملی۔

راستے میں اتنی ویرانی ہے کہ صرف ایک جگہ کچھ پرندے اڑتے ہوئے دیکھے۔ کہیں متفرق طور پر کچھ اونٹ نظر آئے۔ لیکن عرب کو اونٹ سے جو نسبت ہے، اس کو دیکھتے ہوئے اونٹ گویا مفقود ہے۔ ایک جگہ دو گدھے ملے۔ مختلف جگہ مرے ہوئے اونٹ پڑے ملے، لیکن کسی جگہ گدھ وغیرہ نہ تھے۔ صرف ایک جگہ تین گدھ ایک اونٹ کی لاش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لیکن مختلف وادیوں کو دیکھ کر ہمارا اندازہ ہے کہ زمین قابل کاشت اور زرخیز ہے۔ پانی بھی زیادہ دور نہیں ہے، کیونکہ خودرو درخت جگہ جگہ نظر آئے اور خاصے سرسبز۔ زیر زمین پانی نہ ہوتو اتنی سبزی ان درختوں میں نہیں ہوسکتی۔ آرامکو والوں نے ربع خالی تک میں پانی نکال لیا ہے اس کے لیے یہاں پانی نکال لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

جب العلاء تقریباً پچاس بلکہ ستر کلومیٹر رہ گیا تو ہم کو وسیع اور کشادہ وادیاں ملنا شروع ہوئیں۔ جب ہم العلاء کے بالکل قریب پہنچ گئے تو چاروں طرف ایسے پہاڑ نظر آنے لگے، جو بالکل پھٹے ہوئے تھے اور دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں کسی شدید زلزلے نے ان پہاڑوں کو کھیل کھیل کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ کیفیت کسی جگہ ہمیں پورے عرب میں سفر کے دوران نظر نہیں آئی۔

العلاء

العلاء پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے ہم نے شہر سے باہر قیام کیا اور وہاں ایک چشمہ کے پانی سے ہاتھ منہ دھوئے، ظہر کی نماز پڑھی، کھانا کھایا اور پھر امیر العلاء کے وکیل (سیکرٹری) کے ہاں آئے، جنکا دفتر اور رہائش ریلوے اسٹیشن ہی میں ہے۔ انہیں ہماری آمد کا تار پہلے سے مل چکا تھا۔ نہایت گرم جوشی اور محبت سے خیر مقدم کیا اور راستے کا حال دریافت کرتے رہے۔ پھر عربی تہذیب کے مطابق قہوہ، چائے اور پھر قہوہ سے تواضع کر کے قریب ہی ایک مکان میں ہماری رہائش کا انتظام کر دیا۔

عشاء کا کھانا ہم نے وکیل امیر (جن کا نام بعد میں مساعد معلوم ہوا) کے ساتھ کھایا۔ کھانے پر ان کے مدیر مالیات، مدیر زراعت اور مدیر پولیس بھی موجود تھے، سفر اور مقصد

سفر کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ العلاء کی آبادی تقریباً بارہ ہزار ہے اور اردگرد کی آبادی کو بھی شامل کرلیا جائے تو کل آبادی ساٹھ ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔سعودی عرب کے لوگ اپنے ہاں کی آبادی بتانے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ان حضرات کے اس بیان میں ہمیں خاص طور پر مبالغہ معلوم ہوا۔ان کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ العلاء میں چار ابتدائی اور ثانوی مدرسے ہیں اور ایک دارالایتام ہے۔ابتدائی مدرسہ میں طلبہ کی تعداد 200 فی مدرسہ ہے۔ یہ سب اس کوشش کا نتیجہ ہے جو سعودی حکومت اپنے ملک میں تعلیم پھیلانے کے لیے کر رہی ہے۔ العلاء یوں بھی ایک سرسبز وشاداب جگہ ہے۔ یہاں میٹھا انار، انگور، کھجور اور بعض دوسرے پھل بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ وکیل امیر کے دسترخوان پر یہاں کا میٹھا ہم نے کھایا جو بہت خوب تھا۔ غالباً العلاء ہی جگہ ہے جس کا ذکر حدیث وتاریخ کی کتابوں میں وادی القری کے نام سے ملتا ہے۔

اگلے دن (21 دسمبر) صبح کی نماز اور ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم امیر العلاء احمد السدیری سے ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ پر گئے۔جن کی رہائش ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلہ پر ہے اور وہ مدینہ کے امیر عبداللہ السدیری کے بھتیجے ہیں۔

مدائن صالح

امیر العلاء کے ہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہم مدائن صالح کے لیے روانہ ہو گئے جو وہاں سے تقریباً 30 میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، بلند اور پھٹے ہوئے پہاڑوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی۔بعض پہاڑ اس قدر بلند اور سیدھے کھڑے ہوئے تھے کہ انہیں دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔بعض پہاڑوں کی شکل مندروں اور قلعوں کی سی تھی۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ثمود نے ان پر اپنے محلات، قلعے اور مندر بنائے ہوں اور اب وہ زلزلہ کی وجہ سے پھٹ گئے ہوں۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد ہم مدائن صالح پہنچ گئے، جس کا قدیم نام الحجر آج بھی لوگوں میں معروف ہے اور قرآن مجید اور سیرت کی کتابوں میں اس کا اسی نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں آج سے 6 ہزار سال پہلے حضرت صالح ؑ کی قوم ثمود آباد

مدائن صالح ۔ وہ کنواں جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اُونٹنی پانی پینے کیلئے آتی تھی

العلاء۔ پہاڑوں کا سلسلہ

تھی۔ اسی قوم ثمود کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر اپنے گھر بناتی تھی اور اسے اپنی طاقت اور پائداری پر بڑا ناز تھا، یہاں تک کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول حضرت صالح پر ایمان لانے اور اپنے آپ کو ان کے حکم کے تابع کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایمان لانے کا موقع دیا، لیکن جب تمام نشانیاں دیکھ لینے کے بعد بھی وہ اپنی نافرمانی اور سرکشی پر برقرار رہی تو اللہ تعالیٰ نے اسے ایک شدید زلزلہ۔۔۔ صاعقہ۔۔۔ سے تباہ کر دیا۔ قوم ثمود کا یہ واقعہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر، کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

مدائن صالح مدینہ طیبہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے کا سب سے بڑا اسٹیشن تھا۔ اس اسٹیشن کی سنگین عمارت اب تک جوں کی توں موجود ہے۔ ایک ورکشاپ بھی ویران حالت میں پڑی ہے۔ ایک انجن اور کچھ گاڑیاں خراب و خستہ حالت میں موجود ہیں۔ ممکن ہے جن دنوں ریل چلتی ہو، یہاں آبادی ہو، لیکن اب یہاں چند گھروں کے سوا کوئی آبادی نہیں ہے۔ سارا اسٹیشن بالکل خالی پڑا ہے۔ دوسری منزل کے ایک کمرہ میں ہم نے اپنا ٹھکانا بنایا۔ اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے تک سلامت تھے، لیکن جو ٹوٹ چکے تھے، وہ دوبارہ نہیں بن سکے تھے۔

ظہر کے بعد ہم آثار کے فوٹو لینے کے لیے نکلے، پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر ثمود نے جو گھر بنائے تھے وہ چاروں طرف بکثرت نظر آتے تھے، درمیان میں ایک وسیع وادی ہے، جس میں اب کوئی آبادی نہیں ہے، کہیں کہیں بدوؤں کا ایک آدھ سیاہ خیمہ نظر آ جاتا ہے اور بس۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ثمود کی اصل آبادی اس وادی کے اندر تھی اور پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر انہوں نے جو مکانات بنائے تھے، وہ دراصل سامان رکھنے اور مردوں کو دفن کرنے کے لیے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ ان مکانات میں ان کی رہائش بھی تھی۔ ہم نے چل پھر کر چند مکانات کو دیکھا اور ان کے اندر سے بھی اور باہر سے بھی متعدد فوٹو لیے۔ ان مکانات کے دروازے باقاعدہ تراشے ہوئے ہیں اور ان پر بعض جانوروں (گھوڑوں، عقاب وغیرہ) کی تصاویر بھی کندہ ہیں۔ ایک مکان کے دروازے کے اوپر عبارت بھی موجود ہے، جس کا پڑھنا اور سمجھنا بہرحال ہمارے لیے ناممکن تھا۔ بعض مکانات کے اندر الماریاں اور سامان رکھنے کی

جگہیں بھی بنی ہوئی ہیں، چوکھٹ کسی مکان کے دروازے پر نہیں ہے۔ ایک بڑے کمرے کے متعلق وہاں کے ایک آدمی نے جو ہمارے ساتھ تھا، بتایا کہ یہ ثمود کے باہمی مشورہ کی جگہ تھی۔ یہ صرف لوگوں کا قیاس ہے۔ اصل حقیقت لوگوں کو کیسے معلوم ہو سکتی ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ایک پرانا ترکی قلعہ منہدم صورت میں موجود ہے اور اس کے اندر ایک پرانا کنواں ہے جو اب خشک پڑا ہے۔ اس کنوئیں کے متعلق وہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ وہی کنواں ہے جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی، ممکن ہے ان لوگوں کا بیان صحیح ہو، کیونکہ وہ کنواں جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قطعی طور پر موجود تھا۔ تبوک جاتے وقت حضورؐ جب الحجر (مدائن صالح) سے گزرے تھے تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو ہدایت فرمائی تھی کہ یہاں کے کسی کنوئیں سے پانی نہ لیا جائے سوائے اس ایک کنوئیں کے جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔ حضورؐ کے بعد سے اب تک مسلمان آبادی برابر اس علاقہ میں رہی ہے۔ اس لیے اس کنوئیں کی تعیین کے متعلق مقامی روایت اگر صحیح ہو تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

مدینہ سے مدائن صالح تک جس راستہ سے ہم گزرے، یہ قریب قریب وہی راستہ ہے، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ موٹر میں اور وہ بھی سردی کے موسم میں سفر کرنے کے باوجود یہ راستہ جس قدر کٹھن اور دشوار گزار ہے، اس کے پیشِ نظر ہم راستے بھر یہی سوچتے اور اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے کہ اس راستہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت گرمی کے موسم میں تیس ہزار صحابۂ کرامؓ کے ساتھ کیونکر طے کیا ہوگا۔ یقیناً یہ ایک ایسی آزمائش تھی جس میں کوئی شخص جس کے دل میں ذرہ بھر بھی نفاق موجود تھا، اپنا نفاق ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

مدائن صالح سے خیبر

مدینہ طیبہ سے روانہ ہوتے وقت ہم نے یہی طے کیا تھا اور اسی پر ڈرائیور سے معاہدہ بھی ہوا تھا کہ ہم مدائن صالح سے مدینہ منورہ واپس آئیں گے اور وہاں سے خیبر جائیں

گے۔نقشہ میں دیکھا جائے تو خیبر مدائن سے جنوب مشرق میں قریب ہی واقع ہے۔اگر سیدھے راستے سے جایا جائے تو دونوں کے درمیان 115 میل کی مسافت ہے، لیکن اگر مدینہ آ کر پھر خیبر جایا جائے تو 215 میل کی مسافت بن جاتی ہے، لیکن براہ راست سفر اس لیے نہ طے کیا گیا کہ مدائن صالح اور خیبر کے درمیان کوئی آباد اور چلتا ہوا راستہ نہیں ہے۔ایک راستہ ہے مگر وہ اس قدر غیر آباد ہے کہ شاید سال بھر میں دو چار موٹریں بھی اس سے نہ گزرتی ہوں اور اسی لیے اس پر موٹروں کے نشانات بھی کم ملتے ہیں۔ایک طرف ہمیں راستے کا یہ حال معلوم تھا اور دوسری طرف مدینہ جا کر پھر خیبر پہنچنے میں وقت اور مسافت کا خیال۔ رات کو بڑی دیر تک اس پر سوچ و بچار کرتے رہے۔حمدان اور عیاد سے مشورہ کیا۔حمدان ایک مرتبہ اس درمیانی راستہ سے سفر کر چکا تھا۔اس لئے وہ تیار تھا، مگر ڈرائیور متردد تھا۔لیکن بالآخر حمدان نے اسے بھی سمجھا لیا، اس لیے ہم نے اللہ کا نام لے کر اسی راستہ سے سفر کرنا طے کر لیا۔

ایک رات مدائن صالح میں گزار کر ہم اگلی صبح (22دسمبر) خیبر کے لیے روانہ ہو گئے۔کچھ دور تک تو راستہ اچھا معلوم ہوا بلکہ مدینہ۔۔۔العلاء سے بھی بہتر، لیکن تھوڑی دور اور چلنے کے بعد اندازہ ہوا کہ مدینہ اور العلاء کے لوگ جو اس راستہ کو اختیار نہ کرنے کا مشورہ دے رہے تھے، بالکل ٹھیک مشورہ دے رہے تھے۔ یہ راستہ جس قدر خراب اور دشوار گزار تھا، اس کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا، کہیں کہیں گاڑیوں کے نشانات مل جاتے تھے مگر اکثر جگہ وہ بھی ناپید تھے۔ اس لیے ہم صرف قیاس اور سورج کو دیکھ دیکھ کر ہی راستہ طے کرتے رہے۔ایک جگہ ہم راستہ چھوڑ کر کافی دور تک غلط سمت پر چلے رہے۔ جب کافی چل لینے کے بعد بھی کسی گاڑی کا کوئی نشان نہ ملا تو حمدان کو اندازہ ہوا کہ ہم غلط سمت پر سفر کر رہے ہیں۔ واپس آئے اور پھر اصل راستہ پر چلنا شروع کیا۔سب سے بڑی مشکل وہاں پیش آتی تھی جہاں ہمیں کئی کئی میل لمبی چٹانوں کے اوپر سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا، ان چٹانوں پر بھلا موٹروں کے نشانوں کا کیا کام، اللہ کے بھروسے پر اپنے اندازے ہی سے ان چٹانوں کو پار کرتے رہے۔بعض جگہوں پر ریت کے بڑے بڑے ٹیلے پڑتے تھے اور ان کے دائیں اور بائیں طرف پہاڑ تھے اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ڈرائیور کے

سوا تمام سواریاں موٹر سے اتر جائیں اور ڈرائیور پورا زور لگا کر موٹر کو پار کر لے جائے۔ ایک جگہ گاڑی ریت میں ایسی پھنسی کہ اس کے نکالنے میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ ڈرائیور نے اپنے ساتھ لکڑی کے جو تختے رکھے ہوئے تھے وہ سب ٹوٹ گئے۔ ہم سب کو حتیٰ کہ مولانا کو بھی اردگرد سے پتھر کی بڑی بڑی سلیں لا کر پہیوں کے نیچے رکھنے کی خدمت سرانجام دینی پڑی۔ راستے میں کہیں نہ پانی ملا، نہ کوئی آدمی اور نہ کوئی جانور، حتیٰ کہ ہم مکھی تک کو تلاش کرتے رہے، مگر وہ بھی کہیں نظر نہ آ سکی۔ تقریباً 70-75 میل اس پر خطر راستے پر چلنے کے بعد شام کے ساڑھے چار بجے جب ہم اس راستے پر پہنچے جو تیما سے خیبر کو جاتا ہے تو ڈرائیور کی اور ہم سب کی جان میں جان آئی۔ اس راستہ کے قریب پہنچ کر ہمیں چند بچوں کی آواز سنائی دی اور کچھ بکریاں چرتی ہوئی ملیں۔ بالکل قریب پہنچے تو ایک بدو قبیلہ بھی نظر آیا یہ تو اللہ کا فضل تھا کہ گاڑی بالکل نئی تھی اس لیے اس کا کوئی پرزہ خراب نہ ہوا۔ ورنہ اگر راستے میں موٹر ہی خراب ہو جاتی تو نہ معلوم ہم سب کا کیا حشر ہوتا۔ ڈرائیور بھی اگر کوئی ہمارے ہاں کا ہوتا تو شاید ہمت ہار جاتا۔ مگر عیاد نے ہمت نہیں ہاری اور پوری تن دہی سے ہر جگہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ عرب کے ڈرائیور خصوصاً سوڈان سے آئے ہوئے یوں بھی جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں۔ عیاد بھی اصل میں سوڈان کا رہنے والا تھا اور چند سالوں سے مدینہ میں آباد ہو گیا تھا۔

تیما سے خیبر کا راستہ بھی اپنی دشواری کے لحاظ سے بہتر نہ تھا، لیکن چونکہ چلتا ہوا راستہ تھا اور اس پر چلتے رہنے کی وجہ سے پہیوں کے نشانات نمایاں تھے۔ اس لیے ہمیں مطلقاً بھٹک جانے کا اندیشہ نہ تھا۔ ہم رات کے 8 بجے تک برابر چلتے رہے۔ جب خیبر 45 میل کے قریب رہ گیا تو ایک جگہ کھلے میدان ہی میں اتر کر رات گزاری۔ حمدان اور ڈرائیور تو جنگل سے لکڑیاں توڑ لائے اور ان ہی کو جلا کر کھانا بھی پکاتے رہے اور آگ بھی تاپتے رہے۔ ہمارے لیے آگ تاپ کر رات گزارنا مشکل تھا۔ موٹر سے سامان نکال کر باہر رکھا اور اس کے اندر کسی نہ کسی طرح اپنے بستر بچھا لیے۔ سردی اگرچہ اچھی خاصی تھی لیکن بہرحال اس نے پریشان نہیں کیا اور نیند آ گئی۔ اتفاق سے اس وقت تک اس علاقہ میں موسم سرما کی بارش نہیں ہوئی تھی، ورنہ اگر بارش ہو چکی ہوتی، تو شاید ہمارے لیے اس طرح

پہاڑوں کے درمیان کھلے میدان میں رات گزارنا ممکن نہ ہوتا، سنا ہے کہ بارش ہو جانے کے بعد یہاں کی سردی بعض اوقات نقطہ انجماد سے بھی نیچے گر جاتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ بارش کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ہم تبوک پہنچ چکے تھے، یعنی پُر خطر راستے سے نکل چکے تھے۔ بارش ہو جانے کی صورت میں ایک خطرہ یہ بھی ہوتا کہ وادیوں میں پانی بہنے لگتا اور معلوم نہیں ہمیں کس مقام پر کتنے دن تک رُک کے رہنا پڑتا۔

خیبر

اگلی صبح (23دسمبر) نماز اور ناشتہ سے فارغ ہو کر پھر روانہ ہوئے اور 7 بجے کے قریب خیبر پہنچ گئے۔ خیبر کے قریب پہنچتے ہی ہم نے اپنے آپ کو ایک سرسبز و شاداب علاقہ میں پایا۔ ہر طرف لاوے کی جلی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان سرسبز و شاداب نخلستان نظر آ رہے تھے۔ خیبر کی وسعت اور شادابی اس سے کہیں زیادہ تھی جس کا ہم اپنے ذہن میں تصور رکھتے تھے۔ عرب کی سرزمین میں یہ عجیب بات ہے کہ جہاں لاوے کی جلی ہوئی پہاڑیاں (حرات) زیادہ ہیں وہاں نخلستان اتنے ہی گھنے ہیں۔ مدینہ طیبہ کی بھی جن دو طرفوں میں لاوے کی جلی ہوئی پہاڑیاں ہیں وہاں کھجور کے باغ بکثرت پائے جاتے ہیں۔

خیبر ہے تو انتہائی زرخیز علاقہ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں اس کے راستے اور مکان جس طرح بن گئے تھے، اسی طرح اب تک چلے آ رہے ہیں اور ان میں ذرہ برابر کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی۔ ہم کھجور کے مختلف باغوں کے درمیان تنگ و خم دار گلیوں سے گزرتے ہوئے امیر خیبر کے ہاں آئے، جن کا دارالامارۃ حصن مُرحَب میں ہے، ممکن ہے کہ اس کی عمارت مرمت و تجدید کے مرحلوں سے گزرتی رہی ہو، لیکن یہ اب تک قریب ان ہی بنیادوں پر موجود ہے، جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھا۔ حصن مرحب سے مراد مشہور یہودی سردار مرحب کا وہ قلعہ ہے جسے حضرت علیؓ نے فتح کیا تھا، یہ قلعہ بہت ہی بلند پہاڑی پر واقع ہے اور اس پہاڑی کے دامن میں وہ جگہ ایک مسجد کی شکل میں موجود ہے، جہاں حضرت علیؓ نے مرحب کو قتل کیا تھا۔ اس پہاڑی پر چڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہم خود تو اس پر چڑھ گئے، لیکن سامان کا چڑھانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ امیر خیبر، جن کا

نام بعد میں عبدالرحمان بن حمدان معلوم ہوا، کو ہمارے آنے کا تار پہلے سے مل چکا تھا اور وہ ہمارے منتظر تھے۔ نہایت گرم جوشی اور محبت سے پیش آئے۔ عربی اصولِ مہمانی کے مطابق چائے اور قہوہ سے تواضع فرمائی اور ہمارے قیام کا انتظام شہر ہی کے ایک حصہ میں کر دیا اور رات کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔

کچھ دیر آرام کرنے اور پھر ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد امیر خیبر ہی کے ایک آدمی جس کا نام سہیل تھا، کے ساتھ ہم خیبر کے آثار دیکھنے کے لیے نکلے، سب سے پہلے ہم ایک کھلے میدان میں پہنچے۔ جو خیبر کی آبادی سے ملحق شمال کی طرف واقع ہے، اس میدان کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہ وہی میدان ہے، جہاں لشکرِ اسلام اور یہودیوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ اس میدان کے شمال میں اور البشر نامی ایک چھوٹی سی بستی کے مشرق میں وہ مقام بھی واقع ہے، جہاں شہداء کو دفن کیا گیا تھا۔ چند پتھروں پر بعض شہداء کے نام بھی ہیں، جو سب کوفی زبان میں لکھے ہوئے ہیں اور اس قدر مدھم ہو گئے ہیں کہ ان کا پڑھنا ممکن نہیں ہے۔

اس کے بعد ہم دارالامارۃ کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک اور پہاڑی پر پہنچے، جہاں ایک پرانے قلعہ کے منہدم۔۔۔ آثار موجود ہیں۔ سہیل نے بتایا کہ یہ حصن الوطیح کے آثار ہیں۔ اس کے مشرق میں حصن المناعم، شمال میں حصن نطاۃ اور حصن الکتیبہ، شمال مغرب میں حصن الشق اور جنوب مغرب میں حصن السلالم کی جگہیں بھی معلوم و معروف ہیں، بعض کے نشانات موجود ہیں اور بعض کے نشانات ختم ہو گئے ہیں۔ سیرت اور حدیث کی کتابوں میں غزوۂ خیبر کے تحت یہودیوں کے ان تمام قلعوں کا ذکر ملتا ہے۔

خیبر میں چلنے پھرنے اور وہاں کے لوگوں کے بتانے سے معلوم ہوا کہ خیبر میں کل سات وادیاں ہیں، جو سب ایک دوسرے سے الگ الگ واقع ہیں اور ان میں سے ہر وادی دوسری وادی سے بڑھ کر سرسبز و شاداب ہے۔ جگہ جگہ ہمیں پانی کے چشمے اور کنوئیں نظر آئے۔ لوگوں نے بتایا کہ ان وادیوں میں چشموں کی تعداد سو کے قریب ہے اور ان میں کھجور کے علاوہ انگور، انار، ترنج، لیموں اور انجیر کے درخت بھی کثرت سے موجود ہیں۔

خیبر کو دیکھنے کے بعد سب سے اہم بات جس کا ہمیں اندازہ ہوا وہ یہ کہ عہدِ نبویؐ کے بہت سے غزوات کو انسان اس وقت تک ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ جا کر ان
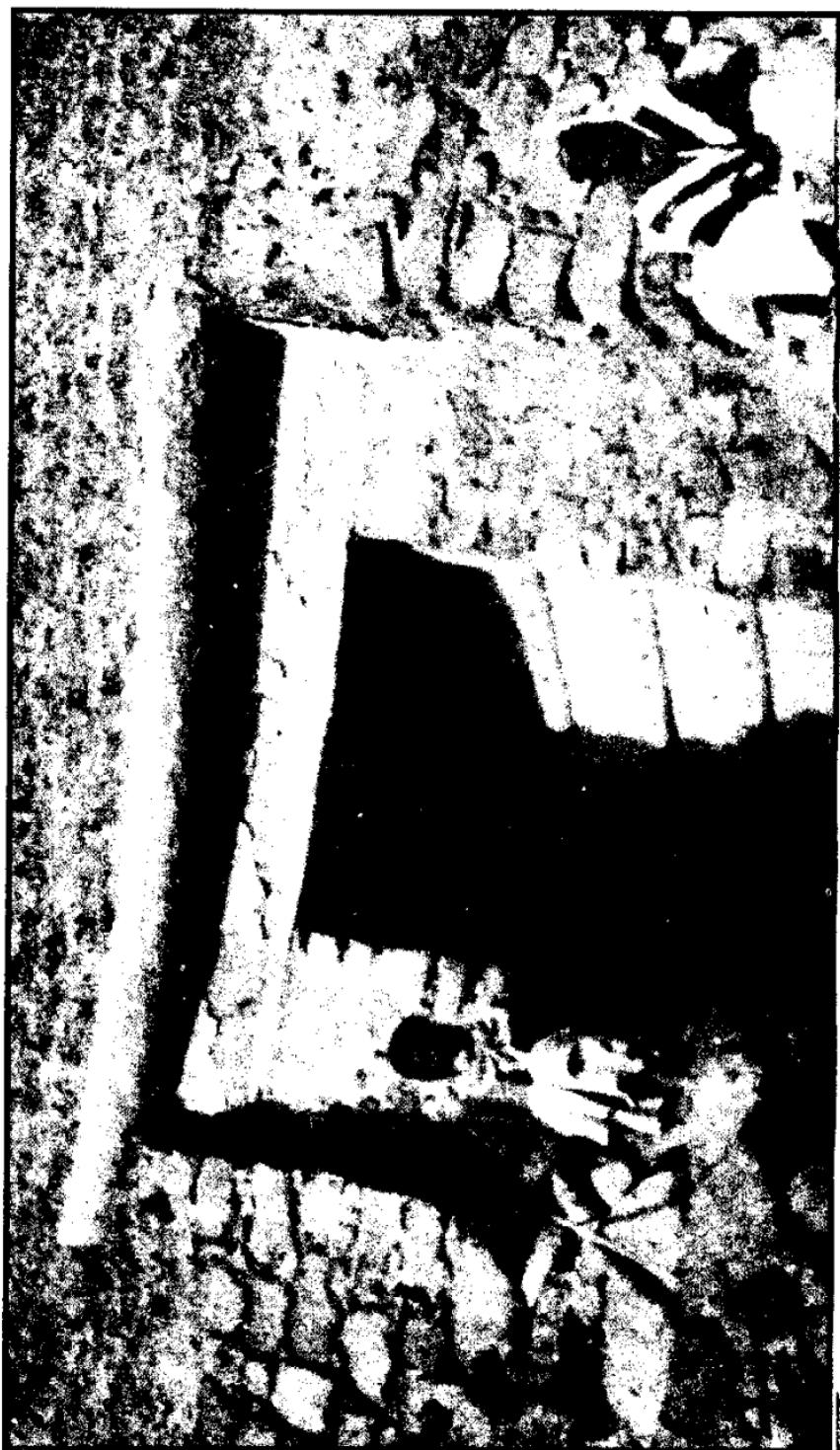
خیبر۔ قلعہ مرحب کا دروازہ

خیبر مسجد علیؓ (قلعہ مرحب کے دامن میں) اس مقام پر حضرت علیؓ نے مرحب کو قتل کیا تھا۔

کے مواقع کو بچشم خود نہ دیکھ لے۔ یہودیوں نے یہاں الگ الگ سات قلعے کیوں تیار کر رکھے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو ان کے فتح کرنے میں سخت دشواری کیوں پیش آئی تھی؟ اس کی وجہ وہاں جا کر آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے۔

رات کا کھانا ہم نے حسب وعدہ امیر ہی کے ہاں کھایا۔ امیر بار بار معذرت کرتے رہے کہ اس سال بارش نہیں ہوئی اور حلال مر گئے، ورنہ پورا حلال ذبح کرتے۔ حلال کو پہلے ہم نہ سمجھ سکے، لیکن جب امیر نے اپنی گفتگو میں اس کا بار بار اعادہ کیا تو ہم سمجھ گئے کہ اس سے ان کی مراد بکری یا دنبہ ہے۔ بعد میں ہم نے دیکھا کہ حلال کا بکرے یا دنبہ کے معنی میں یہ استعمال عرب کے پورے شمالی علاقہ میں عام ہے۔ دوسرے کسی علاقہ میں ہم نے اس کا یہ استعمال نہیں سنا۔

ہمارا پروگرام اگلے دن (24 دسمبر) علی الصبح تیما روانہ ہو جانے کا تھا، لیکن 23 کی شام کو ڈرائیور نے یکا یک اطلاع دی کہ راستے میں اس کی موٹر کا ایک پرزہ خراب ہو گیا تھا۔ رات بھر اس نے دوسرے ڈرائیوروں کے پاس یہ پرزہ تلاش کیا، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر اس نے بتایا کہ یہ پرزہ کسی آدمی کو خاص طور پر مدینہ بھیج کر منگوانا پڑے گا اور اس انتظار میں 24 تاریخ کا پورا دن ہمیں خیبر ہی میں گزارنا ہو گا، چنانچہ 24 کی صبح ہم اطمینان سے بیٹھے رہے اور چلنے کی کوئی تیاری نہیں کی۔ 10 بجے کے قریب ڈرائیور نے یکا یک تیار ہو جانے کا نوٹس دیا کیونکہ اسے پرزہ خیبر ہی کے ایک ڈرائیور کے پاس سے مل گیا تھا۔ ہم نے اس خیال سے کہ شام تک تیما پہنچ جائیں اور رات راستے میں نہ گزارنی پڑے۔ جلدی جلدی اپنا سامان باندھا اور موٹر میں رکھ دیا، لیکن ابھی روانہ نہ ہوئے تھے کہ دو بزرگ نمودار ہوئے۔ دونوں اگرچہ خالص عربی لباس میں تھے، لیکن ان میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ میرا نام عبداللہ بن احمد ہے اور اصل میں سندھی ہوں اور آج سے پچپن سال پیشتر خیبر آ کر آباد ہو گیا تھا۔ اور اب اس قدر عرب ہو گیا ہوں کہ اردو اور سندھی زبان تقریباً بھول گیا ہوں اور میرے بیٹے اور ان کے بچے تو ان دونوں زبانوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس کے بعد شیخ عبداللہ بن احمد ہمیں زبردستی اپنے ہاں لے گئے اور چائے اور پھلوں کا زبردست ناشتہ

کرایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پاکستان، خصوصاً سندھ کے، جو حاجی خیبر کے راستے سے گزرتے ہیں، شیخ عبداللہ ان سب کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں اور اپنی حد تک ان کی ضیافت و مساعدت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔

خیبر سے تیما

12 بجے کے قریب ہم روانہ ہونے کے لیے موٹر میں بیٹھ سکے۔ ابھی موٹر روانہ نہ ہوئی تھی کہ امیر کا ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے ہمیں امیر کی طرف سے حلال کا ایک بچہ پیش کیا۔ دراصل امیر کو عربی طریق پر ہماری مہمانی نہ کر سکنے کا برابر افسوس رہا۔ اس لیے انہوں نے اس کی تلافی کرنے کے لیے یہ حلال کا بچہ راستے میں ہماری ضیافت کے لیے ساتھ کرنا ضروری سمجھا، ہم نے اسے بخوشی قبول کیا اور پھر شام کو تیما کے راستے میں اسے ذبح کیا اور رات کو راستے ہی میں ایک جگہ ٹھہر کر اس کے پلاؤ سے کام ودہن کو لذت دی۔ اس رات بھی پہاڑوں کے درمیان ایک کھلے میدان میں موٹر کے اندر ہی سونا پڑا۔

تیما کا یہ راستہ اس قدر خراب (عربوں کی عامی زبان میں بطال) تھا کہ پورے سفر میں اس سے خراب راستہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کی بعض سمتوں میں گاڑی 7-8 میل کی رفتار سے زیادہ نہیں چل سکتی تھی اور کہیں کہیں بیل گاڑی کی رفتار سے چلنا پڑتا تھا۔ ایک دن اور ایک رات چلنے کے بعد 25 دسمبر کو جمعہ کے وقت ہم تیما پہنچے۔ خیبر سے تیما کے درمیان 250 میل کے قریب مسافت ہے۔ اس پورے سفر میں ہمیں ایک بھی آبادی نہیں ملی۔ صرف ایک جگہ ایک بدو ملا جو پیدل سفر کر رہا تھا اور معلوم نہیں کہاں سے آیا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس نے دور سے اپنے بدوانہ لہجے میں آواز دے کر ہماری گاڑی کو رکوایا اور ایک بڑے پیالے میں پانی مانگا ہم نے پانی سے اس کا پیالہ بھر دیا، جسے اس نے ایک مرتبہ منہ کو لگایا اور سارے کا سارا اپنے اندر انڈیل لیا۔ پھر ہم نے اسے کچھ روٹیاں دیں، جنہیں وہ اس بے تابی سے کھانے لگا جیسے کئی دن سے بھوکا ہو، بدوؤں کے اس کمال کا ہم نے تذکرہ تو سنا تھا، لیکن اسے دیکھا نہ تھا کہ وہ سردی کے موسم میں ایک کمبل، ایک پیالہ اور ایک دیا سلائی لے کر عرب کے اس غیر آباد علاقہ میں لمبے سے لمبا سفر کرنے کے لیے نکل پڑتے

ہیں۔ رات پڑ گئی تو جنگل سے لکڑیاں توڑ لیں اور ان ہی کو جلا کر رات گزار لی۔ راستے میں کوئی موٹر مل گئی تو اس سے پانی لے کر پی لیا، ورنہ بھوکے پیاسے چلتے رہے۔ اس میں جہاں ان بدووں کی جفاکشی کا دخل ہے، وہاں ان کی غربت و ناداری کا بھی دخل ہے۔ اس وقت عرب میں یا تو وہ لوگ ہیں جو ہوائی جہاز سے کم سفر نہیں کر سکتے ۔۔۔ یا پھر اس قسم کے دیہاتی ہیں جو ٹرک پر سفر کرنے کے لیے بھی کرایہ نہیں رکھتے۔

تیما

تیما پہنچتے ہی ہم کو یکا یک ایک شاداب نخلستان ملا۔ یہاں ایک بڑا کنواں ہے، جس سے چار انجن چار چار انچ کے پائپوں سے ہر وقت پانی کھینچتے رہتے ہیں اور پانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، بس اس ایک کنوئیں کی بدولت تیما کے نخلستان آباد ہیں۔

تیما کسی زمانہ میں بابل کے ایک بادشاہ کا گرمائی دارالحکومت تھا، جس کے قصر کے کھنڈرات بھی وہاں موجود ہیں۔ بعد میں یہاں یہودیوں کی بستی قائم ہوئی۔ خیبر کی فتح کے بعد یہ مقام بھی فدک اور وادی القری کے ساتھ ساتھ جنگ کے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے تابع ہو گیا تھا، یہاں چونکہ کوئی اسلامی آثار موجود نہ تھے، اس لیے ہم صرف دو گھنٹے وہاں ٹھہر کر تبوک کے لیے روانہ ہو گئے۔

تیما سے تبوک

تیما اور تبوک کے درمیان 226 کلومیٹر (170 میل) کا فاصلہ ہے۔ ہم رات کے آٹھ نو بجے برابر چلتے رہے۔ آخر راستے ہی میں ایک جگہ ٹھیر کر پھر موٹر کے اندر سونا پڑا۔ تیما کے بعد 50 میل تک تو راستہ ویسا ہی خراب رہا جیسا کہ خیبر سے آتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا، لیکن اس کے بعد راستہ اچھا ہونا شروع ہو گیا، بلکہ بعض جگہوں پر تو ہمیں ایسا عمدہ راستہ ملا کہ موٹر 50,40 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتی تھی۔ یوں یہ سارا راستہ بھی غیر آباد تھا۔ تبوک سے 20 کلومیٹر پہلے صرف ایک قریہ ہمیں ملا، جس کا نام القلیبہ ہے اور جہاں حجاز، عراق، تبوک اور القریات سے آنے والے چار راستے آکر ملتے ہیں اور اس لیے

وہاں سعودی حکومت کا کسٹم آفس بھی ہے۔ جب تبوک صرف پچاس کلومیٹر رہ گیا، تو ایک بہت وسیع اور ہموار میدان شروع ہوا، جسے دیکھ کر یہ وجہ سمجھ میں آ گئی کہ رومیوں نے اپنا بھاری لشکر جمع کرنے کے لیے تبوک کو کیوں منتخب کیا تھا، واقعی یہ میدان اس قابل تھا کہ یہاں رومیوں کا عظیم لشکر اور اسلامی لشکر کے تیس ہزار آدمی بیک وقت جمع ہو سکتے تھے۔

تبوک

26 دسمبر کو مغرب کے قریب ہم تبوک پہنچ گئے۔ تبوک پہنچ کر ہم نے سرکاری مہمان خانہ میں قیام کیا۔ امیر تبوک موجود نہ تھے، ان کے وکیل عبدالعزیز بن عبداللہ السدیری موجود تھے، جو ان دنوں قائم مقام امیر تھے۔ انہیں بھی ہماری آمد کا تار پہلے سے مل چکا تھا، اس لئے وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ مہمان خانہ نہایت عمدہ اور جدید طرز کا بنا ہوا تھا اور اس میں قیام کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ ہمیں آٹھ روز کی ''بن باس'' کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ پھر آبادی میں آ گئے ہیں۔ سردی کا موسم اور رات کا وقت ہونے کے باوجود ہم نے اسی وقت غسل کرنا اور کپڑے بدلنا ضروری سمجھا، ورنہ راستے بھر ہماری یہ حالت رہی تھی کہ مدینہ منورہ سے جن کپڑوں کو استعمال کے بعد میلا سمجھ کر ساتھ لیا تھا، وہ صاف ستھرے نظر آنے لگے، اس لیے ہم اپنا لباس بدلنے کے لیے ان ہی کو استعمال کرتے رہے، کیونکہ اگر بکسوں سے نئے دھلے ہوئے کپڑے نکال کر استعمال کرتے تو وہ بھی ایک آدھ گھنٹے کے بعد ویسے ہی بلکہ ان سے بھی بدتر ہو جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفر کی نوعیت کم از کم ہمارے تمام سفروں سے مختلف تھی۔

اگلے دن (28 دسمبر) صبح نو بجے وکیل امیر سے اُن کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ باخبر قسم کے نوجوان معلوم ہوئے۔ عرب ممالک کے علاوہ ہندو پاکستان کی تاریخ اور جغرافیہ سے بھی اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ ہم سے قادیانیت اور کشمیر کے مسئلہ پر خاصی دلچسپی سے گفتگو کرتے رہے۔ البتہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالتِ زار سے بالکل ناواقف تھے اور ہندوستان کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر یہی سمجھ رہے تھے کہ وہاں مسلمان پورے سیاسی حقوق رکھتے ہیں اور نہایت مطمئن ہیں۔ مولانا نے جب انہیں اصل حالات بتائے، تو وہ

حیران ہو کر کہنے لگے کہ اس میں قصور پاکستان کے قلۃ الدعایۃ (پروپیگنڈا کی کمی) کا بھی ہے۔ عرب اخبارات میں پاکستان کی طرف سے ہندوستان کے مسلمانوں سے متعلق کوئی چیز بھی شائع نہیں ہوتی۔

وکیل امیر نے مولانا سے ملاقات و تعارف کے لیے تبوک کے محکمہ شرعیہ کے رئیس (قاضی) شیخ صالح بن محمد تویجری کو بھی بلا لیا تھا، جو ازہر کے فارغ التحصیل اور عام علماء کے برعکس نہایت خوش مزاج، چست اور باخبر قسم کے آدمی معلوم ہوئے، انہوں نے خاص طور پر انشورنس اور بنک کے سود کے متعلق مولانا سے سوالات کیے اور ان کے جوابات سے متاثر ہوئے۔ بعد میں ہم نے مولانا کی دوسری کتابوں کے علاوہ الربا (سود کا عربی ترجمہ) انہیں خاص طور پر پیش کیا۔ وکیل امیر نے بھی مولانا کی بعض کتابیں پڑھی ہوئی تھیں، لیکن اکثر کتابوں سے وہ ناواقف تھے انہوں نے خود ہی مولانا سے دوسری کتابیں طلب کیں، ہمارے ساتھ سفر میں جو کتابیں ہو سکتی تھیں، ہم نے ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔

11 بجے کے قریب ہم شیخ صالح بن محمد تویجری ہی کے ساتھ تبوک اور اس کے آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔ سب سے پہلے وہ ہمیں اس جگہ لے گئے، جہاں لشکرِ اسلام ٹھیرا تھا۔ جس مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرمایا کرتے تھے، وہاں اب ایک سنگین مسجد بنی ہوئی ہے، جو 1245ھ میں ایک ترک فوجی افسر نے اپنے خرچ پر بنوائی تھی، اور اس سے پہلے لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ ان دنوں اس مسجد میں ہیئۃ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مرکز بھی قائم ہے۔ اور اس سے متصل ایک پرانا ترکی قلعہ ہے، جو اب جیل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اس کے بعد مسجد کے قریب ہی ہم ایک چشمے پر آئے، جس کے گرد وسیع منڈیر بنی ہوئی ہے، لیکن وہ خشک پڑا ہے۔ شیخ صالح نے بتایا کہ یہی وہ چشمہ ہے جس کے متعلق صحیح مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ روایت آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تبوک کے راستہ میں تھے کہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: ''کل تم تبوک کے چشمہ پر پہنچو گے۔ تمھارے وہاں پہنچتے پہنچتے چاشت کا وقت ہو جائے گا۔ تم میں سے جو شخص وہاں (پہلے) پہنچ جائے، تو اس چشمہ کے پانی کو استعمال نہ کرے۔'' جب لشکرِ اسلامی وہاں پہنچا، تو دیکھا کہ دو آدمی پہلے سے وہاں پہنچے ہوئے ہیں اور چشمہ سے قطرہ قطرہ کر کے پانی نکل

رہا ہے۔ حضورؐ نے ان دونوں آدمیوں سے دریافت فرمایا کہ تم نے اس چشمہ کا پانی استعمال کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ جی! آپؐ نے ان دونوں پر خفگی کا اظہار فرمایا۔ پھر صحابہ کرامؓ نے چلوؤں سے ایک برتن میں اس چشمہ کا پانی جمع کیا۔ حضورؐ نے اس سے اپنا چہرہ مبارک اور ہاتھ دھوئے اور اسے چشمہ میں ڈال دیا۔ اس کے گرتے ہی چشمہ سے بے تحاشا پانی ابل کر نکلنا شروع ہوا۔ جسے تمام لشکرِ اسلامی نے استعمال کیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے حضرت معاذؓ سے یہ بھی فرمایا: ''اے معاذ! اگر تمھاری زندگی رہی تو تم اس علاقہ کو باغوں سے بھرا ہوا پاؤ گے۔''۔۔۔۔ شیخ صالح نے بتایا کہ یہ چشمہ دو سال پہلے تک مسلسل پونے چودہ سو سال تک ابلتا رہا۔ بعد میں نشیبی علاقوں میں ٹیوب ویل کھودے گئے تو اس چشمہ کا پانی ان ٹیوب ویلز کی طرف منتقل ہو گیا۔ تقریباً پچیس ٹیوب ویلز میں تقسیم ہو جانے کے بعد اب یہ چشمہ خشک ہو گیا ہے۔

اس کے بعد شیخ صالح ہمیں ایک ٹیوب ویل کی طرف بھی لے گئے جہاں ہم نے دیکھا کہ چار انچ کا ایک پائپ لگا ہوا ہے اور کسی مشین کے بغیر اس سے پانی پورے زور کے ساتھ نکل رہا ہے۔ قریب قریب یہی کیفیت دوسرے ٹیوب ویلز کی بھی ہمیں بتائی گئی۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے ہی کی برکت ہے کہ آج تبوک میں اس کثرت سے پانی موجود ہے کہ مدینہ اور خیبر کے سوا ہمیں کہیں اتنا پانی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تبوک کا پانی ان دونوں جگہوں سے بھی زیادہ ہے۔ اس پانی سے فائدہ اٹھا کر اب تبوک میں ہر طرف باغ لگائے جا رہے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق تبوک کا علاقہ باغوں سے بھرا ہوا ہے اور دن بدن بھرتا جا رہا ہے۔

ہم نے مہمان خانہ میں واپس آ کر دوپہر کا کھانا وکیل امیر اور دفتر کے دوسرے کارکنوں کے ساتھ کھایا اور پھر دوبارہ شیخ صالح کے ساتھ تبوک کا شہر دیکھنے کے لیے نکل گئے۔ یہ شہر نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ ہر طرف پختہ اور جدید طرز کی عمارتیں بن رہی ہیں۔ کوئی اہم یا غیر اہم چیز ایسی نہیں ہے، جو اس کے بازاروں میں نہ مل سکتی ہو۔ اس لحاظ سے یہ جدہ کا چھوٹا بھائی معلوم ہوتا ہے۔ پھل تو یہاں سعودی عرب کے تمام دوسرے مقامات کی بہ نسبت سستے اور وافر ملتے ہیں، کیونکہ لبنان اور فلسطین کی طرف سے پھلوں کے

جو ٹرک سعودی عرب آتے ہیں۔ سب کے آنے کا راستہ یہی ہے۔ چند سال کے بعد تو شاید یہاں بھی خوب پھل ہونے لگ جائیں۔

سعودی حکومت نے اب تبوک کو اپنا بہت بڑا فوجی مرکز بھی بنایا ہے۔ پانچ چھ سال پہلے تک یہ ایک معمولی سا قصبہ تھا، جس کی آبادی دو تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اب یہ ہمارے اندازے کے مطابق پچاس ساٹھ ہزار کی آبادی کا وسیع شہر بن گیا ہے۔

رات کو بارش شروع ہو گئی۔ تبوک کے لوگ بڑے خوش تھے کہ پانچ سال کے بعد یہ پہلی بارش ہے، جو اس علاقہ میں ہوئی ہے۔ مولانا نے شیخ صالح سے مزاحاً فرمایا کہ یہ ہماری برکت ہے، تو وہ بہت خوش ہوئے۔

تبوک سے مغایر شعیب

اگلے روز (28 دسمبر) دوپہر کے وقت جب کہ ابھی تک بارش کا سلسلہ جاری تھا، ہم تبوک سے مغایر شعیب کے لیے روانہ ہوئے، جو تبوک سے 207 کلو میٹر (145 میل) کے فاصلہ پر مغرب کی جانب خلیج عقبہ کے ساحل سے متصل واقع ہے۔ ہمارا اب تک کا ''رہنما'' حمدان آگے کے علاقہ سے واقف نہ تھا۔ اس لیے وکیل امیر تبوک نے اس کے بجائے ہمیں ایک دوسرا رہنما دے دیا، جس کا نام عبدان تھا اور جو عمان تک ہمارے ساتھ رہا۔ ڈرائیور بھی اپنی زندگی میں سعودی عرب سے کبھی باہر نہیں نکلا تھا اور اسے عمان دیکھنے کا شوق تھا۔ وکیل امیر نے اسے بھی اپنی موٹر سمیت عمان تک جانے کی راہداری دے دی۔ اگر چہ اس سے ہمارا معاہدہ اردن کی سرحد تک پہنچا دینے کے بعد ختم ہو جانا تھا، لیکن ہم اس سے اور وہ ہم سے اس قدر خوش تھا کہ عمان تک ہم اس کی موٹر میں گئے اور اردن میں داخل ہو جانے کے بعد بھی ہم نے اس کو سو ریال روزانہ کے حساب سے اجرت دی۔

بارش ہو جانے کی وجہ سے اگر چہ سردی بہت بڑھ گئی تھی، لیکن ریت دب جانے کی وجہ سے راستہ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ شیخ صالح بن محمد تویجری اور ان کے نائب شیخ محمد ابراہیم بن عیسیٰ الوداع کہنے کے لیے دو تین میل تک ہمارے ساتھ آئے اور پھر واپس گئے۔ تبوک سے مغایر شعیب کئی راستوں سے جایا جا سکتا ہے۔ لیکن عبدان ہمیں اس راستے سے لے

گیا، جو حال ہی میں فوج نے اپنی آمد و رفت کے لیے تیار کیا ہے۔ یہ راستہ بھی اگر چہ بالکل غیر آباد اور کچا ہے، لیکن دوسرے راستوں کی بہ نسبت کچھ نہ کچھ بہتر اور مختصر ہے۔ راستے میں ہم الفوہہ، بنی مر، ابیض، الشرف اور شال وغیرہ وادیوں سے گزرے۔ وادی بنی مر میں بھی ہمیں بالکل اسی طرح کے کئی پہاڑ نظر آئے، جس طرح کے العلاء اور مدائن صالح میں پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو زلزلہ مدائن صالح کے علاقہ میں آیا تھا، اس کا اثر یہاں تک پہنچا تھا۔

رات کو پھر جنگل ہی میں ایک جگہ ٹھیرنا اور موٹر کے اندر بستر بچھا کر سونا پڑا۔ اگلی صبح (29 دسمبر) نماز اور ناشتہ سے فارغ ہو کر روانہ ہوئے، تو ایک گھنٹہ کے بعد مفرق یعنی اس جگہ پہنچ گئے، جہاں سے ایک راستہ شمال کی سمت الحقل کو اور دوسرا راستہ جنوب کی سمت مغایر شعیب کو جاتا ہے۔ ہم دوسرے راستہ پر چلے اور 11 بجے کے قریب البدع پہنچ گئے۔ البدع ایک چھوٹی سی جگہ ہے، جہاں سعودی حکومت کا ایک مقامی امیر بھی متعین ہے۔ مغایر شعیب یہاں سے صرف دو تین کلو میٹر (2 میل) ہے۔ امیر کو ہمارے آنے کا تار پہلے سے مل چکا تھا۔ اس لیے انہوں نے نہایت محبت اور گرم جوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور اپنی حد تک تکریم و ضیافت کا پورا حق ادا کر دیا۔

مغایر شعیب

البدع میں ایک گھنٹہ ٹھیرنے کے بعد ہم مغایر شعیب پہنچے۔ مغایر شعیب وہی جگہ ہے جس کا قدیم نام مدین تھا اور جہاں حضرت شعیبؑ کی قوم آباد تھی۔ اگر چہ حضرت شعیبؑ کی بعثت اس علاقے کے علاوہ تبوک کے علاقہ کے لیے بھی تھی اور بہت سے مفسرین نے تبوک ہی کو ایکہ کا علاقہ قرار دیا ہے، جس کے رہنے والوں کا قرآن حکیم میں اصحاب الایکہ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے، لیکن حضرت شعیبؑ کی دعوت کا مرکز یہی تھا۔

مغایر شعیب (یا مدین) ایک سرسبز و شاداب وسیع وادی ہے اور اس کے پہاڑوں میں بھی اسی طرح کے مکانات پائے جاتے ہیں جس طرح کے مکانات مدائن صالح میں ہم نے دیکھے تھے۔ اس کے قریب دو بہت پرانے کنوئیں ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں۔

جن کے متعلق وہاں کے عام لوگوں کا خیال ہے کہ شاید ان ہی میں سے ایک کنواں وہ ہو، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قبطی کو قتل کرنے کے بعد مصر سے پہنچے تھے۔ ان کا فاصلہ مغایر شعیب کے آثار سے تقریباً ایک میل اور البدع کی بستی سے ڈیڑھ اور دو میل کے درمیان ہے۔ ان کے قریب شمال کی طرف ایک پرانے قلعہ کے اور جنوب مغرب کی طرف ایک پرانے برکہ کے آثار بھی موجود ہیں، معلوم نہیں کہ ان کی تاریخ کیا ہے؟ اس وادی میں دوم نامی ایک درخت پایا جاتا ہے جو شاید کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا۔ اس کا پتہ پام سے مشابہ ہے اور اس پر ایک قسم کا پھل بھی لگتا ہے۔

مغایر شعیب میں دو گھنٹے تک ٹھہرے اور وہاں کے آثار کے فوٹو لینے کے بعد ہم البدع واپس آئے وہاں ظہر کی نماز پڑھی۔ امیر کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر 3 بجے کے قریب روانہ ہو کر مغرب اور عشاء کے درمیان الحقل پہنچ گئے۔ جس کا فاصلہ البدع سے 88 کلومیٹر اور مفرق سے 45 کلومیٹر ہے۔

الحقل

الحقل، اردن اور سعودی عرب کی سرحد کے قریب (تقریباً 7-8 میل کے فاصلہ پر) سعودی عرب کا ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے۔ وہاں کے امیر محمد بن حمدان ہمارا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ ان کے انتظار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عقبہ (اردن) کے اخوان کو تین دن پہلے سے ہمارے عقبہ آنے کا پتہ چل گیا تھا۔ اور وہ شدت سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے امیر حقل کو کہلا بھیجا تھا کہ جوں ہی ہم لوگ الحقل پہنچیں، انہیں فوراً اطلاع کر دیں۔ خود امیر الحقل کے بہت سے ساتھی مولانا سے پہلے سے واقف تھے اور ان میں سے بعض مولانا کی کتابیں بھی پڑھے ہوئے تھے۔ امیر الحقل نے رات کو عشاء کے بعد مولانا سے ملاقات اور تعارف کے لیے شہر کے تمام معززین کا ایک اچھا خاصا اجتماع کر ڈالا۔ جس میں ہر علمی اور دینی موضوع پر لوگوں نے مولانا سے متعدد سوالات کئے اور مولانا نے ان کے جوابات دیے۔

الحقل آخری جگہ تھی، جس کے بعد ہم سعودی عرب سے نکل کر اردن کی سرحد

میں داخل ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ العلاء، خیبر، تبوک، البدع اور الحقل کے تمام امراء نے انتہائی محبت، اخلاص اور اسلامی اخلاق و اخوت کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور جس قسم کی آسانیاں وہ ہمیں پہنچا سکتے تھے، ان میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یقیناً ان حضرات کی مہمان نوازی کو دیکھ کر ہمیں عرب کی روایتی مہمان نوازی یاد آتی رہی۔ اور ہمیں یہ احساس ہوا کہ عرب ملکوں میں قومیت اور دوسرے جو بھی فتنے آئے ہیں، وہ صرف بڑے شہروں تک محدود ہیں، چھوٹے شہروں اور دیہات میں اس قسم کا کوئی فتنہ نہیں پایا جاتا اور ان کے رہنے والے، جو سب کے سب ٹھیٹھ عرب ہیں، اپنی اصل اسلامی اخوت وفطرت پر قائم ہیں۔

پوری سعودی مملکت میں ہمیں جو سہولتیں حاصل ہوئیں، ان میں بہت بڑا دخل، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اس بات کا بھی تھا کہ سعودی مملکت کے سفیر متعینہ پاکستان محمد الحمد الشبیلی نے پہلے سے اپنی حکومت کو ہماری آمد اور اس کے مقاصد سے خصوصیت کے ساتھ مطلع کر دیا تھا، اس عنایت کے لیے ہم ان کے بہت ہی شکر گزار ہیں۔

اردن و فلسطین

(30 دسمبر 1959ء تا 11 جنوری 1960ء)

عقبہ

30 دسمبر کی صبح ساڑھے آٹھ بجے ہم الحقل سے عقبہ روانہ ہوئے جو خلیج عقبہ پر اردن کی واحد بندرگاہ ہے۔ اس کا فاصلہ سرحد سے دو میل اور الحقل سے 8-9 میل ہو گا۔ اس علاقہ کا قدیم نام ایلہ ہے، جس کے متعلق سیرت کی کتابوں میں یہ ذکر ملتا ہے کہ جن دنوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں قیام پذیر تھے۔ یہاں کا حاکم حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے جزیہ دے کر اپنے آپ کو اسلامی حکومت میں دینا قبول کر لیا۔ بعض مفسرین کا کہنا یہ بھی ہے کہ ایلہ ہی وہ جگہ ہے جہاں اصحاب السبت مچھلیاں پکڑا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ ممانعت کے باوجود ہفتہ کے روز مچھلی کا شکار کرنے کے لیے سمندر کے کنارے زمین میں گڑھے کھود لیتے تھے تاکہ بظاہر تو ہفتہ کے روز شکار نہ کریں لیکن گڑھوں میں مچھلیوں کو خوب جمع کر لیں اور اگلے روز انہیں پکڑ لیں۔ اصحاب السبت اور ان کے اس ''حیلہ شرعی'' کا سورۂ اعراف (آیت 163) میں مفصل اور بعض دوسری سورتوں میں مختصر طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

امیر الحقل نے بندوقوں سے مسلح دو سپاہی ہمارے ساتھ کیے اور سعودی کسٹم والوں کے نام پیغام بھجوایا کہ کوئی تلاشی وغیرہ نہ لی جائے۔ کسٹم والوں نے نہایت شرافت اور احترام سے معاملہ کیا اور چائے وغیرہ سے ہماری تواضع کی۔

سعودی کسٹم سے فارغ ہو کر ہم نے سرحد پار کی اور اردن میں داخل ہوئے۔ اردن

کے کسٹم والوں نے بھی نہایت عزت و احترام سے ہمارا استقبال کیا اور ہماری معذرت کے باوجود چائے پلائے بغیر نہ چھوڑا۔ پھر آگے بڑھنے نہیں دیا۔ کیونکہ مدیر کسٹم جناب سید ممدوح صرارہ (جو عقیدہ میں اخوان المسلمون کی مقامی شاخ کے صدر بھی ہیں) نے انہیں کہلا بھیجا تھا کہ جب ہم کسٹم پر پہنچیں، ہمیں آگے بڑھنے نہ دیا جائے، کیونکہ وہ اپنے احباب کی اچھی خاصی جمعیت کے ساتھ ہمارے استقبال کے لیے آنا چاہتے تھے۔ اس اثناء میں ہم لوگ عقبہ کے بندرگاہ کا جائزہ لیتے رہے۔ 1956ء میں جب ہم یہاں سے گزرے تھے تو یہ ایک معمولی بندرگاہ تھا اور اس میں کوئی گودی (Jetty) نہیں تھی اس لیے جو جہاز یہاں پہنچتے تھے، سمندر میں دور کھڑے ہوتے تھے اور سامان اور مسافر کشتیوں کے ذریعے کنارے تک پہنچائے جاتے تھے۔ جمہوریہ عربیہ کی حکومت نے اردن کے ساتھ جو معاہدہ کیا اور اپنی سرحدوں کو بند کیا۔ اس سے اردن والوں کو سخت زحمت ہوئی تھی اور نہیں باہر سے تمام سامان بیروت کے بندرگاہ سے لانا پڑتا تھا۔ لیکن اب کی مرتبہ ہم نے جو عقبہ کو دیکھا تو یہ ایک باقاعدہ اور شاندار بندرگاہ میں بدل چکا تھا۔ خود عقبہ شہر بھی پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ ترقی کر چکا تھا، اور اردن کا باہر کی دنیا سے سارا سامان اسی کے راستے سے آنا شروع ہو گیا تھا۔ عقبہ کے بالمقابل مغرب کی طرف ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ہمیں اسرائیل کا بندرگاہ ایلات بھی نظر آ رہا تھا۔ گزشتہ چند سالوں میں اس بندرگاہ نے بھی خوب ترقی کی ہے۔ دوربین سے ہم نے اسے دیکھا۔ بندرگاہ کے علاوہ ایک باقاعدہ شہر آباد ہو چکا ہے۔ پانچ چھ جہاز وہاں کھڑے تھے، جن میں سے ایک تباہ کن جہاز بھی تھا۔ چند سال پیشتر تک یہودی اس بندرگاہ کو استعمال نہ کر سکتے تھے، لیکن اب وہ اسے استعمال کر رہے ہیں۔

کسٹم والوں کے اصرار پر ہم نے آدھ گھنٹہ تک سید ممدوح صرارہ اور ان کے ساتھیوں کا انتظار کیا، لیکن پھر روانہ ہو گئے۔ ابھی چند فرلانگ چلے تھے کہ تین چار موٹروں میں سید ممدوح اور ان کے ساتھی بڑی تیزی سے چلے آ رہے تھے۔ مصافحے اور معانقے ہوئے اور پھر یہ لوگ ہمیں اپنی موٹروں میں بٹھا کر شہر لے گئے وہاں ایک مکان میں انہوں نے ہمارے قیام کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم اپنے پاسپورٹوں پر داخلہ کی مہر لگوائے بغیر اردن میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہاں سے انہوں نے ہمارے پاسپورٹ

بندرگاہ پر بھیج دیے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ مہر لگ کر واپس آ گئے۔

شروع میں ان حضرات کی تعداد پندرہ بیس کے قریب تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ تعداد بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اس نے اچھے خاصے اجتماع کی شکل اختیار کر لی۔ یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ یہ سب لوگ وہ تھے، جنہوں نے مولانا کی عربی کتابیں اپنے باقاعدہ تربیتی حلقوں میں پڑھ رکھی تھیں۔ اس سلسلہ میں اخوان المسلمون کے نگران (مراقب) استاذ محمد عبدالرحمان خلیفہ نے عمان سے ان کو بذریعہ ٹیلی فون باقاعدہ ہدایت دی تھی کہ مولانا کا استقبال کیا جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے۔ ہماری موجودگی میں بھی استاذ عبدالرحمان خلیفہ کا ٹیلی فون آیا اور انہوں نے مجھ سے گفتگو کر کے مولانا کی خیریت دریافت کی اور انہیں اپنا اور عمان کے دوسرے اخوان کا سلام پہنچایا اور آئندہ کا پروگرام معلوم کیا۔

عقبہ کے ان دوستوں نے مولانا سے سفر کے متعلق بھی معلومات حاصل کیں اور دوسرے علمی و دعوتی موضوعوں پر بھی سوالات کئے۔ دوپہر کے کھانے کا انہوں نے بڑے اہتمام سے وسیع انتظام کیا۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم کم از کم ایک دن اور ایک رات ان کے ہاں قیام کریں، لیکن جب ہم نے وقت کی کمی کا عذر پیش کیا تو آخر کار انہوں نے اسی روز ہمیں معان جانے کی اجازت دے دی۔

عصر کے قریب ہم عقبہ سے معان روانہ ہوئے، جو وہاں سے 120 کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ عقبہ کے ایک اخوانی رفیق بھی جن کا نام نصرت حسین تھا اور جو اصل میں فلسطینی مہاجر تھے۔ ہمارے ساتھ تھے۔ عقبہ سے معان تک پختہ سڑک اس وقت تک بن چکی تھی۔ 56ء میں جب ہم یہاں سے گزرے تھے، تو یہ سڑک ابھی کچی تھی۔ عقبہ شہر کے یکا یک ترقی کر جانے میں اس سڑک کے پختہ ہو جانے کا بھی بڑا دخل ہے۔ اب تو عقبہ اردن میں عمان اور بیت المقدس کے بعد غالباً سب سے بڑا شہر بن چکا ہے اور اس کی حیثیت وہی ہو گئی ہے، جو عراق میں بصرہ کی ہے۔

مغرب کی نماز ہم نے نقیب اشتر میں پڑھی، جو اس راستہ میں سب سے بلند جگہ ہے، اس لیے وہاں ہم نے سخت سردی محسوس کی۔ دمشق سے مدینہ منورہ تک جو حجاز ریلوے لائن

جاتی تھی، وہ یہاں تک اب بھی صحیح حالت میں موجود ہے اور دمشق سے یہاں تک اب بھی ریل آتی جاتی ہے۔

مَعَان

معان عمان کے جنوب میں 45 میل کے فاصلہ پر ایک متوسط درجہ کا شہر ہے اور یہاں سے تبوک کو بھی ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، موتہ اور دوسری جگہوں کے لیے صحابہ کرام غالباً اسی راستہ سے شام تشریف لائے تھے۔

عشا کے قریب ہم معان پہنچے۔ اخوان کی ایک بھاری جمعیت نے شہر سے کئی میل دور نکل کر اللہ اکبر وللہ الحمد کے نعروں سے ہمارا استقبال کیا۔ ان میں معان کے قاضی بھی شریک تھے۔ جو وہاں کے اخوان سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔

رات کو ان حضرات نے ہماری ضیافت اور مولانا سے استفادہ کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ معان ایک ایسا علاقہ ہے، جہاں کی تہذیب، زبان اور کھانوں کے انداز میں عراق، سعودی عرب اور شام تینوں کے اثرات قریب قریب برابر کی نسبت سے موجود ہیں۔ ایک رات کے قیام میں ہم نے یہ چیز خاص طور پر محسوس کی۔

وادیٔ موسیٰ

اگلی صبح (31 دسمبر) نماز اور ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم معان سے وادیٔ موسیٰ کے لیے روانہ ہوئے۔ جو وہاں سے 25 کلومیٹر (15 میل) کے فاصلہ پر جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ اس کے لیے پہلے 15 کلومیٹر تک ہمیں اسی سڑک پر واپس آنا پڑا، جس پر عقبہ سے معان پہنچے تھے۔ پھر دائیں طرف مڑ گئے اور چند میل چلنے کے بعد وادیٔ موسیٰ پہنچ گئے۔ یہ ساری سڑک اس وقت تک پختہ بن چکی تھی۔

وادیٔ موسیٰ ایک بہت ہی سرسبز و شاداب اور خوبصورت وادی ہے۔ جس میں ہر طرف پہاڑوں کی چوٹیوں اور ڈھلانوں پر رنگ برنگ کے پھول اور درخت نظر آتے ہیں۔ اس کے سجانے میں وہاں کے رہنے والوں کی محنت اور جفاکشی کا بھی بڑا دخل ہے۔

سعوی عرب کے مقابلے میں اردن کے باشندے زیادہ تندرست اور جفاکش ہیں۔ یہ ساری وادی ایک چشمہ سے سیراب ہوتی ہے، جس کو عین موسیٰ کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے آخری زمانہ میں اسی مقام پر آ کر ٹھہرے تھے۔ یہیں حضرت ہارون کا انتقال ہوا تھا اور اسی وادی کے قریب ایک پہاڑ پر انہیں دفن کیا گیا تھا۔ تورات میں اس پہاڑ کا نام جبلِ ہور بیان ہوا ہے اور اب اسے جبل ہارون کہتے ہیں، حضرت ہارون علیہ السلام کا مزار بھی موجود ہے اور وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے، مگر اس تک پہنچنے کا راستہ بہت دشوار گزار ہے۔ ہم نے ایک دوسرے پہاڑ پر چڑھ کر دوربین سے مزار کو دیکھا اور دور ہی سے حضرت ہارون علیہ السلام کی روح پاک کو سلام پہنچا دیا۔

بطرا

اسی وادیٔ موسیٰ میں بطرا (Patra) کا مشہور تاریخی مقام بھی واقع ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو سو سال قبل نبطیوں (جو عرب تھے) نے اپنا دارالحکومت قائم کیا تھا۔ یہ ویران شہر ہندوستان کے ایلورا اور اجنتا کی طرح پہاڑوں کے اندر تراش تراش کر بنایا گیا ہے۔ گزشتہ صدی کے آغاز تک کسی کو پتہ نہیں تھا کہ پہاڑوں کے پیچھے کوئی شہر دفن ہو کر رہ گیا ہے۔ گزشتہ صدی کے وسط میں یہ دریافت ہوا اور اس کی کھدائی کی گئی۔ اس وقت سے اب تک امریکہ، یورپ اور دنیا کے تمام دوسرے علاقوں کے سیاح اسے دیکھنے کے لیے خاص طور پر اردن آتے ہیں۔ ہمارے مقصد سفر سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن اس میں پہاڑوں کے درمیان تراشے ہوئے مکانات کی وجہ سے بعض مستشرقین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مدائن صالح کے آثار قوم ثمود کے آثار نہیں ہیں بلکہ نبطیوں ہی کے آثار ہیں اور یہ کہ قرآن نے انہیں جو قوم ثمود کے آثار قرار دیا ہے غلط قرار دیا ہے۔ عرب عیسائیوں نے بھی اس دعویٰ کو عام کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ المنجد (حصہ انسائیکلو پیڈیا) میں مدائن صالح کے آثار کو نبطیوں ہی کے آثار ظاہر کیا گیا ہے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ بطرا کے آثار کس حد تک مدائن صالح کے آثار سے مماثلت یا اختلاف رکھتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ آیا مستشرقین اپنے اس دعویٰ میں صرف غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں یا اس سے ان کا

پیٹرا الخزانہ

مدین۔ پہاڑوں میں تراشے ہوئے مکانات

مقصد جانتے بوجھتے قرآن کے دعویٰ کی تکذیب کرنا ہے، چنانچہ ہم نے تین چار گھنٹے پیدل چل کر بطرا کو دیکھنے میں صرف کیے۔ اگرچہ وہاں سیاحوں کے لیے کرایہ کے گھوڑے بھی مہیا کیے جاتے ہیں، لیکن وہاں کی غیر ہموار زمین پر پیدل چلنا گھوڑے پر سوار ہو کر چلنے سے زیادہ آسان ہے۔

یہ شہر تین چار میل لمبا ہے، اور چوڑائی بعض جگہوں پر دس پندرہ گز ہو جاتی ہے لیکن اکثر جگہوں پر چند فٹ سے زیادہ نہیں ہے بلکہ بعض جگہوں پر تو دو تین فٹ رہ جاتی ہے۔ درمیان میں ایک وسیع میدان بھی آتا ہے کہیں سفید اور کہیں سرخ پہاڑوں کو تراش کر نہایت عمدہ مکان بنائے گئے ہیں۔ اور بعض مکان اتنے شاندار ہیں کہ دیکھنے پر بھی یقین نہیں آتا کہ یہ آج سے سوا دو ہزار سال قبل کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں نبطیوں کا دربار لگا کرتا تھا اور ایک دوسری جگہ نہایت شاندار قسم کا ہال بنا ہوا ہے، جس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے کئی کمرے ہیں اس کے سامنے سرخ رنگ کے بلند ستون اس عمدگی سے تراشے گئے ہیں کہ خوبصورتی اور صفائی میں موجودہ زمانے کی کسی شاندار عمارت سے کم نہیں ہیں۔ مدائن صالح میں بھی قوم ثمود نے پہاڑوں کو تراش کر مکانات بنا رکھے تھے۔ مگر بطرا کی تراش وخوبصورتی کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بعض باتوں میں مماثلت ضرور پائی جاتی ہے۔ مگر اس سے یہ دعویٰ ثابت نہیں ہو جاتا کہ مدائن صالح کے مکانات بھی نبطیوں ہی نے پہاڑوں کو تراش کر بنائے تھے۔ نبطی یوں بھی مدائن صالح کے علاقہ میں بہت بعد میں گئے۔ پھر بطرا میں سنگ تراشی کے فن کو ترقی دے لینے کے بعد وہ اسے وہاں محض ابتدائی حالت میں کیوں رکھتے؟ یہ بات بعید از قیاس ہے۔

بطرا سے فارغ ہونے کے بعد ڈھائی بجے کے قریب ہم اس سڑک پر روانہ ہوئے، جو وہاں سے الطفیلہ، المزار اور الکرک ہوتی ہوئی عمان جاتی ہے اور اس سڑک کے تقریباً متوازی واقع ہے جو معان سے عمان جاتی ہے۔ اس وقت یہ سڑک زیر تعمیر تھی۔ اب شاید مکمل ہو گئی ہو۔ اس کے مکمل ہو جانے کے بعد لوگوں کو عمان سے براہِ راست عقبہ جانے میں بڑی آسانی ہو گئی ہو گی۔

بطرا سے روانہ ہوتے ہی ہمیں پھر کچے راستہ پر چلنا پڑا اور اس نے ہمیں اپنا پچھلا سفر یاد دلا دیا۔ مغرب کے بعد ہم الطفیلہ سے گزر رہے تھے کہ وہاں اخوان کی ایک بھاری جمعیت نے ہمیں روک لیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک ہمیں موٹر سے اتار کر پندرہ بیس منٹ تک چائے وغیرہ سے ہماری تواضع نہ کر لی۔ عشاء کے قریب ہم المزار پہنچے، جس کے قریب سڑک ہی کے کنارے موتہ کا وہ میدان واقع ہے جہاں مسلمانوں اور رومی فوجوں کے درمیان پہلی جنگ ہوئی تھی اور جہاں حضرت زید بن حارثہؓ، جعفر طیارؓ اور دوسرے اکابر صحابہ کرامؓ شہید ہوئے تھے۔ المزار میں الکرک کے اخوان، جن میں وہاں کے ڈپٹی کمشنر، قاضی، علماء تجار اور دوسرے معزز شہری سب شامل تھے۔ ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے اور سردی کے باوجود ہمارے وہاں پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی اللہ اکبر وللہ الحمد کا نعرہ لگا کر ہمارا شاندار استقبال کیا۔ پہلے ہمیں گاڑی سے اتار کر ایک جگہ چائے وغیرہ کا اہتمام کیا اور پانچ چھ گاڑیوں کے ساتھ جلوس کی صورت میں الکرک کی طرف روانہ ہوئے، جس کا فاصلہ وہاں سے 8-9 میل ہے۔

الکرک

الکرک اوسط آبادی کا ایک خوبصورت شہر ہے۔ ہمارے قیام کا انتظام ان حضرات نے وہاں کے رئیس التجار (جن کا تعلق اخوان سے ہے) کے ہاں کیا تھا۔

قوم لُوط کا علاقہ

اگلے دن (یکم جنوری 1960ء) علی الصبح ہم بحرمیت کے مشرقی ساحل پر اس جگہ پہنچے، جسے اللسان کہا جاتا ہے۔ اسی کے قریب جنوب کی طرف بحرمیت کا وہ حصہ واقع ہے، جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں سدوم اور قوم لوط کے دوسرے شہر غرق ہوئے تھے۔ اور اسی لیے بحرمیت کے اس حصہ کو بحرِ لوط کہا جاتا ہے۔ بحرمیت کے گرد و پیش پورے علاقہ کو دیکھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں زبردست عذاب نے زمین کو جگہ جگہ سے شق کر دیا ہے۔ اور جگہ جگہ زمین دھنس گئی ہے اب کچھ عرصہ سے اردن کی حکومت بعض مغربی

ماہرین کے ذریعہ سدوم کے شہراوران کے آثار کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

موتہ

یہاں کے فوٹو لینے کے بعد ہم موتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ جو جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، المزار سے دو تین میل کے فاصلہ پر جنوب کی طرف برلبِ سڑک واقع ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے اور ایک بہت سی بلند سطح مرتفع پر واقع ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا قصبہ موتہ ہی کے نام سے موجود ہے۔ اس قصبہ سے متصل ایک وسیع میدان ہے جس میں رومیوں اور صحابہ کرام کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ اسی میدان کے ایک حصہ کا نام الشہداء یا مشہد ہے، جس کے متعلق قصبہ کے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ جنگ میں شہید ہونے والے بہت سے صحابہ کرامؓ یہاں مدفون ہیں۔ غزوۂ موتہ کے موقع پر صحابہ کرام کی لشکر گاہ اس جگہ تھی، جہاں اب المزار کا شہر آباد ہے۔ یہاں حضرت جعفر طیارؓ، عبداللہ بن رواحہؓ، زید بن حارثؓ اور بہت سے دوسرے صحابہ کرامؓ کی قبریں موجود ہیں۔ اور ان ہی کی وجہ سے المزار کا شہر آباد ہوا اور اسے المزار (زیارت گاہ) کا نام دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ موتہ کے موقع پر جو بزرگ شہید ہوئے، ان میں سے جن جن کو صحابہ کرامؓ اٹھا کر لا سکتے تھے ان کو انہوں نے مقامِ جنگ سے پیچھے لے جا کر اپنی لشکر گاہ میں دفن کیا اور باقی شہدا کو میدانِ جنگ ہی میں چھوڑ کر انہیں پسپا ہونا پڑا۔ حضرت جعفرؓ، عبداللہ بن رواحہؓ اور زید بن حارثؓ کے مزارات پر ہم حاضر ہوئے۔ حضرت جعفرؓ کے مزار پر ایک صاف ستھری اور عمدہ مسجد بنی ہوئی ہے اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور زید بن حارثؓ کے مقبرے اس سے قریب ہی واقع ہیں۔

موتہ کا میدانِ جنگ دیکھنے سے ہم پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری ہوئی۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے تو انتہائی شدید سردی تھی اور ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی مگر ہم اپنے دلوں میں ایمان کی ایسی گرمی محسوس کر رہے تھے، جس کو بیان کرنا چاہیں تو بیان نہیں کر سکتے۔ ان صحابہ کرام کی زندگی پر رشک آ رہا تھا جنہوں نے اس میدان میں اپنی جان دے کر شہادت کا حق ادا کر دیا۔ رضی اللہ عنہم وارضاھم۔

عمان

اس روز جمعہ تھا، جمعہ کی نماز ہم نے الکرک واپس آ کر ادا کی اور اس کے بعد عمان کے لیے روانہ ہو گئے۔ جس کا فاصلہ وہاں سے 84 کلومیٹر ہے۔ راستہ میں رات سے بارش شروع ہو چکی تھی اور دن میں بھی بارش ہوئی۔ کبھی ہلکی اور کبھی زیادہ۔ جوں جوں ہم عمان کی طرف بڑھتے رہے۔ بارش اور زیادہ ہوتی جا رہی تھی، لیکن اس بارش اور سخت سردی کے باوجود استاذ محمد عبدالرحمان خلیفہ اور ان کے ساتھ تیس چالیس اخوانی رفقاء عمان سے تقریباً بارہ میل باہر ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ بارش ہی میں مصافحے اور معانقے ہوئے۔ تعارف کی ضرورت نہیں تھی یہ سب لوگ ہمیں اور ہم انکو پہلے سے جانتے تھے۔ استاذ محمد عبدالرحمان خلیفہ تو دمشق کے موتمر عالم اسلامی (56ء) ہی میں شریک ہوئے تھے۔ موتمر کے بعد جب ہم عمان آئے تھے، تو بہت سے اخوانی رفقاء سے مسلسل ملاقاتیں اور مجلسیں رہی تھیں۔

عمان میں ان حضرات نے ہمارے قیام کا انتظام فندق بالاس (پیلس ہوٹل) میں کیا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور اخوانی نوجوان موٹر سے ہمارا سامان اتار کر ہوٹل پہنچا رہے تھے۔ سامان لگانے اور تھوڑی دیر آرام کر لینے کے بعد ہم نے گاڑی کے ڈرائیور عیاد کو کرایہ کی ادائیگی کی اور 200 ریال مزید بطور انعام دیے۔ اپنے "رہنما" عبدان کو بھی انعام دیا۔ یہ دونوں اگلے دن معان کے راستے تبوک روانہ ہو گئے۔ ان کے ذریعے ہم نے امیر تبوک، شیخ صالح بن محمد تویجری، مدینہ منورہ کے امیر اور انسپکٹر جنرل پولیس کے نام خیریت اور شکریہ کے خطوط بھی روانہ کیے۔

اگلے دن (2 جنوری) 2 بجے کے قریب استاذ محمد عبدالرحمان خلیفہ کے ہاں مولانا کے اعزاز میں کھانے کی دعوت تھی۔ جس میں عمان کے تمام مشہور علمی، ادبی، سیاسی حضرات شریک تھے۔ استاذ کامل شریف (جو ان دنوں موتمر عالم اسلامی کے نائب سیکرٹری تھے اور آج کل نائیجریا میں اردن کے سفیر ہیں) بھی بیت المقدس سے خاص طور پر مولانا سے ملاقات کے لیے آ گئے تھے۔ دوسری جگہوں کے اخوان بھی موجود تھے، الغرض اچھا خاصا

مزار سیدنا حضرت جعفر طیارؓ

مزار حضرت عبداللہ بن رواحہؓ
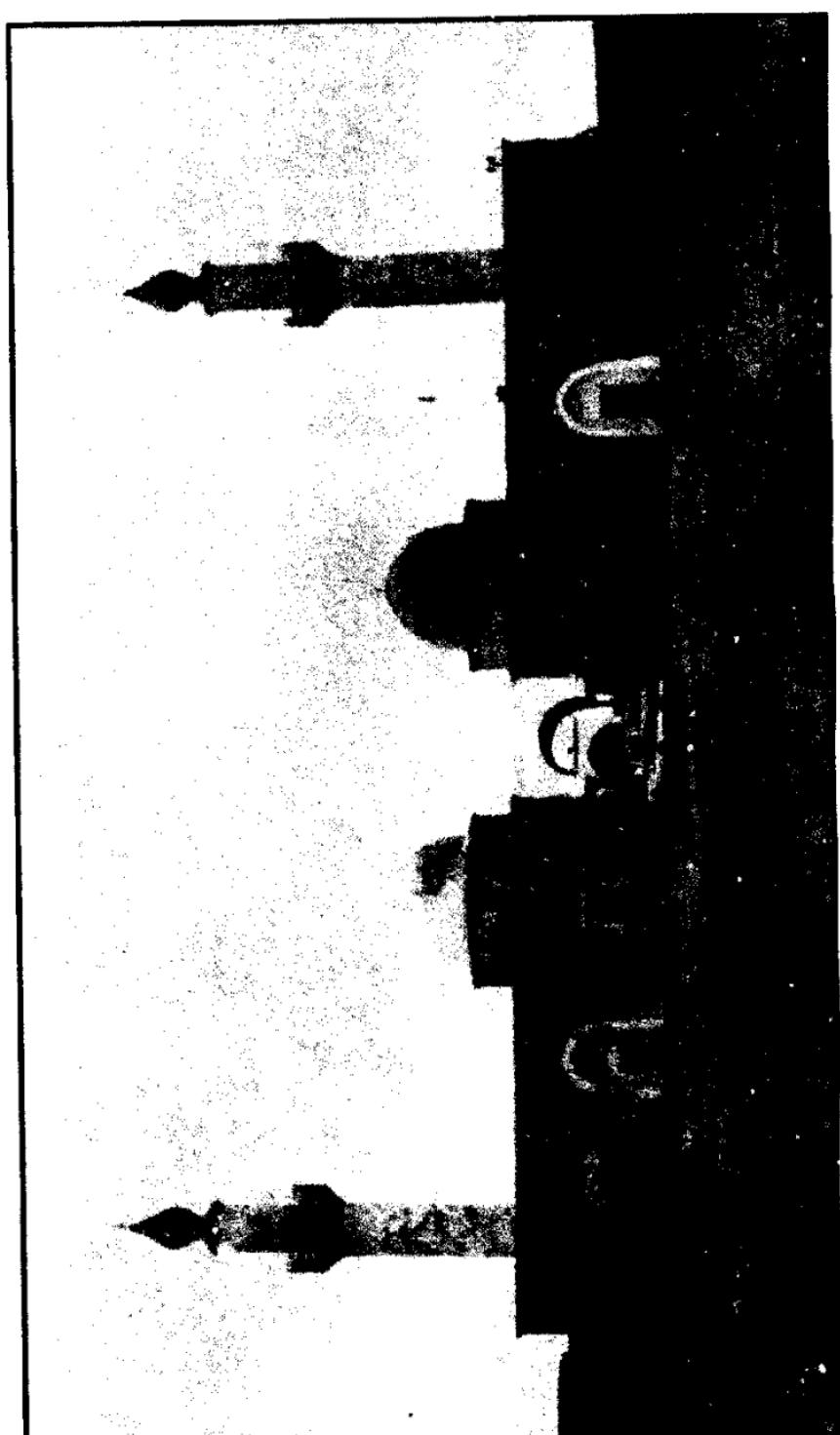
مزار حضرت زید بن حارثؓ

پیٹرا۔ سیدنا ہارون علیہ السلام کا مزار پہاڑ کی چوٹی پر
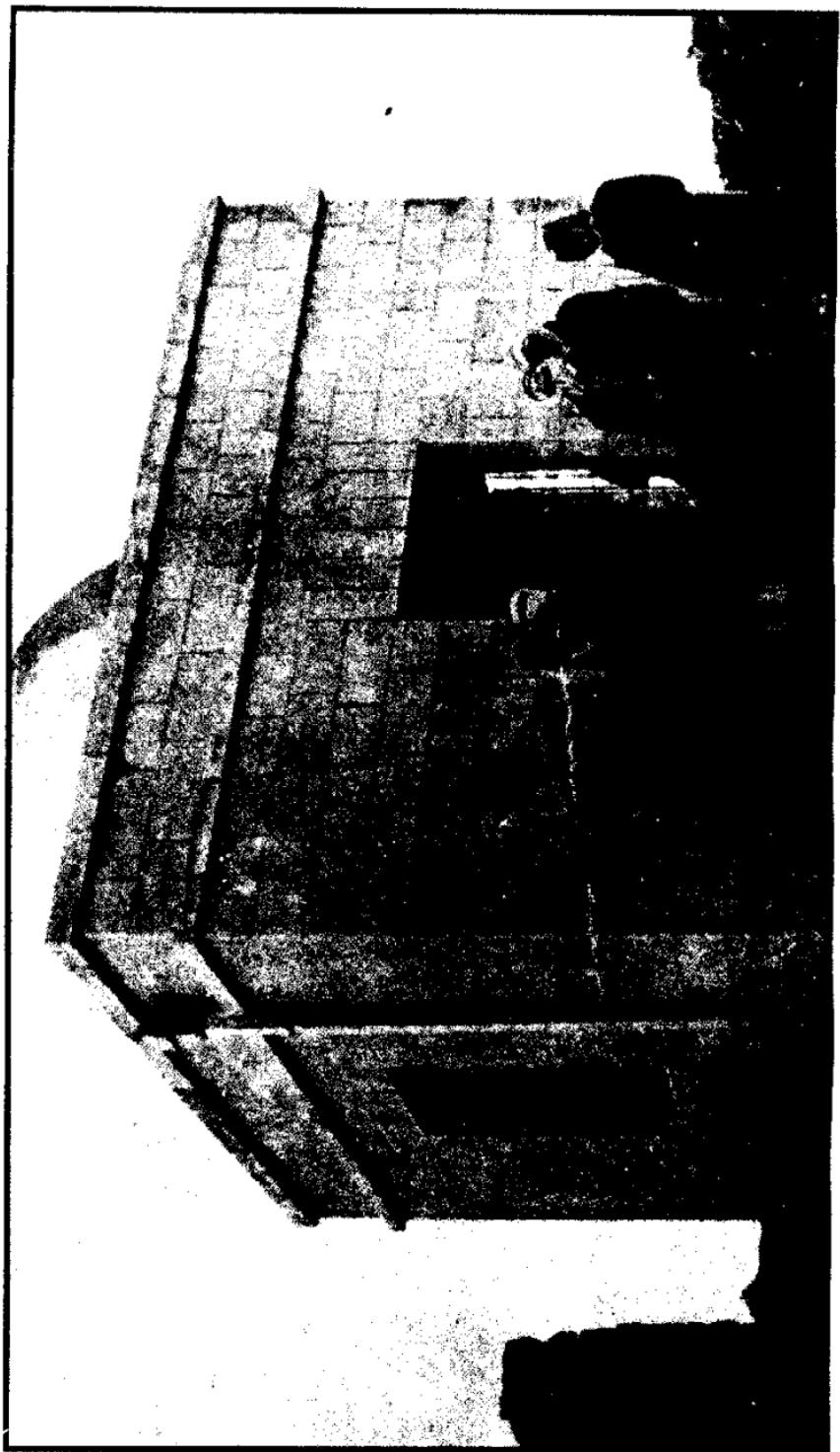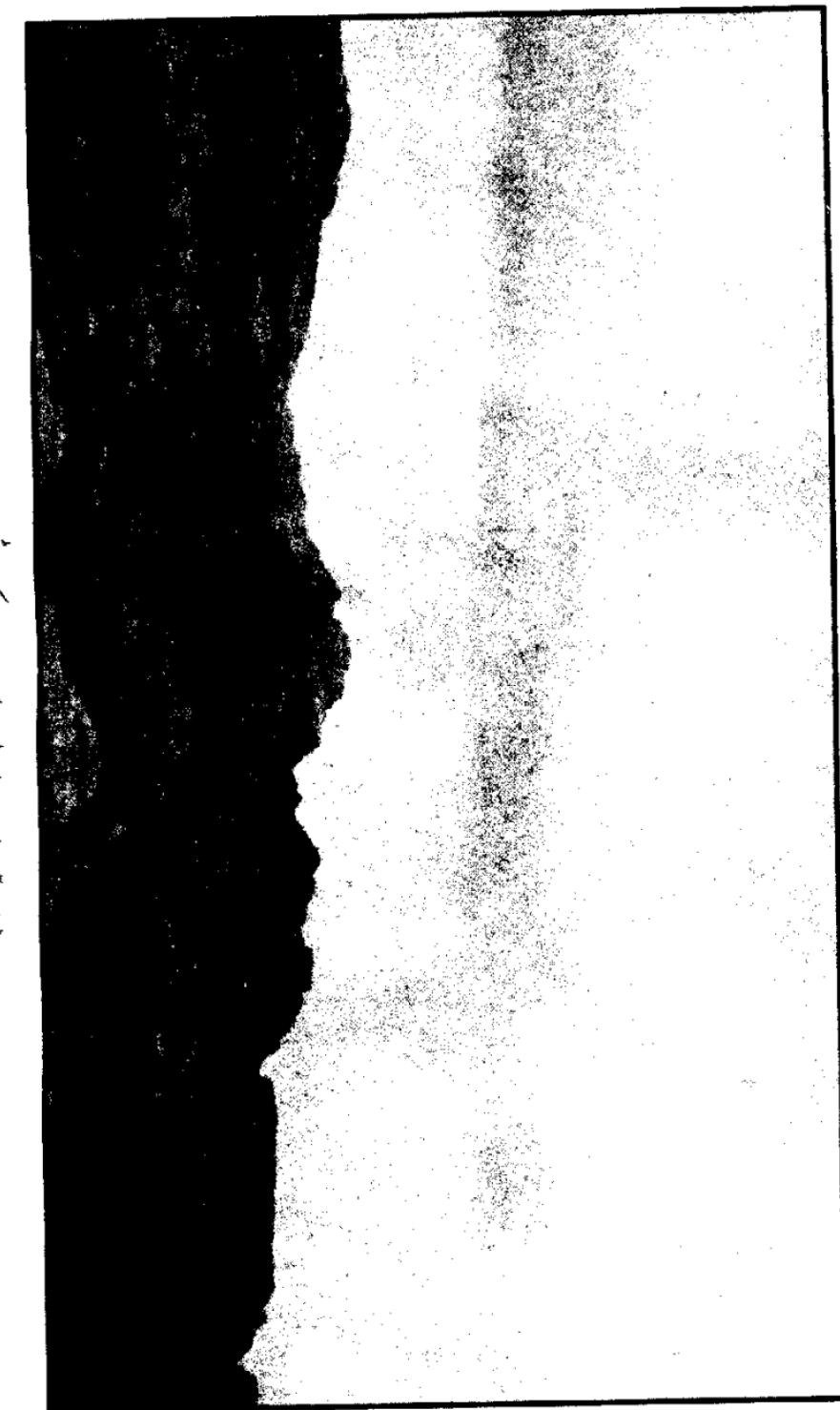
جشن تھا۔ سفر کی غرض و غایت اور روداد کے علاوہ دعوت اسلامی کے موضوع پر خصوصیت سے گفتگو ہوتی رہی۔

4 بجے کے قریب ہم ہوٹل واپس آئے۔ کیونکہ صبح ہی عمان ریڈیو کے ایک نمائندے نے آ کر مولانا سے ساڑھے چار بجے شام کا وقت انٹرویو کے لیے طے کر لیا تھا۔ وقت مقررہ پر وہ پہنچ گئے، اور انہوں نے سوال و جواب کی شکل میں مولانا سے مندرجہ ذیل انٹرویو لیا۔

ریڈیو عمان کے لیے انٹرویو

سوال: اس سفر سے جسے آپ ان دنوں کر رہے ہیں، آپ کے پیشِ نظر کیا مقصد ہے؟

جواب: اس سفر سے میرا مقصد انبیاء علیہم السلام کے آثار اور ان تاریخی مقامات کو دیکھنا اور سمجھنا ہے جن کا ذکر قرآن پاک یا سیرت کی کتابوں میں ہوا ہے۔ میں ان دنوں تفہیم القرآن کے نام سے قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھ رہا ہوں۔ اس تفسیر کی تیاری کے دوران میں مَیں نے یہ محسوس کیا کہ قرآن کے بہت سے مقامات کو آدمی اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک ان علاقوں اور مقامات کو دیکھ نہ لے جن کا ذکر قرآن پاک میں ہوا ہے، اس وجہ سے مَیں نے یہ سفر کیا ہے اور اس سلسلہ میں مکہ، طائف، بدر، مدینہ، مدائن صالح، خیبر، تبوک اور مغایر شعیب کو دیکھتا آ رہا ہوں۔ اب یہاں سے بیت المقدس اور الخلیل جاؤں گا، وہاں سے واپس آ کر میرا ارادہ دمشق اور قاہرہ جانے کا ہے، تاکہ وہاں سے جزیرہ نما سینا جا سکوں۔

سوال: آپ کی یہ تفسیر کس زبان میں ہے؟

جواب: میں یہ تفسیر اردو زبان میں لکھ رہا ہوں، لیکن میرا پختہ ارادہ ہے کہ اس کا عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ شائع کیا جائے۔ اب تک عربی میں صرف اس کے ایک حصہ، تفسیر سورۂ نور کا ترجمہ ہوا ہے اور وہ ان دنوں زیرِ طبع ہے۔[1]

1- اور اب یہ شائع ہو چکا ہے۔ (م۔ع)

سوال: عربی زبان میں آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

جواب: عربی زبان میں اب تک میری بیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے الحجاب، الربا، مبادی الاسلام اور اسس الاقتصاد بین الاسلام والنظم المعاصرہ حال ہی میں دمشق سے شائع ہو چکی ہیں۔

سوال: کیا موتمر اسلامی کے ایک رکن کی حیثیت سے آپ ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا نتائج ہیں جو موتمر نے پاکستان میں انجام دیے ہیں؟

جواب: پاکستان میں اس کے نتائج یہ نکلے ہیں کہ پاکستان کے لوگ فلسطین کے مسئلہ میں زندہ شعور رکھتے ہیں اور اس کو عربوں ہی کا نہیں بلکہ اپنا مسئلہ بھی سمجھتے ہیں۔

سوال: اسرائیل کے یہودی ان دنوں دریائے اردن کا رخ بدلنے کی سازش کر رہے ہیں۔ آپ کا اس صریح زیادتی کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: میرے اور ہر پاکستانی کے نزدیک بھی یہ اسی طرح صریح زیادتی ہے، جس طرح بلادِ عرب کا ہر شخص اسے زیادتی تصور کر رہا ہے، میں فلسطین میں اسرائیل کے وجود ہی کو عدوان سمجھتا ہوں، کجا کہ میرے نزدیک دریائے اردن کے ایک قطرہ پر بھی اس کا حق ہو۔

سوال: کیا آپ پاکستان کے عرب ممالک سے تعلقات پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟

جواب: میرے پاس اس بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں، کیونکہ ان معلومات کا تعلق حکومتوں سے ہے، البتہ میں پاکستان کے عام باشندوں کے متعلق یہ واضح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ وطن، زبان یا رنگ کی بنیاد پر قومیت کے قائل نہیں ہیں، ان میں وطنی قومیت کا تصور کبھی پیدا نہیں ہو سکا ہے، اور وہ مراکش سے انڈونیشیا تک سارے عالمِ اسلامی کو ایک دارالاسلام اور دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو ایک برادری سمجھتے ہیں۔ اور کسی مسلمان ملک کے رویہ میں اگر وہ اس کے خلاف تبدیلی محسوس کرتے ہیں، تو انہیں سخت اذیت ہوتی ہے۔ کاش عالم اسلامی کے دوسرے ممالک میں بھی یہی تصور کار فرما ہوتا۔

سوال: اردن میں آپ دوسری مرتبہ تشریف لا رہے ہیں۔ وہ ایسی کون سی بات ہے جو اس

مرتبہ آپ نے یہاں محسوس کی ہے؟

جواب: میں نے اس مرتبہ اردن میں ہر جگہ عمرانی اور مادی ترقی کے اثرات محسوس کیے ہیں، خصوصاً نئی سڑکیں، جو بن گئی ہیں یا بن رہی ہیں۔ ان سے نہ صرف اردن کے باشندوں کو بہت آرام پہنچا ہے، بلکہ بیرونی سیاحوں کو تاریخی مقامات تک جانے اور انہیں دیکھنے میں بہت آسانی ہوگئی ہے۔

سوال: کیا پاکستان کی جماعت اسلامی کا عرب ممالک کی کسی جماعت سے تعلق ہے؟ اور ہے تو کس نوعیت کا؟

جواب: جماعت اسلامی ان دنوں پاکستان میں موجود نہیں ہے، کیونکہ موجودہ مارشل لاء کے بعد وہاں کی تمام سیاسی پارٹیاں ختم کر دی گئی ہیں، اس لیے میرے لیے آپ کے اس سوال کا کوئی جواب دینا ممکن نہیں ہے۔

ریڈیو کے اس نمائندہ نے مولانا کا یہ سارا انٹرویو ٹیپ ریکارڈ کیا اور اگلے روز (3 جنوری) اسے عمان ریڈیو سے بھی نشر کیا اور بعض اخبارات میں بھی شائع کرا دیا۔

مغرب کے بعد مولانا سے ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں عام اخوانی نوجوانوں کے علاوہ عمان کے بہت سے علماء و ادباء بھی شامل تھے۔ یہ لوگ پاکستان کے علاوہ کشمیر اور ہندوستان کے مسلمانوں کا حال نہایت دلچسپی بلکہ بے چینی سے دریافت کرتے اور سنتے رہے۔ کشمیر کے مسئلہ سے تو یہ کسی نہ کسی حد تک واقفیت رکھتے تھے، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کا جو حال ہے اس سے بالکل ناواقف تھے۔ مولانا نے ڈیڑھ دو گھنٹے کی گفتگو میں جب انہیں اصل حقائق سے آگاہ کیا، تو یہ لوگ حیران رہ گئے اور ان میں سے بھی بہت سوں نے پاکستان کی طرف سے قلۃ الدعایۃ (پراپیگنڈا کی کمی) کا شکوہ کیا۔ اخوانی نوجوان دعوت اور اس کے طریق کار کے موضوع پر بھی سوالات کرتے رہے۔

اس وقت عرب ممالک میں اردن ہی ایک ایسی جگہ ہے، جہاں اخوان المسلمون کھل کر پوری جرأت سے کام کر رہے ہیں اور عمان کے علاوہ اردن کے تمام چھوٹے اور بڑے شہروں میں ان کے باقاعدہ دفاتر قائم ہیں۔ جفاکشی، اخلاص اور باہمی محبت یوں تو تمام اخوان کا مشترک سرمایہ ہے، لیکن اردن کے اخوان اس بارے میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں، یہ ہے کہ ان کے مراقب (رہنما) استاذ محمد عبدالرحمان خلیفہ خود ایک جفاکش اور انتہائی مخلص آدمی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو لیڈر سے زیادہ کارکن سمجھتے ہیں اور کارکنوں ہی کی طرح اسلام اور دعوتِ اسلامی کے لیے ان تھک کوشش کرتے ہیں۔

شاہ حسین سے ملاقات اور شاہی مہمانی

9-10 بجے کے قریب اردن کے قاضی القضاۃ اور وزیر تعلیم شیخ محمد امین الشنقیطی مولانا سے ملاقات کے لیے ہوٹل تشریف لائے اور شاہ حسین کی طرف سے ملاقات کا دعوت نامہ دے گئے۔ ایک بجے کے قریب ہم شاہ سے ملاقات کے لیے ان کے قصر گئے۔ استاذ محمد عبدالرحمان خلیفہ بھی ساتھ تھے۔ ملاقات مختصر رہی۔ اس میں شاہ نے خوش آمدید اور رسمی گفتگو کے علاوہ پاکستان اور اسلام کے متعلق اپنے قلبی لگاؤ اور انتہائی گہرے جذبات کا اظہار کیا۔ مولانا نے اپنی عربی کتابوں کا ایک مکمل سیٹ شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

اس ملاقات سے پہلے غالباً شاہ حسین کو مولانا کے عمان پہنچنے کی اطلاع نہ ہو سکی تھی، چنانچہ اس کے بعد انہوں نے حکم دیا کہ ہمیں شاہی مہمان کی حیثیت سے عمان میں ٹھہرایا جائے۔ ہم اپنی مرضی سے ہوٹل ہی میں ٹھیرے رہے، ہمارے قیام و طعام کے تمام مصارف سرکاری طور پر ادا کیے گئے۔

القدس کی طرف

4 جنوری کی صبح ہم القدس (بیت المقدس) کے لیے روانہ ہوئے۔ استاذ محمد عبدالرحمان خلیفہ بھی ساتھ تھے۔ راستے میں السلط کے مقام پر دو ڈھائی سو کے ایک مجمع نے ہمیں روک لیا اور بے حد محبت اور عقیدت کے ساتھ استقبال کیا۔ موٹر سے اتر کر ایک جلوس کی سی شکل میں ہم کو شہر کے اندر لے گئے اور ایک ہال میں انہوں نے جلسے کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ ان لوگوں کا اصرار تھا کہ ہم ایک پورا دن وہاں ٹھیریں۔ بڑی مشکل سے وہ ہماری معذرت قبول کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ انہوں نے مولانا سے نصیحت کی

درخواست کی۔ مولانا نے چند جملوں میں نوجوانوں کو تقویٰ اور اسلام پر قائم رہنے کی نصیحت فرمائی جس کو پورے مجمع نے بہت ہی اہتمام اور غور سے سنا۔

وادیٔ شعیبؑ

السلط سے آگے بڑھنے کے بعد ہم وادیٔ شعیبؑ سے گزرے، جو ایک سرسبز و شاداب وادی ہے اور چشموں کا پانی اس میں نہر کی طرح بہتا ہے۔ اسی وادی میں ایک اونچے مقام پر حضرت شعیبؑ کا مقبرہ تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت شعیبؑ واقعی وہاں مدفون ہیں، لیکن اس علاقہ میں عام روایت قدیم زمانہ سے یہی چلی آ رہی ہے کہ قومِ شعیب پر عذاب آنے کے بعد حضرت شعیبؑ یہیں تشریف لے آئے تھے۔ یہ چیز کچھ زیادہ بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ کیونکہ مدین جس علاقہ کا نام ہے وہ بہت وسیع علاقہ تھا اور موجودہ اردن سے بالکل متصل واقع تھا، بلکہ اس کا شمالی حصہ تو اس وقت اردن کی مملکت میں شامل ہے، خود عقبہ بھی اس کا ایک اہم مرکزی مقام تھا۔ ہم نے موٹر سے اتر کر مقام سیدنا شعیب کا فوٹو لیا اور آگے روانہ ہو گئے۔

دریائے اردن اور غور کا علاقہ

وادیٔ شعیب سے آگے بڑھ کر پہاڑوں کی ڈھلان شروع ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ جگہ آ جاتی ہے، جہاں دریائے اردن بحر میت میں آ کر شامل ہوتا ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے 1300 فٹ نیچے ہے اور اسی لیے اسے غور کہا جاتا ہے۔ یہ اردن میں سب سے زیادہ سرسبز جگہ شمار کی جاتی ہے۔ جب ہم عمان سے روانہ ہوئے تھے تو سخت سردی تھی اور ہم نے سردی کے تمام کپڑے پہن رکھے تھے۔ لیکن جب اس جگہ پہنچے، تو ہمیں اپنے کوٹ اتار کر موٹر میں رکھنا پڑے۔ گزشتہ سفر (1956ء) میں جب ہم یہاں سے گزرے تھے، تو گرمی کا موسم تھا۔ عمان اور بیت المقدس میں بہت ہلکی گرمی بلکہ کسی حد تک خنکی تھی، لیکن یہاں پہنچ کر ہمیں سخت گرمی محسوس ہوئی تھی۔

دریائے اردن کو یوں تو دریا کہا جاتا ہے اور واقعی وہ اس علاقہ میں سب سے بڑا دریا

ہے، لیکن ہمارے ہاں کی اوسط درجہ کی نہریں بھی اس سے زیادہ چوڑی ہوتی ہیں۔ یہ ایک عجیب وغریب دریا ہے، جو شمال میں شام کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے پھر ایک جھیل حولہ میں داخل ہوکر آگے چلتا ہے۔ پھر ایک دوسری جھیل طبریہ میں گرتا ہے، لیکن وہاں سے پھر نکلتا ہے یہاں تک کہ بحر میت پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ راستے میں دریائے یرموک، زرقاء اور بعض دوسرے دریا (جو دراصل پہاڑی ندیاں ہیں) اس میں آ کر شامل ہوتے ہیں۔ بحر میت میں پانی کا جو اضافہ ہوتا ہے، وہ صرف اسی ایک دریا سے ہوتا ہے اور وہ بھی صرف اتنا کہ اس کا جو پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے، اس کی تلافی ہوتی رہتی ہے۔ بحر میت میں اس کے سوا نہ کوئی دوسرا دریا آ کر شامل ہوتا ہے اور نہ یہ خود کسی دریا سے ملتا ہے۔ بالکل جھیل کی قسم کا سمندر ہے، جس میں معدنیات کی کثرت ہے، اور اسی لیے اس کا پانی کافی بھاری ہے کہتے ہیں کہ اس میں اگر کوئی شخص گر جائے تو ڈوب نہیں سکتا۔

1948ء تک دریائے اردن کے مشرقی حصہ کو شرقِ اردن اور مغربی حصہ کو فلسطین کہا جاتا تھا۔ لیکن اب عملاً فلسطین کے نام سے کوئی خطۂ زمین نقشہ پر موجود نہیں ہے۔ 1948ء میں انگریزوں نے فلسطین کو اس طرح تقسیم کیا کہ اس کا مغربی حصہ (جو بحر روم کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے اور نہایت ہی سرسبز اور قدرتی مناظر سے بھرا ہوا ہے) یہودیوں کے حوالے کیا اور مشرق کی طرف کا کچھ حصہ عربوں کے لیے رہنے دیا۔ 1949ء میں شاہ عبداللہ (موجودہ شاہ حسین کے دادا جو 46ء میں امیر تھے اور بعد میں شاہ بن گئے تھے) نے اس علاقہ کو باقاعدہ اپنی مملکت میں شامل کرلیا اور اسی کی وجہ سے انہوں نے اپنی مملکت کو شرقِ اردن کے بجائے المملکۃ الاردنیہ الہاشمیہ کا نام دیا۔ اور ان کے نقشے میں اب اسے فلسطین کے نام سے نہیں بلکہ الضفۃ الغربیہ (دریائے اردن کا مغربی علاقہ) کے نام سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ فلسطین کا کچھ حصہ علاقہ (غزہ) جزیرہ نما سینا سے متصل ہے، مصر کے قبضہ میں بھی ہے[1]۔

1۔ جون 67ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد فلسطین کا سارا علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔
انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

اریحا

دریائے اردن پار کرنے کے بعد ہم فلسطین (یا ضفّۂ غربیہ) میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلا شہر جو اس کے بعد ہمارے راستہ میں آیا وہ اریحا تھا۔ یہ ایک بہت ہی قدیم شہر ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی یہ اسی طرح آباد تھا۔ غور کے علاقہ میں ہونے کی وجہ سے یہ نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ اس میں ہر طرف مختلف پھلوں کے باغ نظر آتے ہیں۔ وہاں کی دکانوں پر ہمیں پپیتا بھی نظر آیا۔ حالانکہ اس کے متعلق ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اس علاقہ میں نہیں پایا جا سکتا۔

اخوان المسلمون کا مدرسہ

اریحا کے قریب ہی فلسطینی مہاجرین کا ایک وسیع کیمپ ہے جو 56ء میں (جب کہ ہم یہاں سے گزرے تھے) بہت زیادہ آباد تھا اور سارے کا سارا کپڑوں کے خیموں پر مشتمل تھا، لیکن اب کی مرتبہ اس کی آبادی بھی ہمیں کم نظر آئی اور اس میں مہاجرین نے اپنے رہنے کے لیے خیموں کی بجائے کچی جھونپڑیاں تعمیر کر لی تھیں۔ اسی کیمپ کے ساتھ وہ مدرسہ ہے جو اخوان المسلمون نے فلسطین کے شہدا کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے قائم کیا۔ یہ مدرسہ اخوان کے اہم تعمیری کاموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ اس میں بچوں کو نہ صرف عمدہ اسلامی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ مجاہدوں کی حیثیت سے ان کی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ ہم ایک گھنٹہ کے لیے اس مدرسہ میں رکے۔ ایک بچے نے جہاد کے موضوع پر ایک جوشیلی نظم ہمیں پڑھ کر سنائی۔ بعض دوسرے بچوں نے بندوق سے نشانہ کا کمال دکھایا۔ ہم نے 25 پونڈ کا عطیہ مدرسہ کے لیے دیا۔ ایسے ہی موقعے ہوتے ہیں جہاں پہنچ کر ہم جیسا ایک پاکستانی مسافر ایکسچینج کی کمی کا رونا روتا ہے۔ ہمیں ایکسچینج کی آسانی ہوتی، تو یقیناً اس مدرسے کے لیے ایک بڑی رقم بطور اعانت دیتے۔ لیکن اب تو 25 پونڈ کی معمولی رقم دیتے ہوئے بھی تردد پیدا ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ دل میں شرمندہ بھی ہو رہے تھے کہ مدرسہ کے مہتمم ہم پاکستانیوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔

اخوان المسلمون کا تربیتی کیمپ

مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم بحرمیت کے کنارے ایک کیمپ دیکھنے گئے، جہاں چالیس پچاس اخوانی نوجوان اردن اور فلسطین کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ وقتاً فوقتاً تین چار دن کے لیے کسی جگہ تربیتی کیمپ لگایا کرتے ہیں۔ جس میں عبادت اور جہاد کی تربیت ایک توازن کے ساتھ دی جاتی ہے اور چند روز بالکل مجاہدانہ زندگی بسر کرنے کے بعد یہ نوجوان اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے کیمپوں میں مملکت اردن کے ہر حصہ کے نوجوان آ کر شریک ہوتے رہتے ہیں۔ اس کیمپ میں ان لوگوں نے اللہ اکبر وللہ الحمد کا نعرہ لگاتے ہوئے نہایت محبت اور گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے ان کی زندگی کا وہاں جو نقشہ دیکھا، اس سے ہم اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کے گرنے کو نہ روک سکے۔ کہاں یہ تعلیم یافتہ قسم کے نوجوان اور کہاں یہ لق و دق میدان، جس میں رات کی سردی سے بچنے کے لیے ایک بھی عمارت نظر نہ آ رہی تھی۔ کھلے میدان ہی میں ایک خاص تربیت اور نظام کے ساتھ انہوں نے اپنے سونے کی جگہ بنا رکھی تھی اور ایک دوسری جگہ کو نماز اور درس و تربیت کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ ایک اونچے بانس پر اخوان المسلمون کا جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا، جس پر قرآن پاک اور دو تلواروں کا نقشہ دیکھنے والے کے دل میں ایک خاص کیفیت اور ولولہ پیدا کر رہا تھا۔ ظہر کی نماز ہم نے یہیں ادا کی۔ نماز کے بعد مولانا نے ان نوجوانوں سے چند کلمات نصیحت و دعا فرمائے۔ اور اس کے بعد ہم قدس روانہ ہو گئے۔ استاذ محمد عبدالرحمان خلیفہ جو اب تک ہمارے ساتھ تھے یہیں رک گئے۔

القدس میں مؤتمر اسلامی کا عصرانہ

تین بجے کے قریب ہم القدس پہنچے۔ استاذ کامل شریف اور مؤتمر اسلامی کے دوسرے کارکن ہمارا شدت سے انتظار کر رہے تھے بلکہ تاخیر سے پہنچنے پر سخت ناراض تھے۔ معلوم ہوا کہ 4 بجے مولانا کے اعزاز میں ایک عصرانہ فندق الزہراء میں دیا جانے والا ہے۔

اس عصرانہ کا سلسلہ 4 بجے شروع ہوا اور 6 بجے تک جاری رہا۔ اس میں القدس کے کمشنر، رئیس البلدیہ، (میئر) قاضی، علماء، فوجی، کمانڈر اور حکومت کے تمام ذمہ دار حضرات شریک تھے۔ القدس کے علاوہ الخلیل، نابلس اور دوسرے قریبی مقامات سے بھی لوگ خاص طور پر اس عصرانہ میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ سب سے پہلے استاذ کامل شریف نے مولانا کا خیر مقدم کیا اور پھر مولانا نے اس کا جواب دیتے ہوئے فلسطین اور عربوں کے دوسرے مسائل سے متعلق پاکستانی قوم کے جذبات اور ہمدردی کا اظہار کیا جس کا تمام سامعین پر بہت اچھا اثر پڑا۔

اہل القدس کی دینی واخلاقی حالت

مغرب اور عشاء کی نمازیں ہم نے حرم (مسجد اقصیٰ) میں ادا کیں۔ اس روز اور بعد کے دنوں میں بھی ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت اور دکھ ہوا کہ مسجد میں نمازیوں کی تعداد کم تھی۔ اتنی تعداد تو ہمارے ہاں کی عام مسجدوں میں بھی ہو جاتی ہے، گویا بیت المقدس کے رہنے والوں کو نہ مسجد اقصیٰ کی اہمیت وفضیلت کا پتہ ہے اور نہ سروں پر بیٹھے ہوئے یہودیوں کا خطرہ ہی ان کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کرتا ہے. بعض نوجوان اور تندرست قسم کے لوگوں کو ہم نے یہاں تک دیکھا کہ عین مسجد کے صحن میں بیٹھے اپنی گپوں میں مست ہیں، حالانکہ مسجد کے اندر جماعت ہو رہی ہے۔ شاید اسی نافرمانی کی سزا دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر یہودیوں کا خطرہ مسلط کیا ہے۔ خود اپنے ساتھ رہنے والے عیسائیوں کے مقابلے میں بھی یہ پستی اور ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جن لوگوں نے بیت المقدس کو دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ شہر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس کا بڑا اور جدید حصہ (جس میں مسجد اقصیٰ اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے دوسرے مقدس آثار آ گئے ہیں) عربوں کے قبضہ میں ہے اور وہ تین طرف سے یہودی علاقہ سے گھرا ہوا ہے۔ دونوں کے درمیان خط متارکہ (No Man Land) ہے جو [illegible] جگہوں سے پچاس ساٹھ گز تک چوڑا ہے، لیکن اکثر جگہوں پر اس کی چوڑائی بیس تیس گز سے زیادہ نہیں ہے اور اس لیے آئے دن یہاں کے یہودیوں اور عربوں کے درمیان گولیاں چلتی رہتی ہیں۔ عیسائی جو عرب

علاقہ میں مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہیں، اپنی دولت اور مغربی حکومتوں کی پشت پناہی کی وجہ سے بیت المقدس کی اکثر زمینوں اور عمارتوں پر قبضہ کرتے جا رہے ہیں اور ان کی یہ طے شدہ سکیم ہے کہ آہستہ آہستہ بیت المقدس کو ایک خالص عیسائی علاقہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس وقت بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے علاوہ مسلمانوں کی دو چار مسجدیں ہوں تو ہوں لیکن عیسائیوں کے بارہ گرجے قائم ہیں اور دن رات اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ بیت المقدس کے مسلمان یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں بلکہ باہر سے آنے والوں کو بیان بھی کرتے ہیں۔ مگر ان کے دین و اخلاق کا حال وہ ہے، جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی حالت پر رحم فرمائے۔

ایک رات القدس میں ٹھیرنے کے بعد ہم لوگ 5 جنوری کو بیت لحم اور الخلیل دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ الخلیل سے ایک اخوانی دوست مصطفیٰ عبدالنبی خاص طور پر ہمیں لینے کے لیے القدس پہنچ گئے تھے۔

بیت لحم

بیت لحم، القدس کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر ایک اہم تاریخی مقام ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے، اب اسی مقام پر جہاں ان کی پیدائش ہوئی تھی ایک بہت عظیم الشان گرجا بنا ہوا ہے، جسے کنیسۃ المہد کہتے ہیں اور عیسائی دنیا کے ہر حصے سے لوگ اس کی زیارت کے لیے اس طرح آتے ہیں جس طرح مسلمان حج و زیارت کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جاتے ہیں۔ ہم نے اس گرجا میں جا کر اس غار کو دیکھا، جس کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس غار سے بالکل متصل ایک کونے میں ایک پتھر نصب ہے جس میں ایک گول سوراخ ہے ہمیں بتایا گیا کہ اس جگہ وہ کھجور کا درخت تھا، جس کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے کہ فرشتے نے حضرت مریم سے کہا کہ اس کھجور کے تنے کو ہلاؤ، تو تمھارے اوپر پکی کھجوریں گریں گی۔ ہمیں حیرت تھی کہ اس سرد علاقے میں کھجور کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کہیں کہیں کھجور کے درخت اب بھی موجود ہیں اور الخلیل پہنچ کر عملاً کھجور کے درخت دیکھ کر ہمیں

اطمینان ہو گیا۔ اس گرجا میں عیسائیوں نے شرک کو اس کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ جس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بتائی جاتی ہے وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک بچے کی شکل میں بت بنا کر رکھا ہوا ہے اور اس کے قریب ایک پنگوڑہ بنا کر ایک بچے کا بت اس میں رکھ چھوڑا ہے۔ ہمارے ساتھ جو عیسائی گائیڈ یہ مقام دکھانے گیا تھا اس نے ہمارے سامنے ان دونوں بتوں کو سجدہ کیا۔

اس گرجا میں عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے حصے الگ الگ ہیں اور پروٹسٹنٹ فرقے کو بالکل اچھوت بنا کر گرجا کے باہر صرف ایک صحن دیا گیا ہے، جس کے اندر وہ سال بھر میں ایک مرتبہ عبادت کر سکتے ہیں۔

الخلیل

بیت لحم کی زیارت سے فارغ ہونے کے بعد ہم الخلیل آئے، جس کا فاصلہ القدس سے 22,20 میل ہے۔ اس شہر کا قدیم نام جرون ہے اور چار ہزار سال پہلے جب حضرت ابراہیمؑ یہاں آئے تھے تو اس وقت بھی یہ شہر آباد تھا۔ یہ دنیا کے ان چند قدیم ترین شہروں میں سے ہے جو ہزاروں برس سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ وہاں ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ کے مقابر کی زیارت کی۔ انبیاء علیہم السلام کی جو قبریں بالکل ثابت ہیں ان میں سے ایک یہ مقبرہ ہے۔ اصل قبریں ایک غار کے اندر ہیں جس کے اندر جانے کے تین راستے ہیں اور تینوں بند ہیں۔ غار کے اوپر ایک بہت عالیشان عمارت بنی ہوئی ہے جس کے ایک حصہ میں مسجد بالکل غار کے اوپر واقع ہے۔ اس غار میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت سارہ، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کی قبریں بتائی جاتی ہیں۔ اصل قبریں تو غار کے اندر ہیں اور انہیں دیکھنا ممکن نہیں ہے لیکن اوپر مسجد کے اندر قبروں ہی کی شکل میں ان کے نشانات بنے ہوئے ہیں، جن سے مقصود اصل قبروں کی نشان دہی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کی قبر تو ثابت ہے، باقی قبروں کے بارے میں اطمینان کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بھی صحیح ہیں۔

مقام سیدنا لوطؑ

ہم نے ظہر کی نماز اسی مسجد میں ادا کی اور اس کے بعد مصطفیٰ عبدالنبی کے ہاں کھانا کھا کر حضرت لوط علیہ السلام کا مقام دیکھنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہ مقام الخلیل سے جنوب مشرق کی طرف بحرلوط کے قریب واقع ہے۔ یہاں ایک پہاڑی پر حضرت لوط علیہ السلام کی قبر ہے اوراس پر مسجد بنی ہوئی ہے۔ اب اس مقام کو بنی نعیم کہا جاتا ہے۔ اس علاقہ کے لوگوں میں یہ روایت قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے کہ قومِ لوط کی تباہی کے بعد حضرت ممدوح یہیں چلے آئے تھے۔ یہ چیز بالکل قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ پہاڑی سے بحرِ لوط بالکل سامنے نظر آتا ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب حضرت لوطؑ اس علاقہ سے نکلے ہوں گے تو انہوں نے اسی طرف کا رخ کیا ہوگا کیونکہ ان کے چچا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے قریب ہی الخلیل میں رہتے تھے۔

بی۔ بی۔ سی کے لیے انٹرویو

الخلیل سے مغرب کے بعد القدس واپس پہنچے۔ اسی رات بی۔ بی۔ سی کا نمائندہ برائے اردن ہمارے ہوٹل میں آیا اور اس نے مولانا سے عربی زبان میں مندرجہ ذیل انٹرویو ریکارڈ کیا اور اسے بی۔ بی۔ سی نے لندن سے اپنے عربی پروگرام میں ایک ہفتہ کے بعد نشر کیا۔

سوال: آپ کی اردن میں تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟

جواب: اس سیاحت سے میرا مقصد انبیاء علیہم السلام کے آثار اور ان اقوام کے آثار کو بچشم خود دیکھنا ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ میں آج کل قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھ رہا ہوں۔ اس تفسیر کی تیاری کے دوران میں مَیں نے محسوس کیا کہ قرآن کے بہت سے مقامات کو آدمی اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک ان علاقوں اور مقامات کو دیکھ نہ لے، جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے، اس وجہ سے مَیں نے یہ سفر کیا ہے اور اس سلسلہ میں مکہ، طائف، بدر، مدینہ، مدائن صالح، خیبر، تبوک اور مغاير شعیب کو دیکھتا ہوا آرہا ہوں۔ اور اب اردن و فلسطین کے آثار دیکھنے کے بعد

جزیرہ نما سینا جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

سوال: ہم پاکستان کی جماعت اسلامی کے متعلق اکثر سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں کیا اس کے متعلق آپ ہمیں کچھ معلومات دے سکتے ہیں؟

جواب: جماعت اسلامی موجودہ انقلاب کے زمانہ میں پاکستان میں موجود نہیں ہے۔ یہ جماعت اب سے 19 سال پہلے اس مقصد کے لیے قائم ہوئی تھی کہ اسلام کو ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے عملاً قائم کیا جائے اور وہ اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ صرف کتابوں کے اوراق پر نہیں بلکہ عملی زندگی کے میدان میں کارفرما ہو۔ اب اسی مقصد کے لیے میں اپنی ذاتی حیثیت سے کام کر رہا ہوں اور امید ہے کہ دوسرے لوگ بھی اسی طرح فرداً فرداً کام کر رہے ہوں گے۔

سوال: عربی زبان میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ کیا آپ ان کے متعلق ہمیں کچھ بتا سکتے ہیں؟

جواب: عربی زبان میں اب تک میری 20 سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں الحجاب، الربا، مبادی الاسلام اور اسس الاقتصاد بین الاسلام والنظم المعاصرہ حال ہی میں شائع ہوئی ہیں اور آج کل سورۂ نور (کی تفسیر) زیر طبع ہے۔

سوال: عرب اور دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے مسائل میں آپ کس حد تک دلچسپی رکھتے ہیں۔ خصوصاً مسئلہ فلسطین کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے؟

جواب: قضایا العرب اور قضایا المسلمین میرے نزدیک الگ الگ نہیں ہیں۔ ہم ان سب کو تمام عالم اسلامی کے مشترک قضایا سمجھتے ہیں خواہ وہ بلادِ عرب کے قضایا ہوں یا پاکستان کے یا انڈونیشیا کے یا کسی اور ملک کے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق فلسطین کا قضیہ بھی صرف عربوں کا قضیہ نہیں بلکہ تمام عالمِ اسلام کا قضیہ ہے۔ اسے عربوں کا قضیہ قرار دینا اسے کمزور کرنا ہے۔

سوال: آپ کے ہاں پاکستان میں عربی زبان کس قدر رفتار سے پھیل رہی ہے؟

جواب: عربی زبان قرآن اور سنت کی زبان ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں مسلمان اس کی تعلیم پر ہمیشہ بہت زور دیتے رہے ہیں۔ ملک بھر میں ہزاروں مدارس ایسے موجود ہیں، جن میں عربی زبان، تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں یونیورسٹیوں اور ہائی سکولوں میں عربی زبان کی تعلیم کا انتظام روز بروز زیادہ وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔

بیت المقدس کے آثار

اگلا پورا دن ہم نے بیت المقدس کے آثار دیکھنے میں گزارا۔ آغاز مسجد صخرہ اور مسجد اقصیٰ کے تفصیلی مطالعہ سے کیا گیا۔ اس میں القدس کے مدیر الاوقاف جناب حسن ابوالوفاء نے ہماری بڑی مدد کی اور ایک انجینئر کو جو آج کل مسجد صخرہ کے انچارج ہیں ہمارے ساتھ کر دیا، جنھوں نے پوری تفصیل کیساتھ ہمیں مسجد صخرہ دکھائی۔ ان انجینئر صاحب کے کہنے کے مطابق مسجد صخرہ کی یہ مرمت کئی برس جاری رہے گی اور اس کے کل مصارف کا تخمینہ 5 لاکھ پونڈ (70 لاکھ روپیہ) ہے پھر مسجد اقصیٰ ہم نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گائیڈ جناب فرید الامام کی مدد سے دیکھی۔ اس کے بعد ہم وہ مقام دیکھنے کے لیے گئے، جہاں حضرت عیسیٰ پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس جگہ عیسائیوں نے ایک عظیم الشان کنیسہ بنا رکھا ہے۔ اس کنیسہ کے اندر وہ حصہ جہاں پونتس پیلاطس کی عدالت تھی، اب ایک تہہ خانہ کی شکل میں واقع ہے اور اس کے پتھر وہی چلے آ رہے ہیں جو رومن عہد میں تھے۔ اس جگہ کو دیکھنے کے بعد ہم اس راستہ میں چلے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عدالت سے سزائے موت کا حکم پانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب اپنے کندھے پر رکھ کر اس مقام کی طرف گئے تھے جو صلیب دینے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، بتایا جاتا ہے کہ اس راستہ میں بارہ مقامات پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھک کر دم لینے کے لیے ٹھہرے تھے۔ ان تمام مقامات پر عیسائیوں کے عقیدے کے مختلف فرقوں نے کنیسہ بنا رکھے ہیں۔ اس راستہ پر چلتے ہوئے ہم کنیسۃ القیامہ گئے، جہاں عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دی
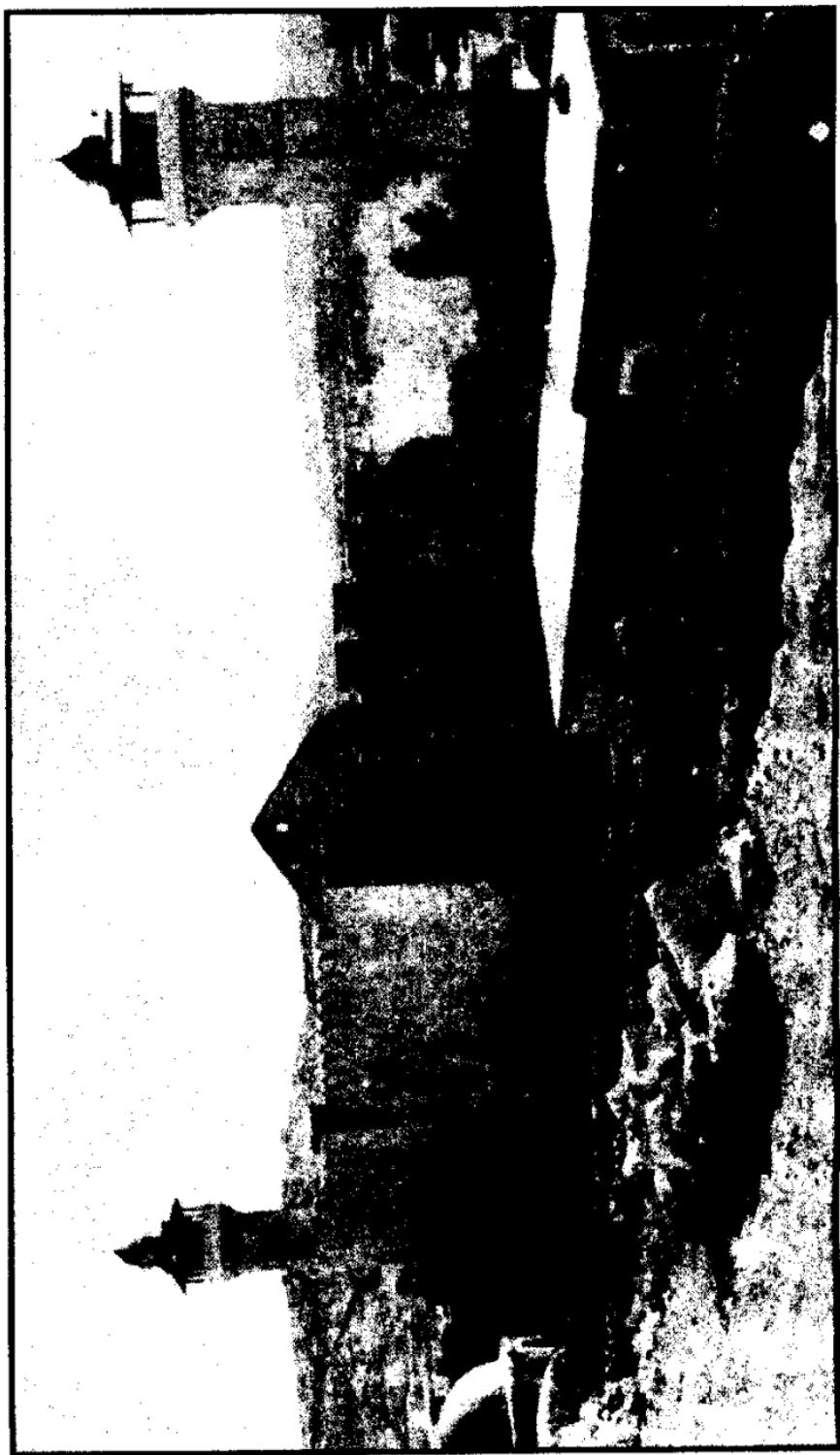
مسجد الخلیل - بیرونی منظر

مقام سیدنا حضرت لُوط علیہ السلام (الخلیل سے تقریباً ٦ میل بحیرہ لوط کی جانب) اس جگہ سے بحیرہ لوط نظر آتا ہے۔

بیت المقدس ۔ مسجد اقصیٰ

قبۃ صخرا۔ بیت المقدس
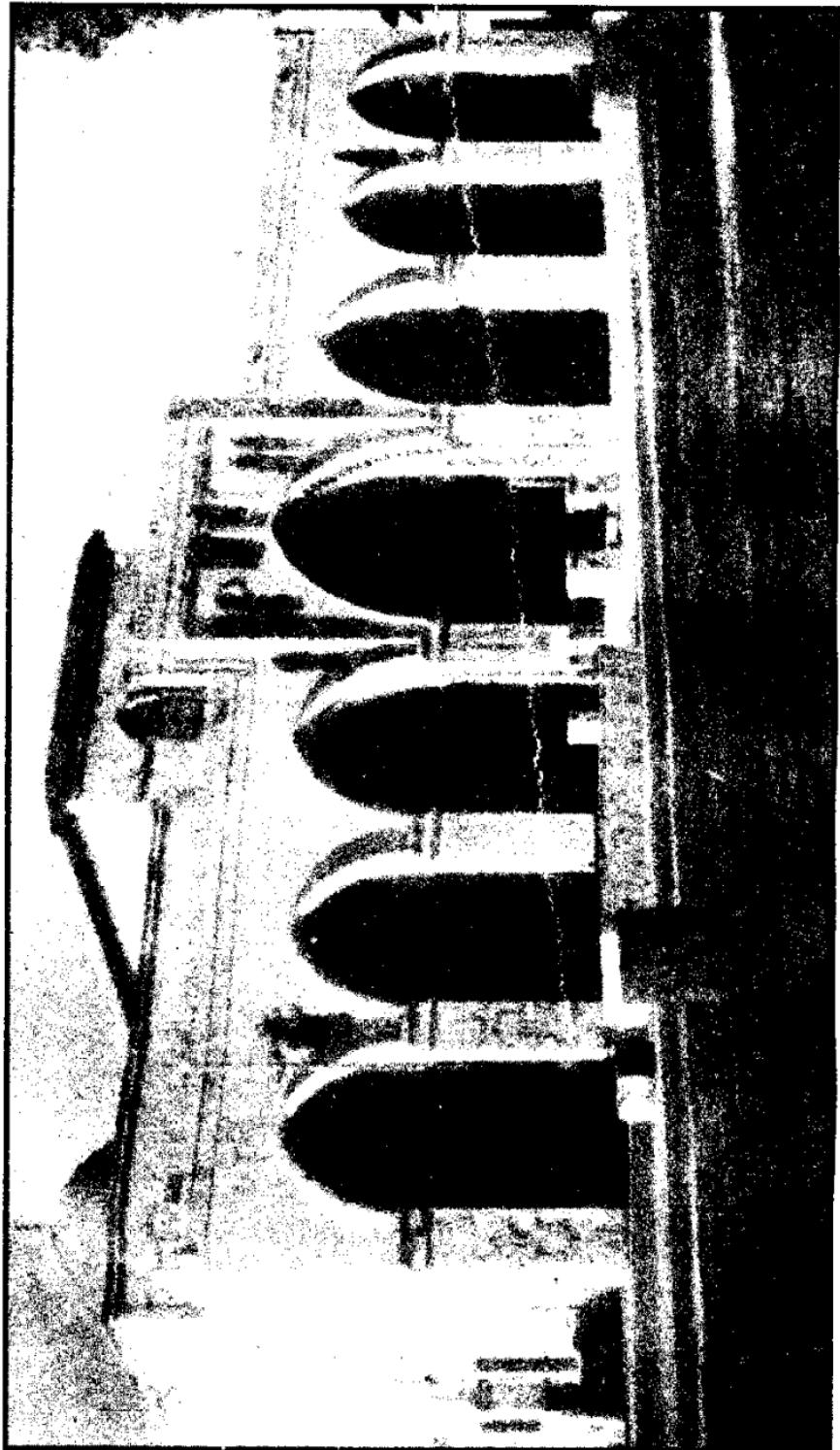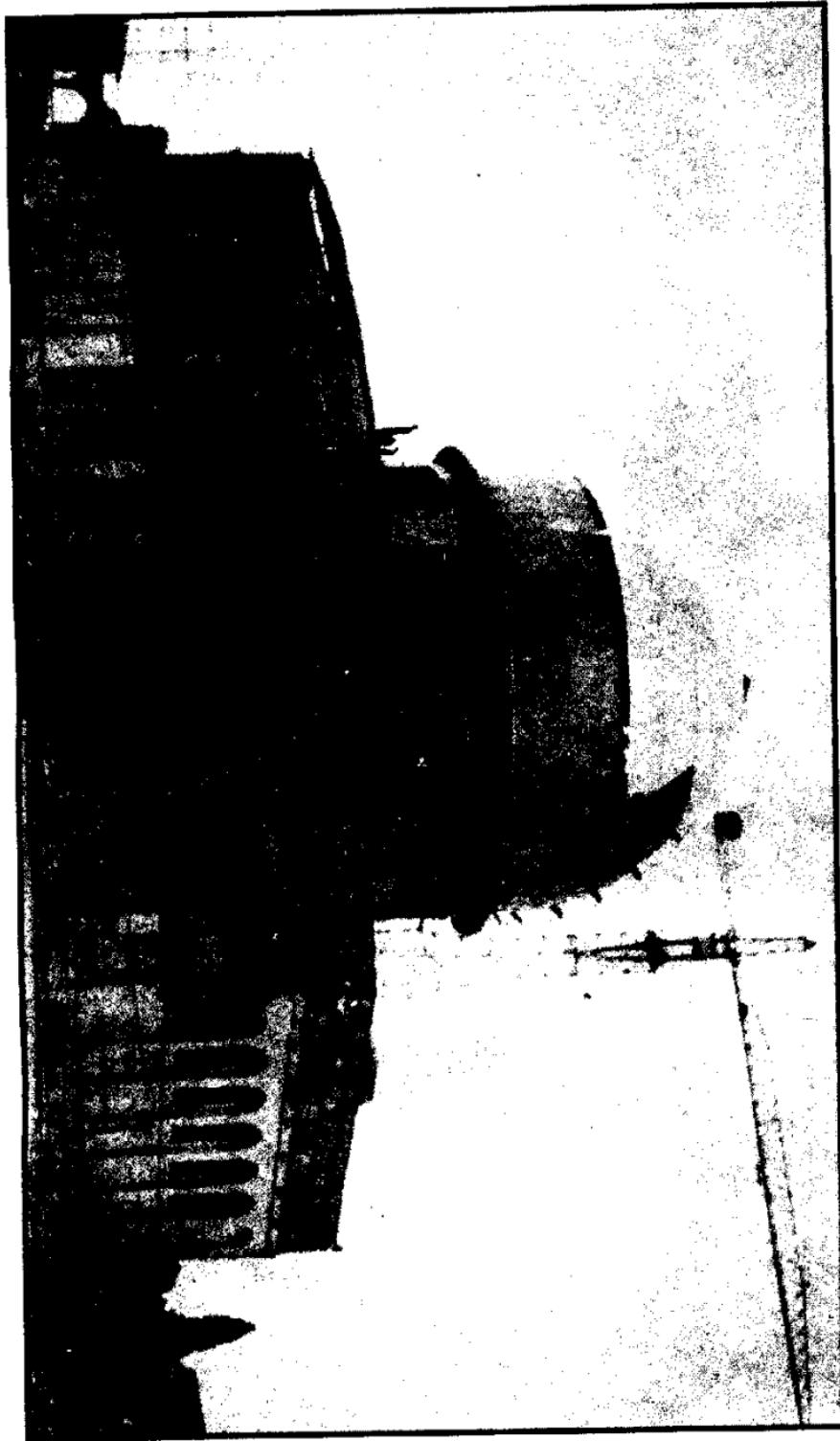
گئی اور دفن کیا گیا اور ہمارے عقیدے کے مطابق جہاں شُبِّہَ لَھُم کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچا لئے گئے اور کسی اور شخص کو ان کے شبہ میں سولی دے دی گئی۔ یہاں ایک بہت ہی عالیشان کنیسہ بنا ہوا ہے، جسے عیسائی دنیا کے قبلہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کنیسہ میں بھی عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے مختلف حصے ہیں، جن میں وہ الگ الگ عبادت کرتے ہیں۔ اس سے بالکل متصل وہ مسجد واقع ہے جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح بیت المقدس کے موقع پر نماز پڑھی تھی۔ آج تک عیسائی اس بات کے معترف ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب فتح کے بعد اس کنیسہ میں تشریف لائے تھے اور نماز کا وقت ہو گیا تھا، تو پادریوں نے ان سے کہا تھا کہ آپ یہیں نماز پڑھ لیں، مگر انہوں نے یہ کہہ کر نماز وہاں پڑھنے سے انکار کر دیا کہ اگر میں یہاں ایک مرتبہ نماز پڑھ لوں گا تو ممکن ہے کسی وقت مسلمان اس کنیسہ کو مسجد بنانے کی کوشش کریں۔ اس لیے آپ نے کنیسہ سے باہر نکل کر اس مقام پر نماز ادا فرمائی جہاں اب مسجد عمرؓ بنی ہوئی ہے۔ اس احسان کا بدلہ جیسا کچھ صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں عیسائیوں نے ادا کیا اور اب فلسطین میں امریکہ اور انگریزوں کی طرف سے ادا کیا جا رہا ہے وہ سب کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس کنیسہ کے سلسلے میں ایک بات یہ قابلِ ذکر ہے کہ اس کے دروازے کی کنجی قدیم زمانہ سے آج تک ایک مسلمان خاندان کی تحویل میں چلی آ رہی ہے، کیونکہ عیسائیوں کے مختلف فرقے آپس میں اس بات پر اتفاق نہیں کر سکے کہ اس کنیسہ کی کلید برداری کا شرف ان میں سے کس فرقہ کو حاصل ہو۔ آخر کار انہوں نے ازخود اس بات پر اتفاق کیا کہ ایک مسلمان اس کا کلید بردار ہو۔ یہ کلید برداری کا منصب ایک ہی خاندان میں وراثتاً چلا آ رہا ہے اور پورے انصاف کے ساتھ یہ خاندان تمام فرقوں کے لیے کنیسہ کا دروازہ کھولتا اور بند کرتا ہے اور اس پر گواہی لیتا ہے کہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی ہے۔

فلسطین کا میوزیم

بیت المقدس وہ شہر ہے جس کی ایک ایک اینٹ اپنی تاریخ رکھتی ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم اس کے آثار دیکھ سکتے۔ ہمارا پورا دن صرف انہی آثار کو دیکھنے میں

صرف ہو گیا۔ جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

7 جنوری کا آدھا دن ہم نے متحف فلسطین (فلسطین کا میوزیم) دیکھنے میں صرف کیا جس میں اس سرزمین کی قدیم ترین تاریخ سے لے کر آج تک کے آثار جمع کیے گئے ہیں۔ اسی کے ایک حصہ میں وہ قدیم نوشتے جمع ہیں، جو 1947ء میں بحیرۂ لوط کے قریب خربت قمران کے مقام پر دریافت ہوئے ہیں۔ یہ نوشتے پہلی صدی قبل مسیح اور اس کے بعد کے لکھے ہوئے ہیں اور عیسائی دنیا میں اس کے دریافت ہونے کے بعد سے ایک ہلچل برپا ہے۔ ماہرین کی ایک پوری ٹیم ان کا مطالعہ کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں لگی ہوئی ہے اور ساتھ ساتھ عیسائی دنیا کو یہ پریشانی بھی لاحق ہے کہ کہیں ان میں سے وہ مواد فراہم نہ ہو جائے جو موجودہ عیسائیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دے۔

عمان واپسی

اسی روز ہم عمان کے لیے واپس روانہ ہو گئے اور شام کو وہاں پہنچ گئے۔ واپسی میں جس راستہ سے ہم آئے۔ یہ وہ راستہ ہے جسے حال ہی میں اردن کی حکومت نے فلسطین کے دوسرے شہروں کو عمان سے براہ راست ملانے کے لیے بنایا ہے۔ اس کے بن جانے کے بعد، جہاں عمان کی اہمیت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے، بیت المقدس کی اہمیت پہلے سے کم ہو گئی ہے۔ یہودی ریاست قائم ہونے سے پہلے اس علاقہ میں بیت المقدس کو جو اہمیت حاصل تھی، وہ دمشق اور بیروت کے بعد غالباً تمام شہروں سے زیادہ تھی۔ یہاں ریلوے اسٹیشن بھی تھا اور یہاں سے ایک طرف دمشق کو اور دوسری طرف قاہرہ کو براہِ راست گاڑیاں جاتی تھیں۔ ریل کے علاوہ سڑک کا بھی نظام تھا، یہودی ریاست قائم ہونے کے بعد یہ صرف فلسطین کے اس حصہ کا مرکزی شہر رہ گیا تھا، جو عربوں کے قبضہ میں ہے۔ لیکن مذکورہ بالائی سڑک بن جانے کے بعد اس کی یہ حیثیت بھی ختم ہو گئی، اور اسی لیے اس کی آبادی دن بدن کم اور عمان کی آبادی زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ گویا اس لحاظ سے بیت المقدس غیروں اور اپنوں دونوں کی لاپرواہی کا شکار ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔

عمان پہنچ کر ملاقاتوں اور زیارتوں کا سلسلہ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا۔
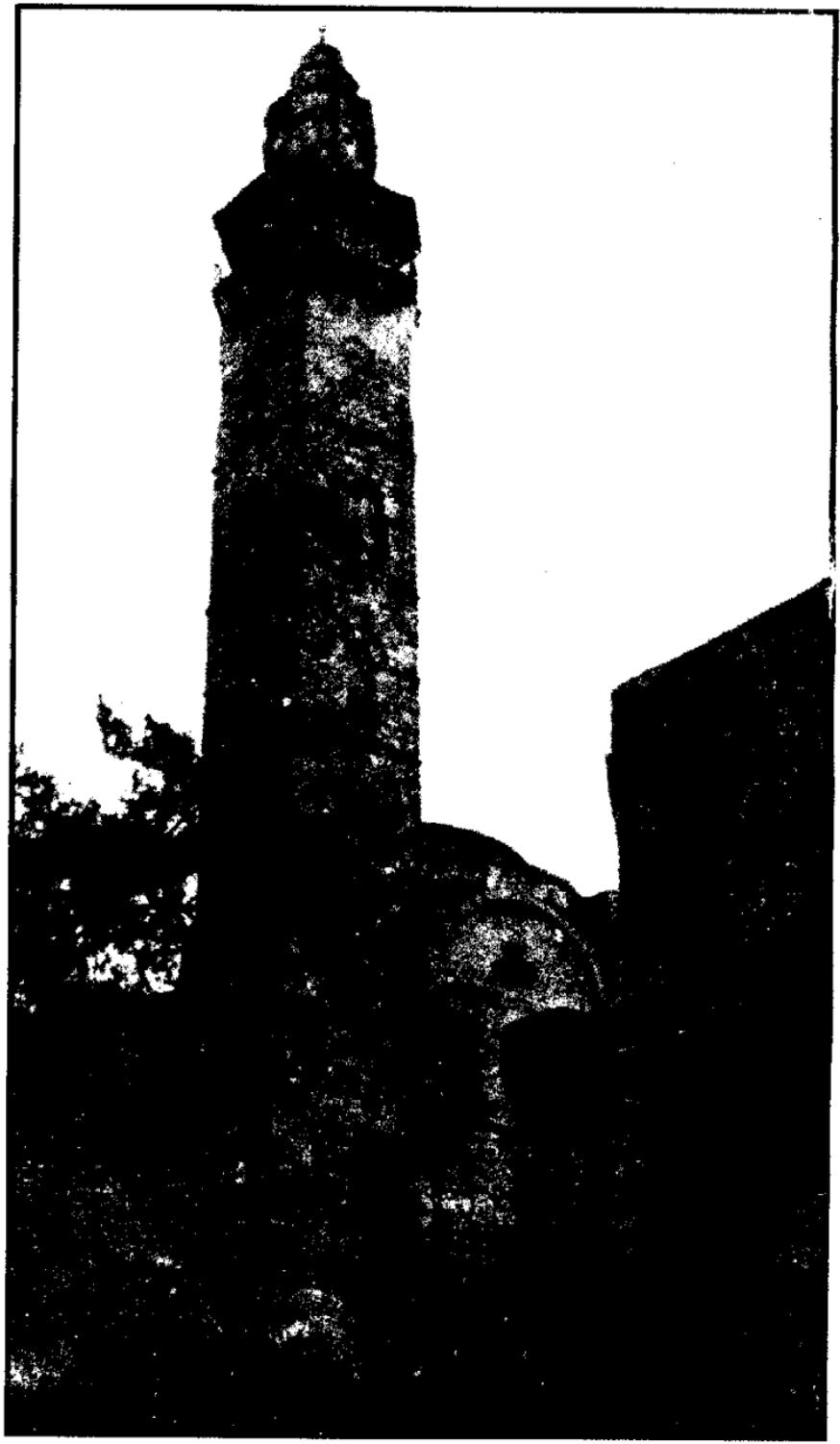
بیت المقدس ۔ مسجد سیّدنا عمرؓ (کنیسہ القیام کے صحن سے)

بیت المقدس وہ گلی جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب اٹھا کر گزرے۔

عمان کا کلیۂ اسلامیہ

8 جنوری کی صبح ہم عمان کا کلیہ اسلامیہ (اسلامیہ کالج) دیکھنے گئے۔ جسے وہاں کے اخوان اور بعض دوسرے اسلام پسندوں نے حال ہی میں اس غرض کے لیے قائم کیا ہے کہ جدید علوم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کیا جائے۔ یہ نہایت شاندار اور کامیاب قسم کا کالج ہے اور اس میں طلباء کی تعداد عمان کے دوسرے کالجوں کے مقابلے میں نہ صرف کم نہیں ہے بلکہ شاید زیادہ ہی ہے۔ اس کے وسط میں ایک خوبصورت اور صاف ستھری مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ ان دنوں کالج کی تعطیلات تھیں۔ لیکن ہم مختلف کمروں میں جا کر اس کی کامیابی اور حسنِ انتظام کا جائزہ لیتے رہے۔ آخر میں ہمارے اخوانی دوست ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے گئے جہاں طلباء کو مصوری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں دیواروں پر چاروں طرف حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، اور بعض دوسرے صحابہؓ کی تصویریں بھی لگی ہوئی تھیں، جو سب کی سب طلبہ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر ہمیں تعجب بھی ہوا اور حیرت بھی کہ عرب علماء نے تصویر کو جائز قرار دے کر جو فتنہ کھڑا کیا ہے، اس کے اثر سے اخوان جیسے مخلص اور دعوتِ اسلامی کے علم بردار تک محفوظ نہیں رہ سکے ہیں اور معاملہ صحابہ کرامؓ تک کی تصاویر بنا ڈالنے تک پہنچ گیا ہے۔ مولانا نے ان لوگوں کو جو ہمارے ساتھ تھے، بڑی شرم دلائی اور فرمایا کہ اب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ایسی رہ گئی ہے جو آپ کے فن مصوری سے محفوظ ہے اور اگر معاملہ یونہی بڑھتا گیا تو عجب نہیں کہ کل آپ لوگ اس حد کو بھی پار کر جائیں[1]۔ اس پر یہ

1- مولانا نے یہ جو کچھ فرمایا: مصر، شام اور اردن کی حد تک فرمایا۔ ورنہ ایران اور عراق میں تو یہ حد بھی کی پار کی جا چکی ہے۔ 56ء میں جب ہم ایران سے گزرے تو ہم نے طہران کے ہر دفتر اور ہوٹل میں ایک طرف حضرت علیؓ کی اور دوسری طرف شاہ ایران کی تصویر آویزاں پائی، بلکہ بعض دفاتر اور ہوٹلوں میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت فاطمہؓ کی تصاویر بھی نظر آئیں، اب معلوم نہیں وہ کون سی حد باقی رہ گئی ہے جسے پار کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پہنچ کر اباحتِ تصویر کا فتنہ رک گیا ہے۔ (م۔ع)

لوگ شرمندہ تو بہت ہوئے اور انہوں نے تصویر کی اباحت کو ایک سخت فتنہ بھی تسلیم کیا، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں اس فتنہ سے باز رہنے اور باز رکھنے کا عزم بھی پیدا ہو سکا کہ نہیں؟

استاذ یوسف العظم

اس روز جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے اس مسجد میں ادا کی جس میں یوسف العظم جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے۔ اردن میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں سب سے بڑا فتنہ ہیں۔ اس لیے ان کے خطبہ کا موضوع بھی یہی تھا۔۔۔ یوسف العظم ایک دردمند اور پرجوش نوجوان اور اعلیٰ درجہ کے مقرر ہیں۔ ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں اور اس وقت مذکورہ بالا کلیہ اسلامیہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دعوت کے کام میں انہیں استاذ محمد عبدالرحمان خلیفہ کا دستِ راست کہا جا سکتا ہے۔ اردن میں عیسائیوں کو جو اثر و رسوخ حاصل ہے، اس کے پیش نظر ان کا خطبہ جمعہ حیرت انگیز طور پر جرأت مندانہ تھا۔ واقعی اردن میں صرف اخوان المسلمون ہی واحد منظم جماعت ہے جو عیسائی فتنہ کا مقابلہ کر رہی ہے اور کر سکتی ہے۔

اخوان کا ہفتہ وار اجتماع

جمعہ کے بعد ہم اخوان المسلمون کے دفتر آئے۔ وہاں چالیس پچاس نوجوان جمع تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہر جمعہ اسی طرح جمع ہوتے ہیں اور کوئی دعوتی پروگرام رکھتے ہیں۔ مولانا سے انہوں نے نصیحت کی درخواست کی۔ مولانا نے نہیں تقویٰ پر قائم رہنے اور اخلاص کے ساتھ پیہم کام کیے جانے کی نصیحت فرمائی۔ چودھری صاحب بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور انہوں نے بھی انگریزی میں اخوان اور ان کے کام سے متعلق اپنے مسرت انگیز جذبات کا اظہار کیا، جس کا تمام نوجوانوں پر بہت اچھا اثر رہا۔ اس اجتماع میں الجزائری حکومت کے نمائندہ استاذ عبدالرحمان بھی شریک تھے۔ انہوں نے الجزائر کی جنگِ آزادی سے متعلق ان نوجوانوں کو مفید معلومات دیں۔

الزرقاء میں دعوت

اس کے بعد ہم سب لوگ الزرقاء روانہ ہوئے، جو عمان سے 15 میل یا 25 کلو میٹر کے فاصلہ پر ایک اہم شہر ہے اور اس سڑک پر واقع ہے، جو عمان سے دمشق جاتی ہے۔ یہاں ایک اخوانی کارکن الحاج خلیل جیمور کے ہاں مولانا کے اعزاز میں دعوت تھی۔ اس دعوت میں اخوان کارکنوں کے علاوہ عمان اور الزرقاء کے علماء کی بھی خاصی تعداد موجود تھی۔ اس مرتبہ اردن میں ہم نے عرب قومیت کا وہ زور محسوس نہیں کیا، جو 1956ء میں محسوس کیا تھا، اس لیے یہاں لوگ کشمیر اور دوسرے مسائل میں پاکستان سے گہری ہمدردی رکھتے ہیں۔ کھانے سے پہلے اور بعد گفتگو کے دوران میں مولانا نے کشمیر کے مسئلہ کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالتِ زار کو بھی تفصیل سے بیان کیا۔ یہ معلومات ان میں سے اکثر کے لیے نئی تھیں اس لیے الجزائری نمائندہ استاذ عبدالرحمان نے خاص طور پر پاکستان کے پروپیگنڈا کے کمزور ہونے کی شکایت کی۔

مغرب تک ہم لوگ عمان واپس آ گئے۔ اگلے دن چونکہ ہم عمان سے روانہ ہونے والے تھے اس لیے رات کو الوداعی ملاقات کے لیے آنے والوں کی تعداد خاص طور پر زیادہ تھی۔ ہوٹل میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ تمام لوگ بیٹھ سکیں۔ اس لیے استاذ یوسف العظم نے نوجوانوں پر یہ آرڈر نافذ کر رکھا تھا کہ دس دس کی تعداد میں آئیں اور آدھا گھنٹہ بیٹھ کر چلے جائیں۔ اس مجلس میں مولانا کی ایک مختصر نصیحت اور کچھ گفتگو بھی ٹیپ ریکارڈ کی گئی تاکہ آئندہ کارکنوں کی تربیت کے سلسلے میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

سرکاری دعوت

اگلے روز (9 جنوری) ہم عمان سے روانہ ہو جانا چاہتے تھے، لیکن صبح ہی یکایک اطلاع ملی کہ شاہ حسین نے حکم دیا۔ کہ مولانا کے اعزاز میں پارٹی کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ ہمیں اپنا سفر ایک روز کے لیے اور ملتوی کرنا پڑا۔ ظہر کے بعد خادی الملک حسین (شاہ حسین کلب) میں شیخ محمد امین الشنقیطی نے حکومت کی طرف سے ہمیں پارٹی دی۔ جس

میں اردن کے بہت سے عمائدین شریک تھے۔ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر دلچسپ گفتگو ہوتی رہی اور پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں سے متعلق بہت مفصل معلومات مولانا نے شرکائے مجلس کو دیں۔ یہاں بھی مولانا نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کو اسرائیل میں عربوں کی حالت سے تشبیہ دی۔ اردن کے باشندوں سے بڑھ کر اسرائیل میں عربوں کی حالت سے اور کون واقف ہوسکتا ہے۔ اس لیے ان حضرات پر اس تشبیہ کا جو اثر ہوا، وہ ظاہر ہے۔

اصحابِ کہف کا غار

اگلے روز (10 جنوری) ہم نے صبح کو وہ غار بھی جا کر دیکھا، جس کے متعلق مقامی روایات یہ ہیں کہ اصحابِ کہف کا واقعہ یہیں پیش آیا ہے۔ یہ غار عمان کے جنوب مشرق میں تقریباً 12 کلومیٹر (7 میل) کے فاصلے پر واقع ہے اور اس کے قریب کی بستی کا نام "رقیب" ہے، جس کا تلفظ اہل اردن اپنی عامی زبان میں "رجیب" کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ لفظ دراصل رقیم ـــــ اصحاب الکہف والرقیم ـــــ سے بگڑا ہوا ہے۔ اس غار کے اندر اتنی تاریکی ہے کہ ہم نے اس کے اندر جھانکا تو کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس کے اوپر اس سے متصل کی جگہوں پر قدیم زمانہ کی سنگین عمارتوں کے آثار موجود ہیں اور اس کا دروازہ بھی جنوب مشرقی سمت میں اس طرح سے ہے کہ سورج طلوع ہوتو تزاور عن کہفہم۔

گویا قرآن پاک نے اصحاب کہف کے غار کی جو صفات بیان کی ہیں، وہ اس غار پر صادق آتی ہیں، لیکن مقامی روایات کے سوا کوئی چیز کتبہ وغیرہ کی شکل میں وہاں موجود نہیں ہے اور نہ ہی اردن کے محکمہ آثار قدیمہ نے اس کا کوئی پراپیگنڈا کیا ہے۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ واقعی یہ اصحاب کہف کا غار ہے کہ نہیں؟ اکثر قدیم مفسرین اور جدید محققین نے اس غار کی جگہ ترکی کے شہر ازمیر سے قریب افسس (EPHESUS) بتائی ہے۔

اِربد

اسی روز ہم اربد کے لیے روانہ ہوئے، جو اردن اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں

عمان کے قریب ایک غار جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اصحاب کہف نے اس غار میں پناہ لی تھی۔

عمان کے قریب ایک غار جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اصحاب کہف نے اس غار میں پناہ لی تھی۔

ایک بہت بڑے مجمع نے (جس میں اخوانی کارکن پیش پیش تھے) ہمارا استقبال کیا اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی ایک ہائی سکول کی عمارت میں ایک جلسہ منعقد کر ڈالا، جس میں اربد کے کمشنر، جج، فوج اور پولیس کے افسر اور دوسرے عمائد شہر شریک ہوئے۔ کمشنر صاحب نے شاہ حسین اور حکومت اردن کی طرف سے خیر مقدم کی تقریر کی، اور اخوان کی مقامی شاخ کے انچارج استاذ مشہود حسن تیمور نے تفصیل سے مولانا کی شخصیت اور ان کے علمی و دعوتی کارناموں کا تعارف کرایا۔ مولانا نے تقریباً دس منٹ کی عربی تقریر میں شاہ حسین اور اردنی قوم کا شکریہ ادا کیا اور ان کے مسائل میں پاکستان کی پوری ہمدردی کا ذکر کیا۔

مزارات صحابہؓ

دوسرے روز (11 جنوری کو) ہم وہ مقامات دیکھنے گئے، جہاں حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ، حضرت شرجیل بن حسنہؓ اور حضرت ضرار بن ازدر کے مزارات واقع ہیں۔ ان مزارات کو دیکھنے کے لیے ہم کو اربد سے تقریباً پچاس میل کا سفر القدس کی طرف کرنا پڑا۔ جس سڑک پر ہم گئے، وہ پہاڑوں سے گزرتی ہوئی سب سے پہلے حضرت معاذؓ کے مزار تک پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے دریائے اردن کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ القدس جاتی ہے۔ دریائے اردن کے مغربی کنارے پر اسرائیل کا قبضہ ہے اور مشرقی کنارے پر اس سڑک کے ساتھ اردن میں مسلمانوں کے بڑے اہم تاریخی مقامات واقع ہیں۔ یہیں فحل کا تاریخی مقام واقع ہے، جہاں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مشہور معرکہ پیش آیا تھا اور اسی سڑک پر کئی کئی میل کے فاصلے سے مذکورہ بالا صحابہ کرامؓ کے مزارات بنے ہوئے ہیں۔

میدانِ یرموک

ان مقابر کی زیارت سے فارغ ہو کر ہم اربد واپس آئے اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر ایک دوسری سڑک سے جنگ یرموک کا مقام دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ مقام اربد سے چند میل کے فاصلہ پر شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ اصل میدان تو شام کی سرحد پر

واقع ہے، لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ اردن کی سرحد پر ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے جس جگہ سے اسے دیکھا، اس جگہ دریائے یرموک ہمارے اور میدان معرکہ کے درمیان حائل تھا۔ ہم اس میدان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اپنی خوش قسمتی پر یقین نہ آتا تھا کہ اس میدان کے سامنے کھڑے ہیں، جہاں ایک طرف حضرت خالدؓ، حضرت عبیدہ بن جراحؓ وغیرہ صحابہ کی قیادت میں چالیس ہزار مسلمانوں کا اور دوسری طرف ان کے مقابلے میں اسی دریائے یرموک کے کنارے جس کے کنارے ہم کھڑے ہیں دو لاکھ کے قریب رومیوں کا لشکر جمع تھا۔ یہیں حضرت خالدؓ نے اپنی شجاعت اور فن سپہ گری کے وہ جوہر دکھائے تھے جن کو سن کر پوری رومی دنیا کانپا کرتی تھی اور یہی وہ میدان ہے، جہاں کے متعلق ہم تاریخ اسلام میں پڑھتے ہیں کہ حضرت خالدؓ کی قیادت میں رومیوں سے جنگ جاری تھی کہ انہیں حضرت عمرؓ کی طرف سے معزولی اور ان کے بجائے حضرت عبیدہ بن جراحؓ کے سپہ سالار لشکر مقرر کیے جانے کا خط ملا تھا۔ اسی میدان میں اسلامی لشکر کو وہ فتح نصیب ہوئی تھی، جس نے شام میں اسلامی فتوحات کا دروازہ کھول دیا اور جس کی خبر پانے کے بعد رومی شہنشاہ ہرقل نے حمص میں اپنا یہ مشہور تاریخی جملہ زبان سے نکالا تھا۔ سلام علیک یا سوریا سلاماً الا لقاء بعدہ (اے بلادِ شام تجھ کو الوداعی سلام) اور یہی دریائے یرموک وہ جگہ ہے جس میں رومیوں کے ایک لاکھ بیس ہزار پیادہ سپاہی گر کر ہلاک ہوئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ یرموک کی صحیح کیفیت آدمی اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اس میدان کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔

ظہر کے بعد ہم یرموک سے اربد واپس ہوئے اور شہر کے رئیس البلدیہ (میئر) نے کھانے پر ہمیں اور شہر کے بہت سے عمائد کو مدعو کیا۔ عصر کے بعد ہم دمشق کے لیے روانہ ہو گئے۔
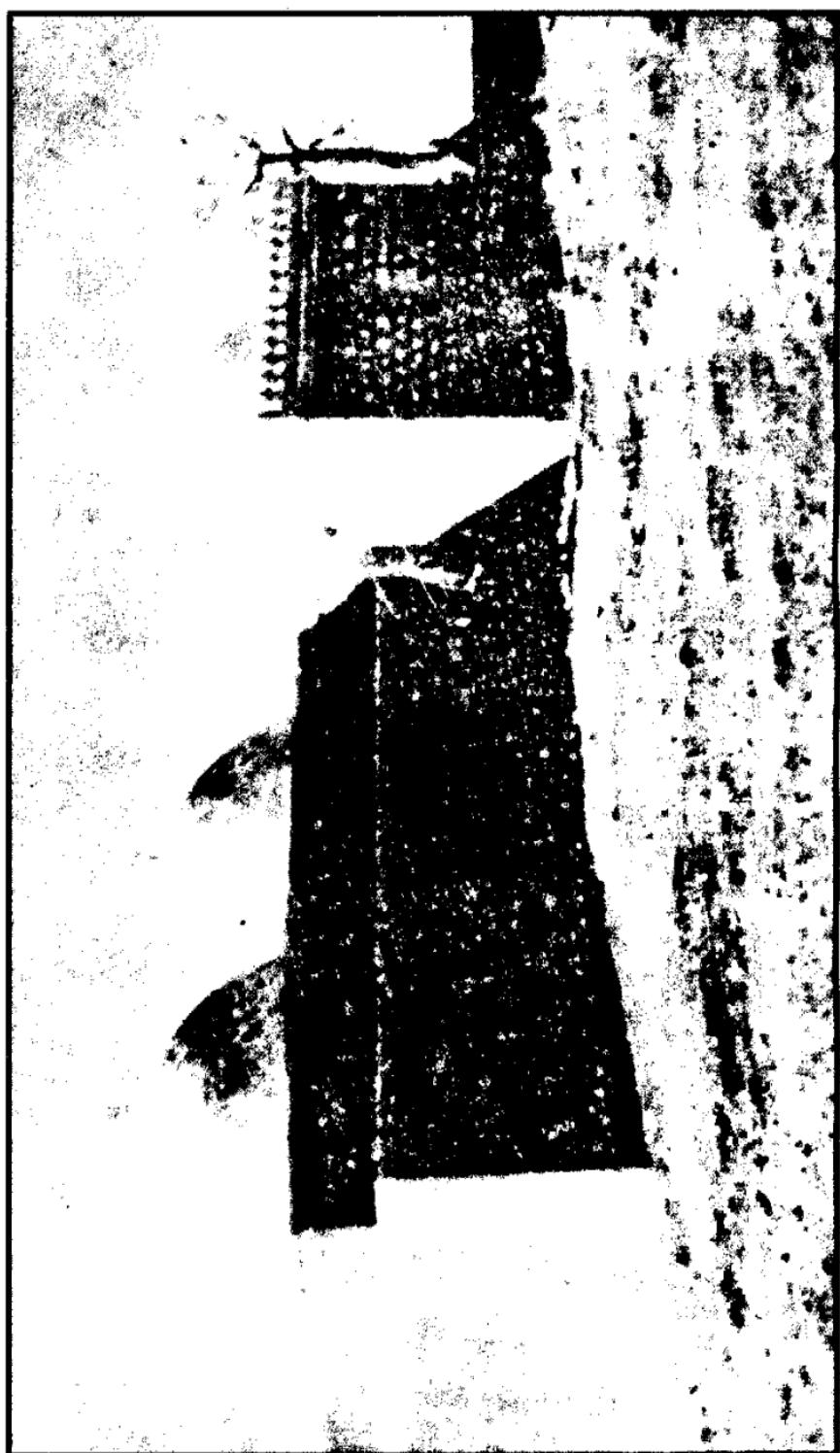
مقام الشہید۔ حضرت معاذ بن جبلؓ
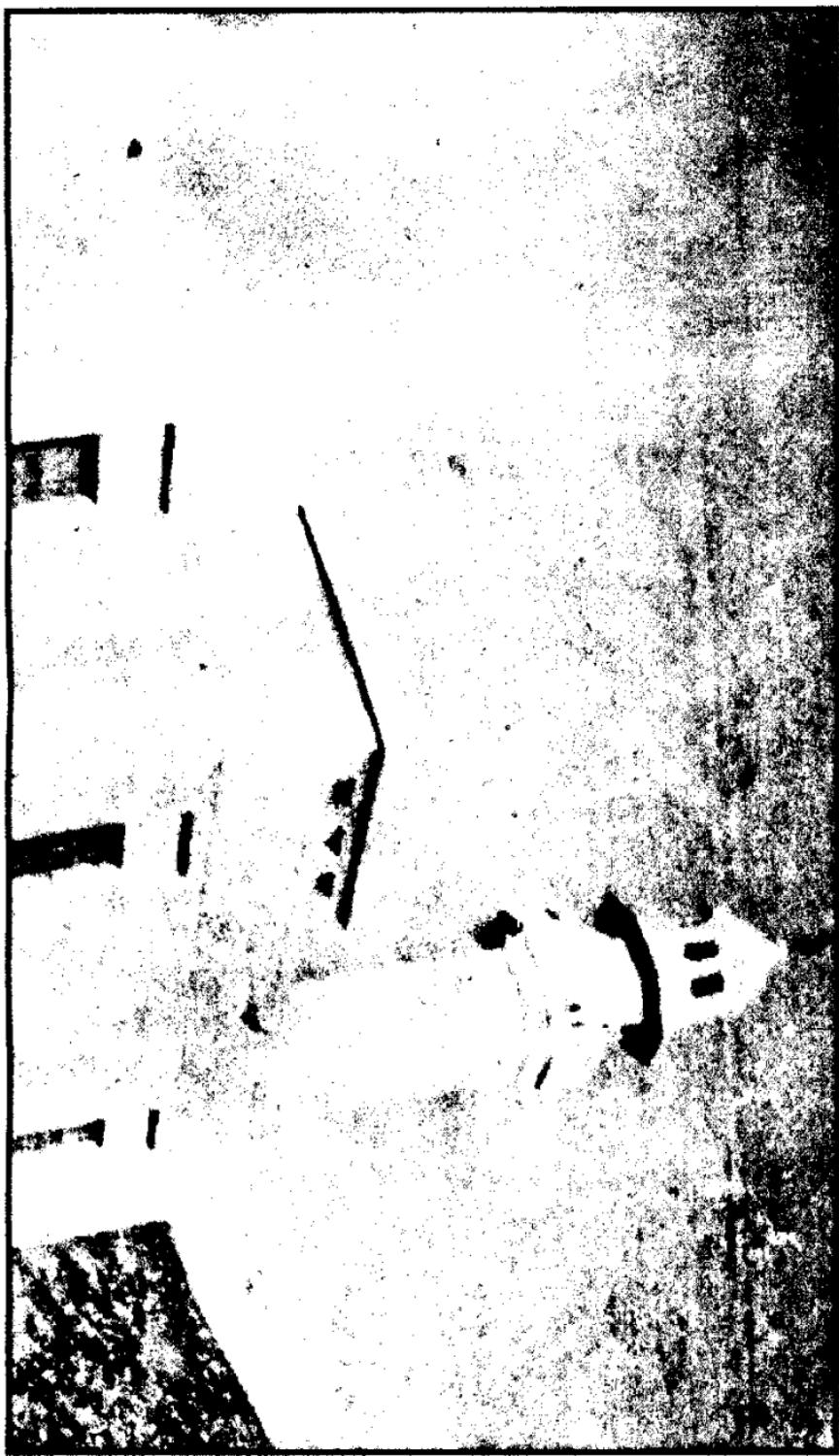
مقام حضرت ابی عبیدہ بن الجراحؓ

مقام حضرت شرحبیل بن حسنہ ؓ

مقامِ الشہید۔ حضرت ضرار بن الازورؓ
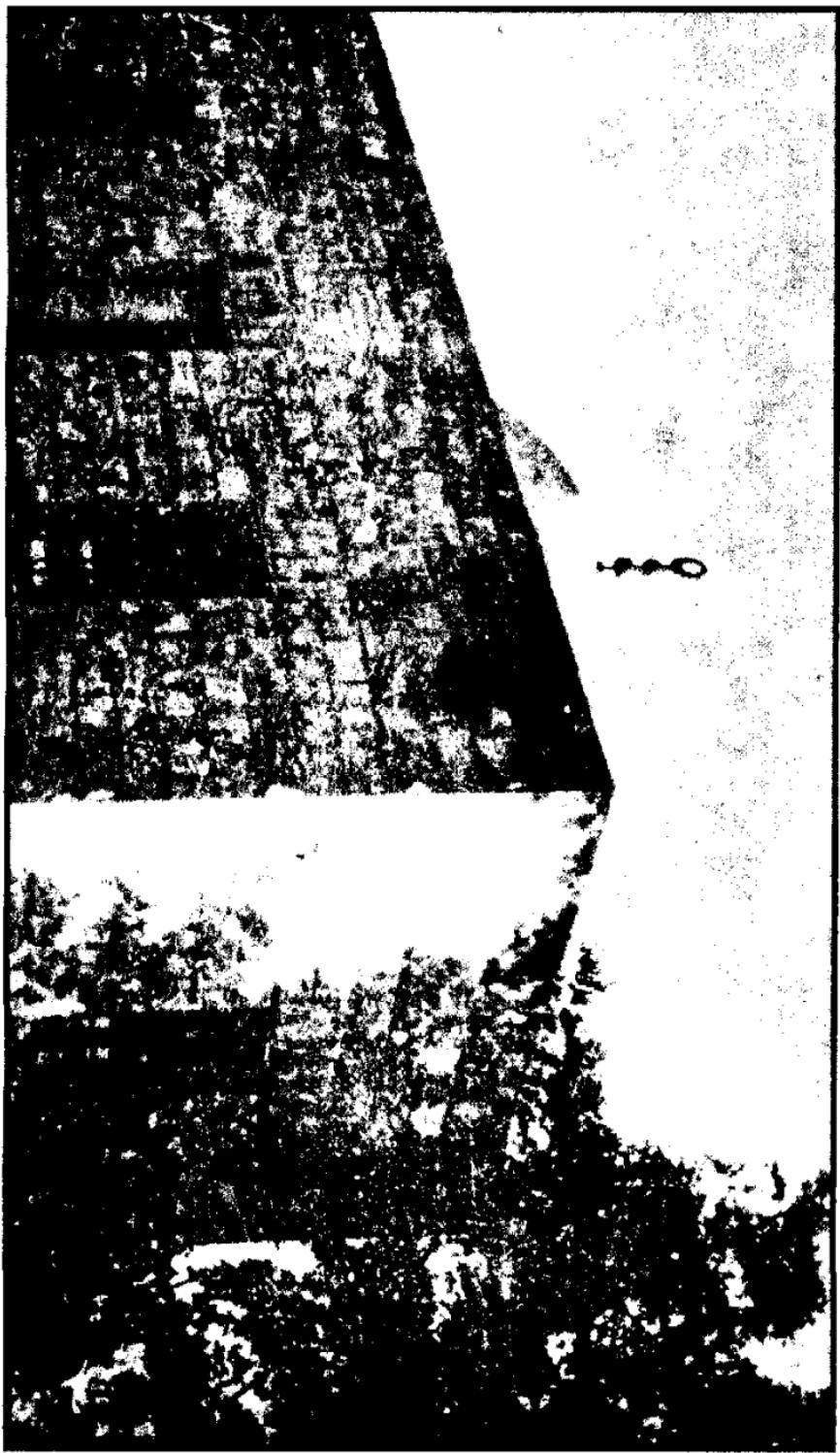
شام ومصر

(11 تا 28 جنوری 1960ء)

اردن اور شام کی سرحد پر ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ دونوں طرف کسٹم والوں نے نہایت عزت اور شرافت کا معاملہ کیا۔ سرحد پر ہمیں اپنی ٹیکسی بھی تبدیل نہیں کرنی پڑی، بلکہ جس ٹیکسی سے ہم اربد سے روانہ ہوئے تھے، وہی ہمیں دمشق تک لے گئی۔

دمشق

سرحد سے دمشق کا فاصلہ 50 میل ہے، اس لیے ہم عشاء کے وقت دمشق پہنچ سکے۔ شہر کے باہر ہی استاذ محمد المبارک (پرنسپل کلیۃ الشریعہ) استاذ منتصر الکتانی (پروفیسر کلیۃ الشریعہ) استاذ محمد محمود الصواف (عراق میں اخوان المسلمون کے مراقب عام جوان دنوں عراق سے نکل کر دمشق میں پناہ گزین تھے) اور چند دوسرے احباب ہمیں لینے کے لیے تشریف لے آئے تھے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی ان دنوں بیمار تھے۔ اس لیے خود نہ آ سکے تھے لیکن اپنی نمائندگی کے لیے انہوں نے اپنے بھائی کو بھیج دیا تھا۔ کہاں دمشق، جس کا شاید ہی کوئی اسلام پسند پڑھا لکھا آدمی مولانا کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں سے ناواقف ہو، اور کہاں ان کے استقبال کے لیے یہ چند حضرات جو اس ''محدود جمہوریت'' کے دور میں گویا پورے دمشق کی نمائندگی کر رہے تھے[1]۔ اس سے ہمیں پہلے ہی قدم پر دمشق کی

1۔ واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مصر و شام کا اتحاد باقی تھا (م۔ع)

فضا کا اندازہ ہو گیا۔

ہمارے سامنے دمشق میں زیادہ دن قیام کرنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ ہم جلد از جلد یہاں سے قاہرہ اور وہاں سے جزیرہ نما سینا جانا چاہتے تھے، لیکن پھر بھی احباب کے اصرار پر ہمیں تین دن (12 تا 14 جنوری) وہاں رکنا پڑا۔ اس عرصہ میں مختلف احباب اور دوسرے حضرات ملنے کے لیے آتے رہے۔ کالجوں کے طلباء بھی آتے رہے، لیکن اس جوش وخروش اور بے باکی سے نہیں، جس جوش وخروش اور بے باکی سے وہ 56ء کے موقع پر آیا کرتے تھے۔ وہ مختلف علمی موضوعات پر مولانا سے سوالات بھی کرتے تھے لیکن احتیاط کے ساتھ اور سیاسی موضوعات سے بچتے ہوئے۔

دمشق میں قیام کے دوران میں ہم نے ''زبان بندی'' کی جو فضا محسوس کی، وہ اس فضا سے بھی بدتر تھی، جو بعد میں ہم نے قاہرہ میں محسوس کی۔ وہاں طلباء نسبتاً زیادہ جرأت سے ملاقات کے لیے آتے بھی رہے اور ہر قسم کے موضوع پر حتیٰ کہ عرب قومیت کے موضوع پر بھی سوالات کرتے رہے، جیسا کہ میں آگے چل کر تفصیل سے بیان کروں گا۔ دمشق میں مختلف علمی شخصیتوں اور طلبہ سے گفتگوؤں کے دوران میں ہمیں صاف محسوس ہوتا تھا کہ شام کے طبعاً جمہوریت پسند باشندوں سے اتحاد عرب کا وہ نشہ آہستہ آہستہ اتر رہا ہے۔ جو چند سال پہلے ان پر بری طرح سوار تھا اور یہ کہ کمیونسٹوں سے بچنے کے لیے ایک مرتبہ انہوں نے مصر سے اتحاد تو قائم کر لیا ہے، لیکن شاید یہ اتحاد پائیدار ثابت نہ رہ سکے۔ ان کو مصریوں کے مقابلے میں اپنی برتری اور خوش حالی کا جو احساس تھا، وہ ان کی گفتگوؤں تک سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔

ان تین دنوں میں استاذ محمد المبارک، استاذ مصطفیٰ سباعی[1]، شیخ بہجۃ البیطار اور بعض دوسرے حضرات نے مولانا کے اعزاز میں دعوتیں بھی کیں۔ ان دعوتوں میں کلیۃ الشریعہ اور دمشق یونیورسٹی کے دوسرے کالجوں کے بہت سے پروفیسروں سے بھی ہماری ملاقات

1۔ استاذ مصطفیٰ سباعی اور سید عبدالحمید خطیب کا بعد میں انتقال ہو گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہوئی۔ شیخ بہجتہ البیطار کی دعوت میں شیخ ابوالیسر عابدین (مفتی شام) اور دمشق کے دوسرے تمام اکابر علماء سے بھی ملاقات ہوئی۔ استاذ علی طنطاوی اور سید عبدالحمید خطیب مرحوم (سابق سفیر مملکت سعودیہ برائے پاکستان) کئی مرتبہ مولانا کی ملاقات کے لیے ہوٹل تشریف لائے۔

ان تین دنوں میں ہمیں شامی کرنسی کا مصری کرنسی سے تبادلہ بھی کرنا پڑا، کیونکہ اس وقت تک مصر و شام کی کرنسی ایک نہ ہوسکی تھی اور نہ صرف کھلے میدان میں بلکہ بنکوں تک میں شامی کرنسی کے مقابلہ میں مصری کرنسی بہت زیادہ گری ہوئی تھی۔ مزید تعجب یہ ہے کہ ہم نے دمشق میں مصری کرنسی کی جو "پستی" دیکھی، بعینہ وہی پستی ہم نے بعد میں مصر پہنچ کر بھی دیکھی۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ شامیوں کو اتحاد کے باوجود مصر کے مقابلہ میں اپنی اقتصادی برتری کا احساس بھی تھا اور اس کو باقی رکھنے پر اصرار بھی۔

قاہرہ کے لیے روانگی

15 جنوری کی صبح ساڑھے آٹھ بجے ہم ہوائی جہاز کے ذریعے دمشق سے قاہرہ روانہ ہوئے۔ دمشق کے اردگرد ہر طرف پندرہ بیس میل تک باغات کا سلسلہ ہے جو غوطہ دمشق کے نام سے مشہور ہے اور اہل شام کو آج سے نہیں، قدیم زمانہ سے اس پر ناز ہے۔ شام کے مشہور ادیب و مورخ استاذ کرد علی مرحوم نے تو اس کی تعریف میں کئی سو صفحات کی ایک مستقل کتاب بھی لکھ کر شائع کی ہے۔ ہم نے ہوائی جہاز سے اس کا منظر دیکھا، تو واقعی اس کی خوبصورتی کا قائل ہونا پڑا۔ اس کے بعد لبنان کا پہاڑی سلسلہ شروع ہوا۔ جن میں سے بعض سفید و چمکدار برف کا عمامہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ اور بعض پوری کی پوری سرسبز و شاداب اور خوبصورت درختوں سے بھری نظر آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم بیروت کے اوپر سے گزرے، پھر بحیرۂ روم پر پرواز کی۔ اس کے بعد مصر کا وہ علاقہ شروع ہوا، جہاں دریائے نیل بحیرۂ روم میں گرنے سے پہلے کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور جغرافیائی اصطلاح میں اسے سعید مصر کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر طرف سوائے ہرے بھرے باغات اور کھیتوں کے کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی تھی۔ تم از کم ہوائی جہاز سے ہمیں اس کی

خوبصورتی اور سرسبزی وشادابی غوطہ دمشق سے کم نظر نہیں آرہی تھی۔ دریائے نیل کے دونوں کناروں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گنجان قسم کی بستیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس لحاظ سے دمشق سے قاہرہ تک کا سفر بہت ہی پر لطف رہا، لیکن جب ہم قاہرہ کے قریب پہنچے، تو گرد اور ریت کا ایک ایسا طوفان شروع ہوا کہ زمین کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور اس کی وجہ سے ہوائی جہاز کو بھی قاہرہ کے ہوائی اڈہ تک پہنچنے اور وہاں اترنے میں سخت دشواری پیش آئی۔ ہوائی جہاز سے ہوائی اڈہ کی عمارت کے درمیان مشکل سے ایک فرلانگ کی مسافت ہوگی، لیکن ہم نے جس مصیبت سے اسے پار کیا، اسے خدا ہی جانتا ہے، گویا باقاعدہ کنکر تھے جو چہروں پر پڑ رہے تھے۔ خصوصاً بچوں کی چیخ و پکار نے تو قیامت کا سماں پیدا کر دیا تھا۔

قاہرہ میں

چیکنگ سے فارغ ہو کر جب ہم ہوائی اڈہ سے باہر نکلے، تو وہاں پاکستانی سفارت خانہ کی طرف سے ایک صاحب اور علامہ محمد البشیر الابراہیمی الجزائری ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہم قاہرہ میں بالکل نووارد تھے، اس لیے اگر یہ دونوں حضرات ہوائی اڈہ پر تشریف نہ لاتے، تو نہ معلوم ہمیں کس قدر دشواری پیش آتی۔ ان ہی کی معیت میں ہم شہر آئے اور ان ہی کے مشورے سے وہاں کے گرینڈ ہوٹل میں قیام کیا۔

ملاقاتیں اور تبادلۂ خیالات

قاہرہ سے چونکہ ہمیں طور سینا جانا تھا، جو آج کل ایک فوجی علاقہ ہے اور وہاں جانے کے لیے بہت سے رسمی مراحل طے کرنے ضروری تھے، اس لیے اس سفر کے انتظامات کے لیے ہمیں پانچ روز (15 تا 20 جنوری) قاہرہ میں ٹھیرنا پڑا۔ پہلے دن تو ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ قاہرہ میں ہمیں کوئی نہیں جانتا، لیکن شام ہوتے ہوتے یکایک ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ قاہرہ ہمارے احباب اور مولانا کی کتابوں کو پڑھے ہوئے نوجوانوں سے بھرا ہوا ہے۔ روز نامہ ''اخبار الیوم'' اور ''الاہرام'' میں مولانا کے قاہرہ پہنچنے کی اطلاع شائع ہوگئی تھی۔ اس لیے جس جس کو یہ اطلاع ملتی گئی، ہمارے ہوٹل کا رخ کرتا رہا۔ ہر

روز آنے والوں کا وہ تانتا بندھا کہ صبح سے رات کے بارہ بجے تک دم لینے کی فرصت ملنا مشکل ہوگئی۔ آنے والوں میں علماء، پروفیسر، ادیب، ازہر اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی ایک کثیر تعداد تھی۔ خصوصیت کے ساتھ نوجوان طلبہ کا ایک ہجوم ہر روز عصر کے وقت سے ہوٹل پہنچ جاتا تھا اور رات کے 11-12 بجے تک، جب تک انہیں اٹھ جانے کے لیے صاف صاف کہنا نہ پڑتا وہ جانے کا نام نہ لیتا تھا۔ ہمارے کالجوں کے طلباء کی طرح سوالات کی کوئی قسم ایسی نہ تھی، جو انہوں نے چھوڑ دی ہو۔ خصوصیت کے ساتھ ''عرب قومیت'' کے مسئلہ پر یہ بہت زیادہ اور بار بار سوالات کرتے تھے اور مولانا بھی (اس فتنہ کے علمبردار) کا نام لیے بغیر ان کے سوالات کا کھل کر جواب دیتے تھے۔ دمشق کے طلبہ کو یہ مسئلہ چھیڑنے کی بہت کم ہمت ہوتی تھی، اس لیے ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ مصر میں لوگوں کو زبان کھولنے کی کچھ نہ کچھ آزادی حاصل ہے، لیکن شام والوں کو ایک خاص پروگرام کے تحت دبانے اور دبائے رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

سفیرِ پاکستان کی دعوت

اس قیام کے دوران 16 جنوری کو مغرب کے بعد ہم سفیر پاکستان خواجہ شہاب الدین صاحب سے ملاقات کے لیے ان کی رہائش گاہ ''پاکستان ہاؤس'' گئے۔ پاکستانی سفارت خانہ کے کلچرل اتاشی جناب عبدالحمید باجوہ ہمیں لینے کے لیے ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ خواجہ صاحب بڑی دیر تک مولانا سے ان کی خیریت اور سفر کے حالات دریافت کرتے رہے، عرب ممالک میں کام کرنے کے لیے مولانا نے خواجہ صاحب کو مفید مشورے دیے جن کے مطابق کام کرنے کا انہوں نے وعدہ کیا۔ 18 جنوری کی شام کو خواجہ صاحب نے مولانا کے اعزاز میں چائے کی دعوت دی، جس میں سابق وموجودہ سعودی سفیر، سابق شیخ الازہر شیخ عبدالرحمٰن تاج، لجح کے معزول سلطان اور بہت سے دوسرے معززین شریک تھے۔

علامہ محمد البشیر الابراہیمی کی دعوت

اسی روز رات کو علامہ محمد البشیر ابراہیمی نے بھی مولانا کے اعزاز میں ایک دعوت

اپنے مکان پر دی[1]۔ جس میں مصر، الجزائر اور مراکش کے بہت سے علماء اور معززین شریک تھے، جن میں مشہور مجاہدِ اسلام امیر محمد عبدالکریم الریفی[2] کے چھوٹے بھائی اور مراکش کے سفیر (برائے مصر) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس دعوت میں سید سابق احمد شرباصی اور محمد الغزالی وغیرہ سے بھی ہماری ملاقات ہوئی۔

حکومت الجزائر کے کارکنوں سے ملاقات

الجزائری حکومت کا دفتر قاہرہ ہی میں ہے[3]۔ ہم وہاں جانا چاہتے تھے لیکن معلوم ہوا کہ ان دنوں ان کے وزراء میں سے کوئی موجود نہیں ہے، اس لیے ہم وہاں نہ جا سکے، مگر اس حکومت کے ذمہ دار افسروں کو جب معلوم ہوا کہ مولانا قاہرہ میں تشریف رکھتے ہیں، تو وہ ان سے ملنے کے لیے خود ہوٹل میں آئے۔ ان سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ الجزائر کی جنگ چھڑنے سے پہلے مولانا کی عربی کتابیں کافی تعداد میں الجزائر پہنچ چکی تھیں اور وہاں بکثرت لوگ ان سے متاثر تھے۔ مولانا نے انہیں نصیحت فرمائی کہ آپ لوگ ابھی سے اس چیز کا خاص اہتمام کریں کہ کہیں الجزائر کے عام مسلمانوں کو فرانسیسی استعمار سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنوں کے استعمار سے آزادی حاصل کرنے کی دوبارہ جدوجہد نہ کرنی پڑے، جیسا کہ بہت سے دوسرے مسلمان ممالک کو ان دنوں یہی تلخ تجربہ درپیش ہے[4]۔

1- علامہ محمد البشیر الابراہیمی کا چند سال ہوئے انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (ستمبر 67ء)

2- امیر محمد عبدالکریم کا چند ماہ ہوئے قاہرہ میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (م۔ع۔ جون 63ء)

3- یہ اس زمانے کی بات ہے۔ اب الجزائر آزاد ہو گیا ہے اور الجزائر میں باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی ہے (م۔ع)

4- افسوس ہے کہ الجزائر کی آزادی کے بعد یہ خطرہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہے۔ (م۔ع)

اہرام اور قاہرہ کا میوزیم

اس قیام کے دوران میں ہم نے اہرام مصر، ابوالہول اور قاہرہ کے میوزیم کو دیکھا، یہ ایسی چیزیں ہیں کہ جب تک آدمی خود ان کو نہ دیکھ لے، وہ انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ درحقیقت ان چیزوں کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ قاہرہ کے میوزیم میں خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کی چیز پرانے بادشاہوں کی وہ لاشیں ہیں جو تین چار ہزار برس سے آج تک اسی طرح چلی آ رہی ہیں کہ ان کے چہروں کے نقش اور سروں کے بال اب تک قریب قریب اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہیں۔ ان ہی لاشوں میں ایک اس فرعون کی لاش بھی موجود ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں غرق ہوا تھا۔ اس میوزیم میں ہزاروں برس پہلے کی مصری تہذیب کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ شاید ہی دنیا میں کسی تہذیب کے آثار اس قدر مرتب و منظم شکل میں محفوظ ہوں۔

جامع ازہر

19 جنوری کی صبح ہم جناب عبدالحمید باجوہ کی معیت میں جامع ازہر بھی گئے اور شیخ الازہر محمد محمود شلتوت اور مدیر الازہر ڈاکٹر محمد البہی سے ملاقات کی۔ شیخ پہلے مولانا کی کتابیں دیکھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ غائبانہ ان سے خوب واقف تھے۔ بے حد تپاک اور محبت سے مولانا کا خیر مقدم کیا اور ان سے گہرے جذبات کا اظہار فرماتے رہے۔ افسوس وہ ان دنوں فالج کے مرض میں مبتلا تھے۔ اس لیے کسی مسئلہ پر ان کی مولانا سے تفصیلی گفتگو نہ ہو سکی۔ ہم واپس ہونے لگے تو انہوں نے بڑی محبت سے اپنی کتابیں ہم سب کو عنایت فرمائیں[1]۔

اس کے بعد ہم نے ازہر کی لائبریری بھی دیکھی۔ مجلۃ الازہر کے دفتر بھی آئے جہاں استاذ احمد حسن الزیات (جو ان دنوں اس رسالہ کے ایڈیٹر ہیں) سے ملاقات ہوئی۔

1۔ شیخ شلتوت کا بعد میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انصار السنہ

شام کو ہم جمعیتہ انصار السنہ کے دفتر گئے، کیونکہ ہم ریاض میں شیخ عبدالرزاق عفیفی اور دوسرے علماء سے اس کا وعدہ کر چکے تھے۔ انصار السنہ، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مصر کے اہل حدیث حضرات کی انجمن ہے اور اپنے مسلک کی اشاعت کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے۔ اور اس کا ایک ماہنامہ آرگن ''الہدی النبوی'' بھی ہے۔ اس کے صدر تو شیخ عبدالرزاق عفیفی ہیں، جو مستقل طور پر ریاض میں رہتے ہیں لیکن اس کے سیکرٹری اور دوسرے کارکن دفتر میں موجود تھے، انہوں نے بڑی محبت اور شکریہ کے ساتھ مولانا کا خیر مقدم کیا اور دیر تک اپنے ہاں کی شائع شدہ کتابیں ہمیں دکھاتے رہے۔ عشاء کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، امامت کے لیے انہوں نے مولانا ہی کو حالتِ سفر میں ہونے کے باوجود آگے بڑھایا۔

قاہرہ ریڈیو کے لیے انٹرویو

19 جنوری کی صبح قاہرہ ریڈیو کا نمائندہ ہوٹل آیا اور اس نے مولانا سے مندرجہ ذیل انٹرویو لیا۔

سوال: سنا ہے ان دنوں آپ قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھ رہے ہیں۔ یہ تفسیر آپ کس زبان میں لکھ رہے ہیں اور اس سے آپ کے پیش نظر کیا مقصد ہے؟

جواب: میں پچھلے چند سال سے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھ رہا ہوں، اس تفسیر میں میرے پیشِ نظر اصل مقصد یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن مجید کی روح اچھی طرح سمجھائی جا سکے اور جو شبہات وشکوک ان کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں، انہیں دور کیا جائے۔ یہ تفسیر میں اردو زبان میں لکھ رہا ہوں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ شائع کیا جائے۔ عربی میں اس کا صرف ایک حصہ تفسیر سورۂ نور منتقل کیا جا چکا ہے اور وہ ان دنوں دمشق میں زیر طبع ہے، انگریزی ترجمہ شروع ہو چکا ہے، سندھی اور بنگلہ میں بھی اس کے بعض حصے

شائع ہو چکے ہیں۔

سوال: عربی میں آپ کی تصنیفات کتنی ہیں اور کون کون سی؟

جواب: میری تصنیفات زیادہ تر اردو میں ہیں۔ عربی زبان میں بیس سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں، ان میں الحجاب، الربا، مبادی الاسلام اور اسس الاقتصاد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سوال: کیا آپ کے ہاں پاکستان میں عربی مدارس پائے جاتے ہیں؟
کیا ان مدارس سے متعلق آپ ہمیں کچھ معلومات دے سکتے ہیں؟

جواب: پاکستان اور ہندوستان میں ہزاروں مدارس ایسے ہیں، جن میں عربی زبان اور قرآن مجید، حدیث، فقہ اور دوسرے اسلامی علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ انگریزی استعمار کے زمانہ میں عربی اور دینی تعلیم جب سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے خارج کر دی گئی تو مسلمانوں نے خود اپنے مصارف سے آزاد مدارس قائم کیے تھے تاکہ عربی زبان اور اسلامی ثقافت کو زندہ رکھا جا سکے۔ یہ مدارس اب تک اسی طرح چل رہے ہیں۔ برصغیر میں لاکھوں افراد ایسے پائے جاتے ہیں جو ان مدارس سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔

سوال: اپنے سفر میں آپ دیر سانت کاترین جانے کے لیے مصر تشریف لائے ہیں، کیا یہاں کے بعد کسی اور ملک میں بھی جانے کا قصد رکھتے ہیں؟

جواب: میرا سفر قریب قریب اب قاہرہ پر ختم ہو رہا ہے۔ کل میں دیر سانت کاترین روانہ ہو رہا ہوں اور وہاں سے واپس آنے کے بعد میرا ارادہ یہی ہے کہ دمشق اور کویت کے راستے اپنے وطن واپس چلا جاؤں۔ کسی اور ملک کے سفر کا میں ارادہ نہیں رکھتا۔

یہ انٹرویو اسی رات قاہرہ ریڈیو سے نشر کیا گیا۔

دوسری ملاقاتیں

اس قیام کے دوران میں جن دوسرے نمایاں حضرات سے ہمیں ملاقات کا موقع ملا، ان میں استاذ محب الدین الخطیب ، استاذ محمود احمد شاکر، شیخ ابو زہرہ، استاذ مصطفٰے زرقا،

استاذ مالک بن نبی، استاذ محمد قطب اور احمد سیف الاسلام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

استاذ محبّ الدین خطیب کا شمار عالم عربی کی ان چند قابلِ فخر ہستیوں میں ہوتا ہے، جن کو اسلامی تاریخ میں تحقیق اور سند کا درجہ حاصل ہے اور انہوں نے نہ صرف اپنے قلم سے اصلاح احوال کی کوشش کی ہے بلکہ جہاد میں عملاً حصہ بھی لیا ہے۔ شیعہ اور قادیانی لٹریچر پر تو انہیں وہ عبور حاصل ہے جو یقیناً پورے عرب ممالک میں کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہے۔ شیخ حسن البنا شہید نے اپنی دعوت کا آغاز ان ہی کے ہفت روزہ ''الفتح'' سے کیا تھا اور ان ہی کے مشوروں کے مطابق مصر میں تحریک اخوان المسلمون کی بنیاد رکھی تھی۔ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اور بہت سے دوسرے اسلام پسند ادباء نے اپنے لکھنے کا آغاز بھی ان ہی کے ''الفتح'' سے کیا تھا۔ 52ء تک مصر میں مولانا مودودی کی جو کتابیں شائع ہوتی رہیں، وہ ان ہی کے اہتمام اور ان ہی کے پریس میں شائع ہوئیں اور ان میں سے بعض پر انہوں نے مفید مقدمات بھی لکھے۔ شیخ محمد محمود شلتوت کے شیخ الازہر مقرر ہونے سے پہلے یہی مجلّہ الازہر کے ایڈیٹر تھے، لیکن جونہی شیخ شلتوت ازہر کی مشیخت کے لیے منتخب کئے گئے، یہ مجلّہ الازہر کی ادارت سے مستعفیٰ ہو گئے، کیونکہ دونوں کے مزاج اور طریقِ کار میں سخت اختلاف ہے۔ شیخ شلتوت اپنی وسیع المشربی پر فخر کرتے ہیں اور مصر کے دارالتقریب بین المذاہب الاسلامیہ کے پرزور حامی ہیں، لیکن استاذ محب الدین خطیب شیعہ حضرات کے سخت دشمن ہیں اور دارالتقریب کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ دراصل شیعی فقہ کو اہل سنت میں مقبول بنانے کا بہانہ ہے اور یہ کہ جب تک شیعہ حضرات کم از کم صحابہ کرامؓ کو برا بھلا کہنے سے باز نہیں آتے، اس وقت تک ان سے کوئی مفید اتحاد قائم نہیں ہوسکتا۔

ایک دن شام کو ہم ان کے ہاں حاضر ہوئے۔ بڑی دیر تک اپنے گزشتہ حالات کے علاوہ شیخ حسن البنا شہیدؒ اور ان کی دعوت سے متعلق گفتگو کرتے رہے اور مولانا کو اب تک کے کارناموں پر مبارکباد اور آئندہ کے لیے جہاد پر ثابت قدم رہنے کی دعا دیتے رہے۔ اس وقت ان کی عمر 70-75 سال کے قریب ہوگی اور یہ خاموشی کے ساتھ اپنے پریس ''المطبعۃ السّلفیۃ'' کا کام کر رہے ہیں۔ ان کا ''الفتح'' تو برسوں سے بند ہو چکا ہے۔ کسی

دوسرے پرچے میں بھی کام نہیں کر رہے، ہمیں ان سے بعض کتابیں لینا تھیں، وہ کتابیں ہم نے لیں اور ہوٹل واپس آ گئے۔

استاذ محمود احمد شاکر شیخ احمد محمد شاکر مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کا اصل موضوع تو عربی ادب ہے، لیکن ان دنوں بہت سے ان کاموں کو جنہیں شیخ احمد محمد شاکر ادھورا چھوڑ گئے، مکمل کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور اس لیے اسلامی موضوعات پر بھی ان کا مطالعہ وسیع ہو رہا ہے۔ ان سے ملاقات کے لیے بھی ہم خود ان کے مکان پر گئے۔ گفتگو کے دوران میں معلوم ہوا کہ تفسیر طبری کی تحقیق کا کام کر رہے ہیں اور اب تک اس کے پندرہ حصے دارالمعارف کے زیر اہتمام شائع کر چکے ہیں۔ یہ پندرہ حصے انہوں نے مولانا کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیے۔ گفتگو چلتے چلتے دعوتِ اسلامی پر پہنچی تو ان کی ادبی رگ پھڑک اٹھی اور انہوں نے پورے زور سے اس چیز کے دلائل دینے شروع کر دیئے کہ اصلاح کا واحد ذریعہ عربی زبان وادب کی ترقی ہے۔ ہم نے اس حد تک تو ان کی رائے سے اتفاق کیا کہ عربی زبان و ادب کی ترقی اصلاح کا ایک اہم ذریعہ ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ اصلاح کا واحد ذریعہ ہے بہر حال وہ اپنی رائے پر قائم رہے اور ہم اپنی رائے پر اور گفتگو درمیان ہی میں ختم ہو گئی۔

شیخ ابوزہرہ اور استاذ مصطفیٰ زرقاء کا تعارف کرانے کی حاجت نہیں، ان دونوں حضرات سے وہ تمام لوگ واقف ہیں جنہوں نے 57-58ء کے کلوکیم (لاہور) میں ان کے مقالات سنے اور پڑھے ہیں۔ شیخ ابوزہرہ کی تو بہت سی کتابیں، سیرت امام احمد بن حنبلؒ، ابن تیمیہؒ اور مالکؒ وغیرہ ہمارے بعض پاکستانی ناشرین ان کی اجازت کے بغیر شائع بھی کر چکے ہیں[1] اور ان کی بعض دوسری کتابیں شائع کرنے کے عزائم رکھتے ہیں۔ مصری حضرات یوں بھی بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ، خفیف الظل ہوتے ہیں اور یہ ان کی قومی خصوصیت ہے۔ لیکن شیخ ابوزہرہ میں یہ خوبی خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ جوں ہی ان کو مولانا کے قاہرہ پہنچنے کی اطلاع ہوئی، ملاقات کے لیے ہوٹل تشریف لائے اور کافی دیر تک بیٹھے فقہی

1- اور اب سیرت امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور شافعی بھی (م۔ع جون 63ء)

نکات و لطائف بیان کرتے رہے۔ ایک خاص چیز جس کو انہوں نے بڑا ہی مزا لے لے کر بیان کیا، وہ اس خفیہ کلوکیم کی کارروائی تھی، جو لاہور کا کلوکیم ناکام ہونے کے بعد یار لوگوں نے کراچی میں منعقد کیا تھا تاکہ کسی نہ کسی طرح اصل مقصد حاصل ہو جانے کا اعلان کیا جا سکے، مگر وائے قسمت! اس میں بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو سکا۔ اس کلوکیم کی کارروائی کو شیخ ابوزہرہ نے بعد میں دمشق کے ماہنامہ ''حضارۃ الاسلام'' میں تفصیل سے بیان کر دیا۔ اس لیے اب مجھے اس کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

استاذ مالک بن نبی کا پہلی بار تذکرہ ہم نے اسی سفر میں سنا اور قاہرہ میں پہلی بار ان سے تعارف ہوا۔ یہ اصل میں الجزائری ہیں، لیکن کافی عرصہ فرانس میں رہ چکے ہیں، اس لیے مغربی تہذیب کی خرابیوں اور نتائج سے خوب واقف ہیں۔ اور ان ہی سے مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لیے انہوں نے بعض کتابیں لکھی ہیں۔ خود فرنچ میں لکھتے ہیں اور بعد میں ان کی کتابیں عربی میں ترجمہ کی جاتی ہیں۔ گفتگو بھی جس آسانی سے فرانسیسی میں کرتے ہیں، عربی میں نہیں کر سکتے۔ دمشق اور قاہرہ کے اسلام پسند حضرات سے ہم نے ان کی کتابوں کی بڑی تعریف سنی۔ اس لیے قاہرہ سے واپسی پر ہم نے یہ تمام کتابیں خرید لیں، لیکن اب تک انہیں پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ مولانا سے انکی جو گفتگو ہوئی، اس سے ہمارا اندازہ یہ ہے کہ مخلص اور درد مند آدمی ہیں، لیکن چونکہ عربی زبان پر پورا قابو نہیں ہے اس لیے خیالات پوری طرح صاف نہیں ہیں۔ ممکن ہے اب عرب ماحول میں رہتے ہوئے انہوں نے اپنی یہ کمی پوری کر لی ہو۔

استاذ محمد قطب، استاذ سید قطب کے بھائی ہیں اور عمر میں ان سے بارہ سال چھوٹے ہیں، اس لیے ان کے تربیت یافتہ اسلامی ادیب بھی ہیں، اور متعدد اسلامی موضوعات پر ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان ہی کی زبانی ہمیں سید قطب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ اب تک جیل میں ہیں اور ان کی صحت خراب ہو گئی ہے، حالانکہ ان دنوں ہمارے ہاں پاکستان میں مصری حکومت کے پروپیگنڈے کی وجہ سے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ سید قطب کو رہا کر دیا گیا ہے۔ واقعی مصری حکومت کو پروپیگنڈے میں کمال حاصل ہے۔ شیخ حسن الہضیبی کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک اپنے گھر میں نظر بند ہیں۔ احمد سیف الاسلام شیخ حسن

البنا شہیدؒ کے صاحبزادے ہیں اور 25-30 سال کی عمر کے نوجوان ہیں۔ خطرہ کے باوجود مولانا سے ملاقات کے لیے دو مرتبہ ہوٹل آئے۔ انہیں دیکھ کر ہمیں ان کے والد رحمہ اللہ و کثر من اتباع وعوتہ کی شکل (جو اگرچہ ہم نے تصویروں ہی میں دیکھی تھی) یاد آ گئی اور آنکھوں کے آنسوؤں پر قابو نہ رہ سکا۔ ان سے ان کا اور ان کے گھر والوں کا حال معلوم ہوا۔ کلیۃ الحقوق (لاء کالج) سے اور بعض مضامین میں کلیۃ الآداب (آرٹس کالج) سے فراغت حاصل کر چکے ہیں اور ان دنوں قاہرہ ہی میں وکالت کر رہے ہیں۔

بعض احباب سے ہمیں اپنے دوسرے ''مسلمان بھائیوں'' کا حال بھی معلوم ہوا۔ مصری حکومت کے پر زور پروپیگنڈا کی وجہ سے مصر کے عوام بے چاروں کو یا تو واقعی بھول گئے ہیں، یا وہ انہیں یاد تو ہیں لیکن ان کا ذکر زبانوں پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تاہم یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک اچھا خاصا طبقہ ایسا ہے جو ان کی پکار کو سینے سے لگائے ہوئے ہے اور ان حالات کا انتظار کر رہا ہے جب کوئی اللہ کا بندہ آگے بڑھے اور اسے منظم کر کے اقامت دین کی راہ پر گامزن کر دے۔ ابھی تک ان کے سینکڑوں افراد اندر ہیں اور جو باہر ہیں انہیں معاشی لحاظ سے پریشان رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک دن اتفاق سے ہمارا اس سڑک سے گزر ہوا، جس پر ان کا مرکزی دفتر قائم تھا۔ اب اس کی عمارت میں پولیس کا ایک دفتر قائم ہے۔

مصر میں مغربی اور فرعونی تہذیب کے اثرات

شام اور اردن میں مغربی تہذیب اور عورتوں کی آزادی کا جو حال ہے اسے مولانا نے گزشتہ سفر 1956ء کے بعد تفصیل سے بیان کر دیا تھا اور شاید ہی قارئین میں سے کوئی صاحب ایسے ہوں، جنہیں یہ تفصیل معلوم نہ ہو، لیکن قاہرہ میں مغربی تہذیب کے تسلط اور عورتوں کی آزادی کا جو حال ہم نے دیکھا وہ اس سے بھی کہیں زیادہ تھا، جس کا تصور قاہرہ پہنچنے سے پہلے ہم اپنے ذہنوں میں رکھتے تھے۔ دمشق اور عمان میں بہرحال برقع یا نقاب نامی کوئی چیز پائی تو جاتی ہے، اگرچہ اسے برقع یا نقاب کہنا، پردہ اور نقاب کی توہین ہے، لیکن قاہرہ میں وہ بھی نہیں پائی جاتی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ قاہرہ کی سڑکوں پر ایک بھی

خاتون ہمیں ایسی نظر نہیں آئی، جو برقع یا نقاب اوڑھے ہو، اور سکرٹ کے سوا اس کا کوئی اور لباس ہو۔ یہی حال مردوں کا بھی ہے۔ کوئی پڑھا لکھا جدید تعلیم یافتہ آدمی ہمیں ایسا نظر نہیں آیا، جو سوٹ کے سوا کوئی اور لباس پہنے ہوئے ہو، اور شاید پورے قاہرہ میں چند ہی ایسی ہستیاں ہوں، جن کے چہرے پر ڈاڑھی کے کچھ بال پائے جاتے ہوں۔ البتہ علماء کے طبقہ میں دیسی اور مغربی دونوں قسم کے لباس پائے جاتے ہیں اور ان کے سر بھی ترکی ٹوپی اور اس پر سفید ململ کا لفہ۔۔۔ جسے یہ حضرات عمامہ کہتے ہیں اور اپنے تئیں سنت پر عمل کرتے ہیں۔۔۔ سے ڈھکے ہوئے ہیں، لیکن ڈاڑھی ان کے چہروں سے بھی غائب ہے۔

قاہرہ ایک عظیم الشان شہر ہے، جس کی آبادی 31 لاکھ بتائی جاتی ہے اور اس کے اہم حصوں میں شاید ہی کوئی ایسی عمارت ہو، جس کی پانچ یا چھ سے کم منزلیں ہوں۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے، اس کی نو منزلیں تھیں اور ہمارا کمرہ اس کی آٹھویں منزل پر تھا۔ دراصل محمد علی پاشا ہی کے وقت سے مصری حکام کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ قاہرہ کو ہر لحاظ سے یورپ کے شہروں کا چربہ بنایا جائے۔ اس لیے اب آپ کو وہاں کے اکثر چوکوں میں تاریخی شخصیتوں کے مجسمے ملیں گے۔ ریلوے اسٹیشن کے عین سامنے رمسیس ثانی کا دس بارہ گز اونچا بت نصب کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ رمسیس ثانی وہی فرعون ہے جس کے متعلق قرآن پاک میں ذکر ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔

مصری حکومت اس کو پہلا اور صدر جمال عبدالناصر کو اپنا دوسرا قومی ہیرو اور بیرونی استعمار سے نجات دہندہ تصور کرتی ہے، گویا رمسیس ثانی کے بعد جمال عبدالناصر تک مصر پر جو زمانہ گزرا ہے، وہ سب بیرونی استعمار کا زمانہ رہا ہے۔ غور کیجئے کہ اس فلسفہء انقلاب کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ کو قاہرہ کے بہت سے دفاتر اور نئی عمارتوں کی دیواریں فرعونی آرٹ کے نمونوں اور تصویروں سے مزین ملیں گی۔ موجودہ مصری حکومت کو اصل ناز اسی فرعونی تہذیب پر ہے اور اسی کو وہ اپنی قومی تہذیب سمجھتی ہے اور اس کی نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ مغربی ملکوں تک میں لے جا کر نمائش کرتی ہے، رہی عرب قومیت تو اس کے متعلق وہ بہت سنجیدہ اور مخلص نہیں ہے۔ یہ صرف ایک سیاسی نعرہ ہے جسے دوسرے عرب ممالک سے فائدہ اٹھانے اور انہیں اپنی قیادت تسلیم کرانے کے

لیے ایجاد کیا گیا ہے، جیسا کہ اس مقصد کے لیے کبھی کبھی اسلام کو بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ ایک خاص طبقہ کے سوا مصر کے عام باشندے اسی طرح مسلمان ہیں جس طرح پاکستان یا دوسرے ملکوں کے باشندے ''عرب قومیت'' کے نعرہ کو وہ ایک سیاسی نعرہ سے زیادہ تصور نہیں کرتے۔ اور کبھی دل سے اس کی تائید نہیں کرتے۔ ایک روز ہم ٹیکسی میں کسی جگہ جا رہے تھے۔ عرب قومیت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ٹیکسی کے ڈرائیور کو ہماری باتیں تو سمجھ میں نہیں آئیں لیکن اس نے اتنا سمجھ لیا کہ ہم عرب قومیت پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اس نے عرب قومیت کا خوب مذاق اڑایا۔ اور کہنے لگا کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں اس سے آپ مصر کے عام باشندوں کی ذہنیت بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اصولی لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے تو مصر کے لوگوں کو یا تو فرعونی ہونا چاہیے یا پھر مسلمان، چنانچہ یہی امر واقعہ بھی ہے۔ مصر کا ایک خاص طبقہ فرعونی ہے اور عام باشندے مسلمان۔ عرب قومیت کے اصل اور اولین علمبردار لبنان اور مصر کے عرب عیسائی ہیں، جنہوں نے اس مقصد کے لیے اس نظریہ کو ایجاد کیا ہے، جس مقصد کے لیے ہمارے ہاں مشرقی پاکستان کے ہندو متحد قومیت کا نعرہ لگاتے ہیں یا قادیانی اپنے آپ کو مسلمان قوم ہی کا ایک فرقہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وادیٔ سینا کے لیے روانگی

20 جنوری کی شام کو ہم سینا جانے کے لیے قاہرہ سے سویز روانہ ہو گئے، جس کا فاصلہ وہاں سے 125 میل ہے اور سڑک نہایت شاندار بنی ہوئی ہے۔ قاہرہ سے نکلتے ہی ہم ایک لق و دق صحرا میں پہنچ گئے۔ جغرافیہ میں ہم جو یہ پڑھتے ہیں کہ ''مصر نیل کا تحفہ'' ہے۔ اس کی حقیقت یہاں پہنچ کر خوب سمجھ میں آئی۔ مصر کی جتنی آبادی ہے، وہ نیل اور اس کی مختلف شاخوں پر ہی آباد ہے اور باقی سارا ملک اسی طرح صحرا ہے، جس طرح لیبیا اور الجزائر۔ اگر پختہ سڑک نہ ہوتی، تو ہمیں سویز پہنچنے میں وہی دشواری پیش آتی، جو مدینہ سے عقبہ پہنچنے میں آئی تھی، 2 گھنٹے کے بعد ہم سویز پہنچ گئے اور وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ مصر سے جو ٹیکسیاں جبل موسیٰ (جبل طور) جاتی ہیں، وہ یہیں سویز سے ملتی ہیں۔ وہاں ایک

دوست کے ذریعے (جن کا پتہ قاہرہ کے احباب نے ہمیں دیا تھا) ایک ٹیکسی والے سے 35 پونڈ (تقریباً 475روپے) پر معاملہ طے ہو گیا کہ وہ ہمیں جبلِ طور لے جائے گا اور وہاں دو دن رکنے کے بعد واپس سویز لے آئے گا۔ سویز میں یہ بھی معلوم ہوا کہ دیر سینٹ کا ترین میں کھانا پکانے کا انتظام تو ہے مگر پکانے کی تمام چیزیں یہیں سے خریدنا پڑیں گی۔ چنانچہ ہم نے بازار سے ڈبل روٹی، انڈے اور بعض دوسری چیزیں خریدلیں۔

اگلے دن (21 جنوری) صبح ساڑھے نو بجے ہم سویز سے روانہ ہو گئے۔ سویز کے قریب نہر سویز پر پل نہیں ہے، بلکہ جس وقت جہازوں کے گزرنے کا وقت نہ ہو، گاڑیوں کو ایک بڑی کشتی پر سوار کر کے نہر پار کرادی جاتی ہے، اور اگر کوئی گاڑی ایسے وقت میں نہر پر پہنچے، جب کہ جہاز گزر رہے ہوں تو اسے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جس وقت ہم وہاں پہنچے تو جہاز گزر رہے تھے، اس لیے ہمیں چار گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا۔ ایک بجے کے قریب ہم نے نہر پار کی اور سینا کا اصل سفر شروع کیا۔

وادیٔ سینا میں

سینا آج کل فوجی علاقہ ہے اس لیے اس میں داخل ہونے کے لیے مصلحتہ الحدود (محکمہ سرحد) سے اجازت لینا ناگزیر تھی، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ محکمہ سرحد کی اجازت اس بات سے مشروط تھی کہ ہم پہلے "مطرانیہ دیر سینٹ کا ترین" سے جس کا دفتر قاہرہ میں ہے، اجازت طلب کریں۔ گویا کہ مصر کی حکومت نے جبلِ موسیٰ (جبلِ طور) اور اس کے گرد تمام آثار کو عملاً عیسائیوں کے حوالے کر دیا ہے، اور ان سے اجازت لیے بغیر کوئی شخص وہاں نہیں جا سکتا۔ بعد میں جا کر ہمارے اس شبہ کی تصدیق ہو گئی اور دیر میں پہنچ کر محسوس ہوا کہ مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آثار سے بالکل دست بردار ہو گئے ہیں اور انہیں عیسائیوں کے حوالے کر چکے ہیں۔

سویز سے 22 کلومیٹر کے فاصلہ پر عیون موسیٰ کے نام سے ایک جگہ واقع ہے۔ یہ جگہ آج تک عیون موسیٰ کے نام سے مشہور چلی آرہی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تھے تو یہ ان کی پہلی قیام گاہ تھی، جہاں بہت سے چشمے موجود ہیں اس لیے یہاں

نہر سویز کے کنارے عیون موسیٰ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے نکلنے کے بعد (بحیرہ قلزم سے گزرنے کے بعد) پہلا پڑاؤ کیا۔

خوب شادابی و سرسبزی ہے، بعض لوگ بارہ چشمے بتاتے ہیں، لیکن اس وقت صرف سات چشموں سے پانی نکلتا ہے۔

عیونِ موسیٰ سے کچھ آگے ہم نے ایک جگہ دیکھی جہاں الجندی المجہول (Unknown Soldiers) کی یادگار لگی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ 56ء کی جنگ میں یہودی اس مقام تک پہنچ گئے تھے۔

اس کے بعد ایک مقام آیا ہے جسے حمام فرعون کہا جاتا ہے۔ یہ راستے سے ذرا ہٹ کر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ پھر وادی غرندل آتی ہے، جس کا نام تورات میں ایلیم آیا ہے۔ اس وادی میں بھی چشمے ہیں۔

پھر ابوزنیمہ کا بندرگاہ آتا ہے، جو سویز سے 146 کلومیٹر پر واقع ہے۔ راستے میں جگہ جگہ ہم کو پٹرول کے چشمے ملے اور ابوزنیمہ کے قریب پٹرول کمپنی کا دفتر ملا۔ ابوزنیمہ کے قریب مینگنیز کی کانیں ہیں اور ایک کارخانہ بھی۔ اس علاقہ میں قدیم زمانہ میں فراعنہ مصر فیروزہ نکلوایا کرتے تھے اور اب تک فیروزہ وہاں پایا جاتا ہے اور بدوی قریب تین ہزار گنی سالانہ کا فیروزہ یہاں سے حاصل کر لیتے ہیں۔

ابوزنیمہ سے چند میل آگے تک سارا راستہ سمندر کے کنارے ہے، بائیں طرف کبھی دشت اور کبھی پہاڑ ملتے جاتے ہیں۔ راستے میں کہیں کہیں بہت اعلیٰ درجہ کی پختہ سڑک ہے اور کہیں کچی سڑک۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں پہلے پختہ سڑک تھی جو بعد میں ٹوٹ گئی۔

نخلستانِ فاران

ابوزنیمہ سے تقریباً 20 کلومیٹر آگے جا کر مینا کا راستہ الگ ہو جاتا ہے اور دیرسانت کاترین کے لیے وادی فاران کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں سڑک کا نام و نشان نہیں۔ کبھی حجاز کے راستوں کی طرح ایک ندی کے اندر اندر چلنا پڑتا ہے، جس میں صرف پہلے سے چلی ہوئی موٹروں کے نشانات آدمی کی رہنمائی کرتے ہیں۔ دوراہے سے 52 کلومیٹر کے بعد ہم نخلستانِ فاران پہنچے جو بہت سرسبز ہے۔ یہاں کثرت سے پانی ہے اور باغات ہیں۔ یہاں کھجور، انگور، انجیر اور زیتون کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس

نخلستان کا طول 3 میل ہے۔ تورات میں اس کا نام رفیدیم آیا ہے۔ یہاں عیسائیوں کا ایک دیر ہے جس کا تعلق دیر سینٹ کاترین سے ہے۔ جو مسافر دیر سینٹ کاترین جاتے ہیں، ان کا یہاں استقبال کیا جاتا ہے۔ ایک قسیس یہاں مستقل طور پر رہتا ہے۔ ہم تقریباً پونے سات بجے یہاں پہنچے تھے۔ جس قسیس سے ہماری ملاقات ہوئی، وہ یونانی جزیرہ چیوس (Cheos) کا رہنے والا تھا، لیکن مصر میں پیدا ہوا تھا، اس لیے عربی بولتا تھا اور انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس نے قہوہ سے ہماری تواضع کی۔

دیر سینٹ کاترین

فاران کے نخلستان سے دیر سینٹ کاترین 67 کلومیٹر ہے رات کو پونے نو بجے ہم دیر سینٹ کاترین پہنچے۔ یہ دیر ایک بہت بڑی خانقاہ ہے، جس کا وہ حصہ جہاں برننگ بش (وہ جھاڑی جس میں آگ لگی ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نظر آئی تھی) کی یادگار ہے، قسطنطین کے زمانہ کا بنا ہوا ہے۔ یہاں اب بھی کوئی شخص جوتے اتارے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔ باقی وسیع خانقاہ جیسٹنیان نے بنائی تھی۔ اس کے گرد بہت اونچی سنگین فصیل بنی ہوئی ہے۔ موجودہ دیر اگرچہ اپنی قدیم بنیادوں پر بنا تھا، لیکن وقتاً فوقتاً اس میں کافی اصلاحات و ترمیمات ہوتی رہیں۔ دیر کا اپنا پاور ہاؤس ہے، جس سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ کمرے اور برآمدے بہت شاندار بنے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کے ٹھیرنے کے لیے بہت نفیس انتظام ہے۔ سیاحوں کو کھانا پکا کر دینے کے لیے ملازم موجود ہیں۔ باورچی خانہ، کھانے کا کمرہ اور تمام ضروریات فراہم کی گئی ہیں۔ کھانے کا سامان چونکہ یہاں مشکل سے ملتا ہے اس لیے سیاحوں کو اپنے ساتھ کھانے کی چیزیں لانا پڑتی ہیں اور یہاں کے ملازم پکا دیتے ہیں۔ ایک پبلک ریلیشنز آفیسر بھی دیر کی طرف سے مقرر ہے، جو سیاحوں کا استقبال کرتا اور آثار کی زیارت میں ان کی ہر طرح سے مدد کرتا ہے۔ رات کے وقت ہم نے پہنچ کر کھانا پکوایا اور کھا کر سو رہے۔

روشن جھاڑی

صبح (22 جنوری) دیر کے ریلیشنز آفیسر نیکوفورس نے ہمیں دیر کا مشاہدہ کرایا۔ اس

دیر میں ایک شاندار کنیسہ بنا ہوا ہے، جس میں بیزنطی عہد کی تصویریں آج تک ایسی حالت میں موجود ہیں کہ آدمی کو شبہ ہوتا ہے کہ شاید ابھی حال کی بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح فرنیچر اور دروازوں کے بعض حصے ایسے ہیں جو جسٹنیان کے عہد سے اب تک قائم ہیں۔ کنیسہ کی پشت پر وہ مقام واقع ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھاڑی میں آگ لگی ہوئی نظر آئی تھی۔ قسطنطین نے یہاں ایک یادگار بنا دی تھی اور خاص اس مقام کو جہاں جھاڑی میں آگ لگی معلوم ہوئی تھی، نمایاں کر کے ایک چھوٹے سے مقصورہ کی شکل میں بنا دیا تھا۔ اس مقام کی پشت پر باہر صحن میں وہ درخت ہمیں بتایا گیا، جس پر اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔ اس درخت کے متعلق پادری نیکوفورس نے ہمیں بتایا کہ صدیوں سے یہ اپنی ابتدائی جڑوں پر بار بار اگتا رہا ہے، پرانا ہو کر مر جاتا ہے اور پھر نئے سرے سے انہی جڑوں سے تازہ ہو کر تنا اور شاخیں نکال لیتا ہے۔ یہاں کنیسہ سے متصل سلطان سلیم نے ایک مسجد بنا دی ہے، جو اہل دیر ہی کے انتظام میں ہے۔ باوجودیکہ یہ علاقہ ایک مسلمان حکومت کے پاس ہے لیکن اس مسجد کے لیے کسی امام و موذن وغیرہ کا انتظام نہیں ہے، اور نہ یہاں نماز باجماعت کا کوئی اہتمام کیا گیا ہے، حالانکہ دیر کے ملازمین میں اچھی خاصی تعداد مسلمانوں کی موجود ہے۔

دیر کے اندر ایک قدیم ڈائننگ ہال ہے، جو راہبوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں ایک میز جسٹنیان کے زمانہ کی اور ایک صلیبیوں کے زمانہ کی موجود ہے۔ اس کمرے کے اندر صلیبی عہد کے بادشاہوں نے اپنی تصاویر بنوائی تھیں، جو آج تک اپنے اصلی رنگوں کے ساتھ چلی آ رہی ہیں۔

لائبریری اور میوزیم

یہ دیر گریک آرتھوڈاکس فرقے کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے اندر ایک بہت بڑی لائبریری اور ایک چھوٹا سا میوزیم ہے۔ میوزیم میں جسٹنیان کے عہد سے لے کر آج تک تمام آرک بشپوں کے تاج اور عصا اور ان کی صلیبیں اور پیٹیاں موجود ہیں اور اس کے علاوہ بکثرت تصاویر بیزنطی عہد کی پائی جاتی ہیں، جن کے رنگ اور شان میں اب تک کوئی

فرق نہیں آیا، لائبریری میں جدید اور قدیم کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ اور یونانی، عبرانی، سریانی، قبطی، حبشی، فارسی اور روسی زبانوں کی بہت سی قلمی کتابیں ہیں، جو کہیں اور موجود نہیں ہیں، یہاں تورات کا ایک نسخہ بھی تھا۔ جو چوتھی صدی عیسوی کا تھا اور جس کا نام (Codexinaiticus) تھا، مگر ایک روسی پروفیسر اس کو اڑا لے گیا اور زار روس کے پاس بھیج دیا۔ زار نے اس کا فوٹو گرافی کا نسخہ یہاں بھیج دیا اور اصل نسخہ اپنے پاس رکھ لیا۔

انسانوں کی کھوپڑیاں

دیر سے متصل ایک چھوٹا سا باغ ہے اور اس کے اندر دیر کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرہ میں جب ہم داخل ہوئے تو یکا یک یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ انسانوں کی بے شمار کھوپڑیاں اور انسانی جسم کی بے شمار ہڈیاں نہایت قرینہ سے سجی رکھی تھیں۔ پادری نیکوفورس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چھٹی صدی عیسوی سے جب کہ یہ دیر بنا تھا۔ آج تک اس دیر کے جتنے آرک بشپ اور راہب مرے ہیں، یہ سب ہڈیاں اور کھوپڑیاں ان کی ہیں۔ آرک بشپوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں الگ اور عام راہبوں کی الگ۔ اس حرکت کی وجہ پوچھی تو پادری نیکوفورس نے بتایا کہ ہمارے پاس مردے دفن کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایک چھوٹی سی جگہ اس نے دکھائی، جس میں چار قبروں کی جگہ تھی۔ پادری نے بتایا کہ جو آرک بشپ اور راہب مرتے ہیں، انہیں یہاں دفن کر دیا جاتا ہے اور سات برس گزرنے کے بعد ان کی قبریں کھول کر ہڈیاں نکال لی جاتی ہیں اور ہڈیوں کو اس ''لائبریری'' میں سجا دیا جاتا ہے۔

جبلِ موسیٰ پر

دیر کے مشاہدے سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ ساڑھے نو بجے جبل موسیٰ کے لیے تین اونٹوں پر روانہ ہوئے۔ تین چوتھائی چڑھائی اونٹوں پر طے کی گئی۔ اونٹوں کے لیے راستہ ایسا بنایا گیا ہے کہ اگر ذرا بھی اسے چوڑا اور درست کرنے کی طرف توجہ دی جائے، تو موٹر میں اس مقام تک پہنچا جا سکتا ہے، جہاں زائر اونٹ سے اترتا ہے۔

اس کے بعد پھر پیدل سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے، اور بہت سخت تھکا دینے والی چڑھائی ہے۔ سیڑھیاں بے قاعدہ بنی ہوئی ہیں، بلکہ پتھر رکھ کر راستہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ چیز بھی تھوڑی سی توجہ اور صرفہ سے اس حد تک درست کی جا سکتی ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر جانے والے کو اتنی زیادہ زحمت نہ ہو، جتنی اب ہوتی ہے۔ پیدل چڑھائی کے دوران میں ہمیں جگہ جگہ برف پڑی ہوئی ملی، جس کا دل بعض مقامات پر تین فٹ تک تھا اور کہیں کہیں پگھلتی ہوئی برف کا پانی پہاڑ میں رس رس کر آ رہا تھا، اور پھر کرسٹل کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ سخت تھکا دینے والی چڑھائی پر بار بار بیٹھ بیٹھ کر چڑھتے ہوئے ہم 12 بجے کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے، جہاں ایک چھوٹا سا میدان تھا، جس میں کنیسہ اور ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ کنیسہ سنگین اور بہت صاف ستھرا بنا ہوا اور خوب سجا ہوا تھا۔ اسکا فرش بھی سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا اور اس کے اندر ایسی صفائی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ پابندی کے ساتھ اس کی جھاڑ پونچھ کی جاتی ہے اور غالباً ہفتہ وار عبادت بھی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر سخت شرم محسوس ہوئی کہ اس کنیسہ سے متصل مسجد کے نام سے جو حجرہ بنا ہوا ہے، وہ انتہائی خستہ حالی میں ہے۔ کوئی فرش اس میں نہیں ہے۔ دروازہ اس کا ٹوٹ گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ برسوں سے کسی نے اس کی دیکھ بھال نہیں کی۔

جمعہ کا روز تھا ہم نے وہاں قریب کے ایک چشمہ سے پانی لے کر وضو کیا اور ظہر کی نماز ادا کی۔ تقریباً ایک گھنٹہ ٹھیر کر ہم وہاں سے ایک بجے اُترنا شروع ہوئے۔ اتار کا راستہ کچھ دور تک تو وہی تھا، جس سے ہم سیڑھیوں پر چڑھے تھے، لیکن آگے چل کر ہم دوسرے راستے سے اترے۔ تقریباً پانچ سو فٹ نیچے اترنے کے بعد ہم اس جگہ پہنچے، جہاں حضرت الیاس علیہ السلام سامریہ سے بھاگ کر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ مقام الیاس تک کا اتار کوئی زیادہ تکلیف دہ نہ تھا، لیکن اس کے بعد دیر تک اتار بے حد تکلیف دہ تھا۔ اگرچہ لفظ سیڑھی کا اطلاق اس پر کیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ سیڑھیاں نہیں ہیں بلکہ تھوڑا بہت پتھروں کو مرتب کر دیا گیا ہے۔ سخت تھکا دینے والے اتار سے گزرتے ہوئے ہم لوگ 3 بجے کے قریب دیر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ان سیڑھیوں کی تعداد 3400 ہے۔

کوہ طور کے دامن کنیسہ سینٹ کیتھرائن ۔ کنیسہ اور مسجد (سلطان سلیم کی تعمیر کردہ)

سامری کا گوسالہ

23 جنوری کی صبح ہم قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں دیر سے ڈیڑھ کلو میٹر (ایک میل) پر ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے کے اوپر سیدنا ہارون علیہ السلام کا مقام آیا۔ یہ پہاڑی اس وادی میں واقع ہے جس میں سامری نے گوسالہ بنا کر پیش کیا تھا اور بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ اور یہ مقام سیدنا ہارون علیہ السلام غالباً اسی جگہ بنا ہوا ہے، جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور سے واپس آ کر حضرت ہارون علیہ السلام سے مواخذہ کیا تھا۔

اس کے بعد یعنی دیر سے تقریباً دس کلو میٹر پر ایک وادی میں حضرت صالح علیہ السلام کا مقبرہ ہے۔ ہر سال یہاں دیہاتیوں کا بہت بڑا مجمع ہوتا ہے، جس میں وہ قربانیاں کرتے ہیں اور سارا میدان بھر جاتا ہے۔ اسی طرح کا مجمع حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر پر بھی ہوتا ہے۔ مقامی روایات یہ ہیں کہ قومِ ثمود پر جب عذاب نازل ہوا تو حضرت صالح ہجرت کر کے یہاں آ گئے تھے، لیکن ان روایات کی کوئی تاریخی سند نہیں ہے۔

دوبارہ قاہرہ میں

شام کو ساڑھے چھ بجے قاہرہ واپس پہنچے۔ 24 جنوری سے پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور 25 کی شام تک جاری رہا۔ ملاقاتوں سے جو وقت بچتا تھا وہ ہم اپنے لیے کتابیں خریدنے میں صرف کرتے تھے۔ 24 کی دوپہر کے وقت شیخ ازہر کا مولانا کے نام پیغام آیا کہ مجھ سے ملے بغیر قاہرہ سے نہ جائیں۔ چنانچہ رات کو ہم ان سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر گئے۔ بڑی محبت اور تپاک سے بار بار مولانا کو دعائیں دیتے اور ان کی اسلام کی راہ میں خدمات کو سراہتے رہے۔ بار بار مولانا کے ساتھ اپنے بیٹھنے پر خوشی اور فخر کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی گفتگو اس قدر جذبات سے لبریز تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے آج اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ فرماتے تھے کہ اگر مولانا کو تکلیف نہ ہوتی، تو میرا دل ساری رات ان کے ساتھ بیٹھے رہنے اور باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ دوسرے تمام مہمانوں کو تو

ان کے شاگردوں نے چائے ڈال کر پلائی، لیکن مولانا کی پیالی میں شیخ نے اپنی بیماری کے باوجود خود چائے ڈالی۔

قاہرہ سے واپسی پر شیخ ابوزہرہ، مصطفیٰ زرقاء، محمود محمد شاکر اور بہت سے دوسرے اہلِ علم حضرات نے اپنی تصنیفات کا ایک ایک سیٹ مولانا کو بطور ہدیہ پیش کیا۔ محمد قطب نے اپنی تصنیفات کے علاوہ سید قطب کی تصنیفات کا سیٹ بھی پیش کیا۔ شیخ حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے سیف الاسلام نے بھی اپنے دادا کی تمام تصنیفات ہدیۃً دیں۔

پھر دمشق میں

25 جنوری کی رات ساڑھے آٹھ بجے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو کر ہم ساڑھے دس بجے دمشق واپس آئے، ہوائی اڈہ پر استاذ محمد المبارک، استاذ محمد منتصر الکتانی اور بعض دوسرے احباب موجود تھے۔

اس مرتبہ دمشق میں ہمارا دو دن قیام رہا، جس میں ملاقاتوں اور دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ 26 جنوری کی دوپہر سید عبدالحمید خطیب (مرحوم) نے اور 27 جنوری کی دوپہر استاذ عدنان سالم (دمشق میں مولانا کی عربی کتابوں کے ناشر) نے مولانا کے اعزاز میں دعوت دی۔ اس قیام کے دوران میں ہم نے اپنے لیے کچھ کتابیں بھی خریدیں۔ ملاقاتوں، کتابوں کی خرید اور سامان کی پیکنگ وغیرہ نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ ہم جامع اموی یا دمشق کے دوسرے تاریخی آثار کو دیکھنے کا کوئی پروگرام بنا سکتے۔ اگرچہ گزشتہ سفر (1956ء) میں ہم نے ان سب کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

28 جنوری کو صبح پونے سات بجے ہم دمشق سے بذریعہ ہوائی جہاز کویت روانہ ہوئے۔ دمشق کے ہوائی اڈہ پر احباب نے ہمیں الوداع کہی۔

مقام سیدنا حضرت الیاس علیہ السلام کوہ طور کے دامن میں

مقام سیدنا صالح علیہ السلام ۔ جبل موسیٰ سے قریب

کویت

(28 جنوری تا 4 فروری 1960ء)

کویت خلیج فارس کے مغربی ساحل پر عراق اور سعودی عرب کے درمیان ایک چھوٹی سی عرب ریاست ہے، جس کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ 1110ھ کے لگ بھگ اس کی بنیاد پڑی اور اس وقت سے آل صباح کا خاندان یہاں کا حاکم چلا آ رہا ہے۔ بحرین کے حکمران خاندان آل خلیفہ کی طرح یہ خاندان بھی قطر سے یہاں آ کر آباد ہوا تھا، اس لیے قطر کے آل ثانی اور بحرین کے آلِ خلیفہ سے اس کے تعلقات بہت گہرے اور قریبی ہیں۔ نجد وحجاز کا حکمران خاندان آلِ سعود تو اپنے آپ کو آلِ صباح کا انتہائی ممنونِ احسان سمجھتا ہے، کیونکہ جب حائل کے خاندان آلِ رشید نے آلِ سعود کو ریاض سے بے دخل کر دیا تھا، تو آلِ سعود نے کویت ہی میں آ کر پناہ لی اور وہ کافی عرصہ تک آلِ صباح کا مہمان رہا تا آنکہ مرحوم عبدالعزیز بن عبدالرحمان نے 1902ء میں اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کی مدد سے ریاض پر دوبارہ قبضہ کیا۔ شاہ سعود کی پیدائش بھی کویت ہی میں ہوئی بلکہ اس رات ہوئی جس رات ان کے والد نے ریاض پر قبضہ کیا۔ کوئی شک نہیں کہ آلِ سعود کے افراد آلِ صباح کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔

جنگِ عظیم اول تک آلِ صباح نے سلطنتِ عثمانیہ سے وفاداری اور تابعیت کا تعلق قائم رکھا۔ ان دنوں سلطنت عثمانیہ کی طرف سے بصرہ کا گورنر کویت کا نگران ہوتا تھا، لیکن بعد میں جب عراق اور دوسرے عرب ممالک سلطنتِ عثمانیہ سے نکل گئے، تو کویت بھی بصرہ کی نگرانی سے آزاد ہو گیا۔ بعد میں انگریزوں نے ہندوستان اور عراق کے درمیانی راستے کو

محفوظ رکھنے کے لیے جہاں خلیج فارس کی دوسری عرب ریاستوں پر قبضہ کیا، وہاں کویت کو بھی انہوں نے اپنی سرپرستی اور نگرانی میں لے لیا۔ ان دنوں کویت کی سیاسی یا مالی لحاظ سے کوئی اہمیت نہ تھی۔ صرف ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کے باشندوں کی گزراوقات عموماً خلیج فارس سے مچھلیاں پکڑنے یا موتی نکالنے سے ہوتی تھی، لیکن آج سے اٹھارہ انیس سال پیشتر سے (یعنی جب سے یہاں پٹرول دریافت ہوا ہے) اس کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے بلکہ انگریز اور دوسری مغربی قوموں کی نگاہ میں تو اسے وہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے، جو کسی بھی دوسرے عرب ملک کو حاصل نہیں ہے۔ کویت میں پٹرول کا اتنا ذخیرہ دریافت ہوا ہے اور عملاً چھ انگریز اور امریکن کمپنیاں یہاں سے اتنا پٹرول نکال رہی ہیں، جو سعودی عرب، عراق، ایران ہر ایک سے زیادہ ہے۔ اس چیز نے تمام دنیا خصوصاً عرب ممالک کی نگاہ کو چکا چوند کر دیا ہے اب ہر عرب ملک اسے سونے کی چڑیا سمجھتے ہوئے لالچ بھری نگاہ سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور کچھ نہیں کرسکتا تو قرض ہی کے لیے اس کے سامنے اپنی جھولی پھیلائے رکھتا ہے۔ عراق تو اس کے اپنے ملک کا ایک حصہ ہونے کا دعویدار بھی ہے۔ قطر اور بحرین وغیرہ کی تو کویت اس طرح امداد کرتا ہے جس طرح ایک بڑا بھائی، جو مالدار بھی ہو اور سخی بھی، اپنے چھوٹے نادار بھائیوں کی امداد کرتا ہے۔ چند سال پہلے تک کویت پر انگریزوں کا باقاعدہ قبضہ رہا۔ (جیسا کہ ان کا بحرین پر قبضہ ہے) لیکن اب اس نے ہر لحاظ سے خودمختاری حاصل کرلی ہے۔ اب اس کا سکہ بھی اپنا ہوگیا ہے اور ڈاک کے ٹکٹ بھی اپنے ہوگئے ہیں۔ عرب لیگ کا ممبر بننے کے علاوہ یہ اقوامِ متحدہ کا ممبر بھی بن گیا ہے، البتہ "ضرورت کے وقت" انگریز اس کی مدد کو پہنچنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

کویت کے جن حضرات نے مولانا کو باصرار اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی ان میں حاجی عبدالرزاق الصالح اور استاذ عبداللہ العلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں حضرات وہاں کے مقامی تاجر اور پورے کویت میں اپنا اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ چند سال پیشتر تک کویت میں ایک اصلاحی انجمن "جمعیۃ الارشاد" کے نام سے قائم تھی۔ حاجی عبدالرزاق الصالح اس کے صدر تھے۔ اب وہاں کے سیاسی حالات کے پیش نظر اس انجمن کا وجود تو نہیں ہے لیکن اس کے تحت جو اسکول چل رہے تھے، وہ اب بھی چل رہے ہیں اور

دوسری اصلاحی کوششیں بھی جاری ہیں۔

ہم صبح سات بجے دمشق سے روانہ ہوکر ساڑھے دس بجے کویت پہنچ گئے۔ ہوائی جہاز کویت کا اپنا تھا اور نہایت عمدہ اور آرام دہ۔ ہوائی اڈہ پر استاذ عبداللہ العلی، حاجی غلام معصوم صاحب (پاکستانی) اور اشرف صاحب (پاکستانی) اور بعض دوسرے احباب استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان دنوں بیت المقدس میں مؤتمر عالمی اسلامی کا اجلاس ہو رہا تھا، حاجی عبدالرزاق صالح اس میں شرکت کے لیے بیت المقدس گئے ہوئے تھے۔ اس لیے ہوائی اڈہ پر وہ موجود نہ تھے۔ اگلے روز وہ واپس آ گئے۔

ان حضرات نے ہمارے قیام کا انتظام دار الضیافۃ الملکیۃ (شاہی مہمان خانہ) میں کیا تھا، اور وہ اس خیال سے کہ کسی دوسری جگہ ٹھہرانے کی صورت میں کسی سرکاری یا غیر سرکاری آدمی کو ملاقات کے لیے آنے میں تامل نہ ہو۔

کویت میں کوئی اسلامی یا تاریخی آثار تو نہیں ہیں، جن کے لیے ہمارا کویت آنا اور وہاں رکنا ضروری ہوتا۔ البتہ احباب کے اصرار پر ہم نے وہاں آٹھ روز تک قیام کیا۔ اس دوران میں ہم نے یا تو اپنے لیے ضرورت کی چیزیں خریدیں یا پھر وہاں کے اسلام پسند تاجروں اور اخوانی دوستوں سے ملاقاتیں رہیں۔

21 جنوری کی دوپہر استاذ عبداللہ العلی کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ دعوت میں چالیس کے قریب اخوانی حضرات موجود تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے مختلف دعوتی موضوعات پر مولانا سے سوالات کیے اور مولانا نے ان کے جوابات دیے۔

عصر کی نماز کے بعد ہم شیخ یوسف القناعی سے ملاقات کے لیے گئے ان کا تذکرہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم نے ''دیارِ عرب'' میں بھی کیا ہے۔ کویت کے واحد محقق عالم ہیں۔ استاذ عبداللہ العلی کے چچا ہیں۔ بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے سخت معذور ہو چکے ہیں۔

اگلے روز (30 جنوری) دوپہر کا کھانا عبداللہ عقیل کے ہاں کھایا اور وہاں بھی اسی طرح نوجوانوں کا اجتماع اور اس میں سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ عبداللہ عقیل اصل میں زبیر (عراق) کے رہنے والے ہیں۔ چونکہ اخوان سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے عبدالکریم

قاسم کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد انہیں عراق سے نکلنا پڑا۔ از ہر کے تعلیم یافتہ اور شیخ حسن بنا شہید کے تربیت یافتہ ہیں۔ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے ''دیارِ عرب'' میں بصرہ میں ان سے مسلسل ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان دنوں کویت میں کام کر رہے ہیں۔

31 جنوری کو کویت کے قاضی شرعی کے ہاں کھانے کی دعوت تھی اور وہاں بھی سوالات کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔

ہمارے پاس چونکہ سامان بہت زیادہ ہوگیا تھا، اس لیے طے پایا کہ میں سامان لے کر بحری جہاز سے سفر کروں اور مولانا اور چودھری صاحب ہوائی جہاز سے۔ چنانچہ یکم فروری کو میں ایک بحری جہاز سے جس کا نام دوارکا (Dwarka) تھا، روانہ ہو کر 8 فروری کو کراچی اور 9 فروری کو لاہور پہنچ گیا۔ مولانا اور چودھری صاحب 4 فروری کی رات ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر 5 فروری کی صبح کراچی پہنچ گئے۔ مولانا اگلے روز (6 فروری) لاہور آ گئے۔

والحمد للّٰہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات

☆☆☆☆

فہرست تصاویر

فہرست نقشہ جات

ہماری بہترین کتب

کتاب	مصنف
☆ سیرۃ النبیؐ	شبلی نعمانی
☆ سیرۃ النبیؐ	علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون
☆ رحمۃ للعالمینؐ	قاضی محمد سلیمان منصور پوری
☆ محسن انسانیتؐ	نعیم صدیقی
☆ انسان کاملؐ	ڈاکٹر خالد علوی
☆ سید انسانیتؐ	نعیم صدیقی
☆ حیاتِ محمدؐ	محمد حسین ہیکل
☆ حیات سرور کائناتؐ	مارٹن لنگس
☆ پیغمبر صحرا ﷺ	کے ایل گابا
☆ سیرت قرآنیہ سیدنا رسول عربیؐ	پروفیسر محمد اجمل خان
☆ رسول عربیؐ	نور بخش توکلی
☆ پیغمبرانہ دعائیں	ڈاکٹر خالد علوی
☆ سیرت النبیؐ کا انسائیکلوپیڈیا	مسعود عبدہ
☆ طب نبویؐ اور جدید سائنس (اوّل)	ڈاکٹر خالد غزنوی
☆ طب نبویؐ اور جدید سائنس (دوم)	ڈاکٹر خالد غزنوی
☆ علاج نبوی اور جدید سائنس	ڈاکٹر خالد غزنوی
☆ امراض جلد اور علاج نبویؐ	ڈاکٹر خالد غزنوی
☆ سانس کی بیماریاں اور علاج نبوی	ڈاکٹر خالد غزنوی
☆ دل کی بیماریاں اور علاج نبوی	ڈاکٹر خالد غزنوی
☆ نبی اکرمؐ بطور ماہر نفسیات	سعیدہ سعدیہ غزنوی
☆ اسوہ حسنہ اور علم نفسیات	سعیدہ سعدیہ غزنوی